
موسیٰ بن نصیر
الماس ایم اے

پیش لفظ

ملک عرب کے شہر مکہ سے نور اور ایمان کا سورج طلوع ہوا جس نے اپنی تابناک شعاعوں سے تمام عالم کو منور کر دیا۔ اس نوری پیکر کو اللہ پاک نے نذیر کہا، بشیر کہا، سراج منیر کہا، کہیں احمد کہا اور کبھی محمد کے نام سے آواز دی۔ مگر یہ اُمی لقب ایک آواز، ایک نعرہ اور ایسا سخن لے کر دنیا کے سامنے آیا کہ سننے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پکار اُٹھے۔

پھر اس نقیب کے لائے ہوئے مذہب اسلام نے اقصائے عالم کو منور کر دیا۔ اس کی ایک کرن ریگستان افریقہ کے شہر دمشق سے موسیٰ بن نصیر کے نام سے بلند ہوئی اور اس نورانی صورت نے اپنے شاگرد "طارق بن زیاد" کو ساتھ لے کر بحر روم کو پار کر کے اُندلس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ سرزمین جسے اسپین اور ہسپانیہ کہا جاتا ہے یہ سربسر کفرستان تھا۔ یہاں کا شہنشاہ راڈرک (لرزیق) ایک شیطان صفت درندہ اور عصمت وشرافت کا دشمن تھا۔ اس بدکار نے اپنے ایک امیر کی معصوم بیٹی کو زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ اس بچی کا باپ شاہ اسپین کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔

اس نے مسلمان جنرل موسیٰ بن نصیر کے آگے فریاد کی اور باشعور، نیک مزاج اور ایک سچے مسلمان نے نہ صرف شاہ راڈرک پر حملہ کر کے اُس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا بلکہ پورا ملک اُندلس مذہب اسلام کا مضبوط قلعہ بن گیا۔

موسیٰ بن نصیر اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت کا ایک عظیم سپہ سالار تھا جس نے افریقہ کو نورِ حق سے منور کر دیا اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ دراز کرتے ہوئے بلاد مغرب تک جا پہنچا اور پھر تائید خداوندی سے فاتح اُندلس (ہسپانیہ) کہلانے کا شرف حاصل کیا۔

موسیٰ بن نصیر نے اپنے شاگرد اور تاریخ اسلام کے قابل فخر مجاہد "طارق بن زیاد"

کے ہمراہ گمراہی میں ڈوبے ہوئے ان علاقوں میں جہاں بتوں کی خدائی کا دور دورہ تھا وہاں دین حق کی تعلیم پھیلا کر ہزاروں کافروں کو فیض یاب کیا۔ اور وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب طاقت کا توازن اس عظیم مجاہد کے ہاتھ میں تھا۔ اگر اُسے اپنا لشکر یورپ کی سمت میں ڈالنے کا موقع مل جاتا تو یورپ کی کوئی طاقت مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ کرتی۔

افریقہ کا انتظام مکمل کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر کی نظریں بحر روم کی وسعتوں پر جمی ہوئی تھیں، کوئی دشت، کوئی دریا اُس کی ہمت کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ وہ تاحد نظر، تا حد خیال اسلامی پرچم لہرانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

مسلمانوں نے اُندلس پر کئی سو سال حکومت کی مگر بعض ناسمجھ خلیفاؤں کی نادانیوں کی وجہ سے اُندلس میں اسلام کی شمع آہستہ آہستہ مدہم ہوتی گئی اور آخر.................

یہ سب کچھ آپ کو زیر نظر اسلامی تاریخی ناول موسیٰ بن نصیر میں ملے گا۔ جسے معروف مصنف الماس ایم۔اے نے اپنے زور قلم سے ایک خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

محمد علی قریشی

اسلام کا عظیم سپہ سالار اور فاتح شمالی افریقہ موسیٰ بن نصیر، ملک شام کے ایک قصبہ کفرمری میں پیدا ہوا اور وہیں اُس کی نشوونما ہوئی۔ یہ مسلم سپہ سالار حد درجہ بہادر اور سرفروش تھا اور اسلام کے نام پر تن، من اور دھن مٹانے پر ہر وقت تیار رہتا تھا۔ جب موسیٰ جوان ہوئے تو اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی حکمرانی کا دور دورہ تھا۔ خلیفہ نے اُنہیں لائق اور فائق دیکھا تو خراج کی تحصیل کے شعبہ کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ مگر یہ بلند خیال جوان ہمہ وقت غیر معمولی احکامات بجا لانے اور ہمت اور شجاعت کے مظاہرے کے لئے تیار رہتا تھا۔ پھر موسیٰ بن نصیر نے اسلامی لشکر میں شامل ہو کر اعلیٰ فوجی تربیت حاصل کی اور اُس نے کچھ ایسے غیر معمولی کام انجام دیئے کہ خلیفۂ وقت نے اُنہیں شمالی افریقہ کا حاکم مقرر کر دیا۔

اس عہدے پر فائز ہوتے ہی موسیٰ بن نصیر کے جوہر کھلنا شروع ہوئے اور اُنہوں نے خلیفہ کے حضور درخواست پیش کی کہ اُنہیں شمالی افریقہ کے شہر قیرواں اور اُس کے آس پاس کے علاقوں پر فوج کشی کی اجازت دی جائے تاکہ وہ منہ زور اور سرکش بربر قبائل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا مطیع اور فرمانبردار بنائیں۔ مگر خلیفہ نے اُن کی یہ درخواست مسترد کر دی اور اُنہیں اطلاع دی کہ وہ فاتح مراکش کے انجام کو پیش نظر رکھیں اور بربر قوم کو چھیڑنے کی کوشش نہ کریں۔

فاتح مراکش عقبہ بن نافع کا واقعہ اس طرح ہے کہ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں جب معاویہ بن خدیج جو مصر کے حاکم تھے اُنہوں نے پورے شمالی افریقہ کو زیر نگیں کرنے کا ارادہ کیا اور امیر معاویہ سے اس کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں اُنہوں نے ایک زبردست فوج تیار کی اور سب سے پہلے صوبہ خراسینہ اور تمام ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ان کے علاوہ بھی اُنہوں نے کچھ اور شہروں کو فتح کیا جن میں سب سے

بڑا شہر "جکولہ" تھا۔ یہ بڑا آباد اور دولت سے مالا مال تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر کو اس شہر سے بہت مال و دولت ہاتھ لگا۔

معاویہ بن خدیج کے بعد عقبہ بن نافع، افریقہ کے حاکم مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے بھی پورے شمالی افریقہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

عقبہ بن نافع اپنے زمانہ کے عظیم سپہ سالاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ بہادر، اولوالعزم، دلیر اور ارادے کے پکے تھے۔ عقبہ بہت ملنسار، خلیق اور رحمدل بھی تھے۔

پس عقبہ نے شمالی افریقہ پر اقتدار کے لئے خاص طور پر فوجوں کو ترتیب دیا اور انہوں نے قبضے اور فتوحات کے لئے بہت کوششیں کیں۔ چنانچہ وہ اسلامی لشکر لے کر شمالی افریقہ میں گھس پڑے اور مخالفوں سے لڑتے لڑتے بحر اطلانتک تک جا پہنچے۔ جب آگے اُنہیں خشکی دکھائی نہ دی تو اُنہوں نے اپنے گھوڑے کو سمندر میں ڈال دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ سمندر کے دوسرے کنارے پر بھی اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ لیکن سمندر کا ساحل ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے اور پھر وہ بھی گھوڑے پر تیر کر۔

غرض یہ کہ کچھ دُور سمندر میں گھوڑا تیرانے کے بعد عقبہ بن نافع کنارے پر لوٹ آئے اور خدا سے اس طرح دُعا مانگی۔

"اے اللہ! اگر سمندر کی موجیں مجھے نہ روکتیں تو میں تیرے
پیغام کو دنیا کی آخری حدود تک پہنچاتا۔"

ایسے موقعوں کے لئے شاعر نے کیا خوب شعر کہا ہے ۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اس عظیم شعر کے لئے بعض اشخاص نے کہا ہے کہ یہ شعر (یعنی شعر کا مفہوم) فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر قبضے کے بعد اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال کر کہا تھا۔

بہرحال شاعر کا یہ شعر مسلمانوں کے عظیم فاتح کے کارنامے کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے۔

غرض یہ کہ کچھ دُور سمندر میں آگے جانے کے بعد عقبہ بن نافع کنارے پر لوٹ

آئے۔ پھر اُنہوں نے شمالی افریقہ کے اندرونی انتظامات اور خوشحالی کے لئے کوششیں شروع کیں۔ اُنہوں نے شمالی افریقہ میں کئی شہر آباد کئے جن میں سب سے بڑا شہر "قیرواں" تھا جو رفتہ رفتہ شمالی افریقہ کا پایۂ تخت بن گیا۔ پھر عقبہ نے کوشش کی کہ بربر قوم میں اسلام کی تعلیم پہنچائیں۔ بربر قوم بہت تند مزاج تھی اور اسلام کی بہت مخالفت کرتی تھی۔

ایک دفعہ عقبہ بن نافع کچھ سرداروں کے ساتھ کسی لڑائی سے واپس آ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کے جنگی سردار بھی تھے۔ راستے میں بربریوں نے اُن پر زوردار حملہ کیا اور بربر قوم کے سینکڑوں نوجوان اُن پر ٹوٹ پڑے۔ عقبہ بن نافع کے ساتھ سپاہی بہت کم تھے اس لئے وہ معہ اپنے ساتھیوں کے بہادروں کی طرح لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اُن کی قبر وہیں ہے۔

عقبہ بن نافع کے بعد بربر قوم نے مسلمانوں کو شمالی افریقہ میں ٹکنے نہ دیا اور اسلامی فوجیں ملک مصر میں واپس آ گئیں۔

اسلام کو آج پھر کسی عقبہ بن نافع کی ضرورت ہے جو سمندر کی طوفانی لہروں میں اپنے گھوڑے ڈال دیں اور خدا کے نام کی عظمت کے لئے دنیا کی آخری حدوں تک جانا چاہتے ہوں۔

یہ 89ء ہجری کا زمانہ تھا۔ قیرواں اور افریقہ کے تمام شہروں پر باغی بربروں کا قبضہ تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اُس زمانہ میں شمالی افریقہ کی ایک عورت اسلامی فوجوں کے خلاف مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عوام و خواص دونوں اس عورت کو جادوگرنی کہتے تھے۔ اُس نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ جو پیشین گوئی کرتی ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ ایک دو دفعہ اُس کے کہنے کے مطابق اتفاقی طور پر کچھ باتیں ٹھیک نکلیں۔ بس لوگ اُس کے گرویدہ ہو گئے۔

اس جادوگرنی نے بربر قوم کو مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر دیا۔ یہ جادوگرنی کرتی یہ تھی کہ جدھر سے اسلامی فوجیں حملہ کرتیں وہ پہلے ہی سے اُس علاقے کے شہر، آبادیاں اور کھیتیاں اُجڑوا دیتی تھی تاکہ اسلامی فوجیں بھوکی رہیں۔ آخر مسلمانوں نے اُس جادوگرنی کو کسی نہ کسی طرح پکڑ کے قتل کر دیا اور یہ جھگڑا ختم ہو گیا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر اور اُس کے فوجیوں نے ملک میں امن و امان قائم کرنے کی بہت کوشش کی اور آخر بربر قوم کو قبضے میں کر لیا۔ مسلمانوں نے اُن کے بڑے بڑے سرداروں سے تعلق پیدا کر کے اُن میں محبت، نرمی اور اچھے اخلاق کے ذریعے اسلام پھیلایا۔

تمام شمالی افریقہ میں انہوں نے اچھے مبلغ اور واعظ مقرر کئے جو لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں پورا شمالی افریقہ نورِ اسلام سے جگمگا اُٹھا۔

جب پورے شمالی افریقہ میں اسلام پھیل گیا اور امن و امان قائم ہوا تو موسیٰ بن نصیر نے شمالی افریقہ کے ساحلی شہروں کی طرف توجہ دی اور قریب کے جزیرے فتح کئے۔ ان جزیروں میں سارڈینا، قبرص اور سسلی وغیرہ شامل ہیں۔ موسیٰ بن نصیر نے ان جزیروں کی ترقی، خوشحالی اور امن و امان کے لئے انتہائی کوششیں کیں۔ پس یہ جزیرے آئندہ دور میں اپنی خوشحالی اور امن و امان کے لئے جنت کا نمونہ بن گئے اور پوری اسلامی دنیا میں مشہور ہوئے۔

اُن دنوں اُندلس (اسپین، ہسپانیہ) کی اندرونی حالت بہت خراب تھی۔ حکومت بہت کمزور تھی۔ امیر اور مذہبی لوگ عیش وعشرت میں پڑے ہوئے تھے، عام لوگوں کی حالت افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے نہایت خستہ اور خراب تھی۔ پورا ملک چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس اندلس کے ایک حصہ کا حاکم جولین نامی ایک نرم دل امیر تھا جسے اُندلس کے بادشاہ ''راڈرک'' نے اپنے ظلم اور بربریت کا نشانہ بنایا تھا۔

پس جب امیر جولین کا اپنے بادشاہ کے خلاف کوئی زور نہ چلا تو اُس نے مسلمان سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے پاس جا کر اُندلس پر چڑھائی کرنے کی درخواست کی۔ مگر اس گفتگو اور موسیٰ بن نصیر اور جولین کی گفتگو سے پہلے اس تفصیل کا ذکر ضروری ہے جس کی وجہ سے امیر جولین اور اُندلس کے شاہ راڈرک میں جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس اختلاف کی وجہ دراصل یہ تھی کہ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اُندلس (اسپین، ہسپانیہ) کی اندرونی حالت پادریوں کی من مانیوں کے باعث بے حد

خراب ہو چکی تھی۔ حکومت پر کلیسا کا اقتدار تھا اور کلیسا کے اجارہ دار پادری، تھے جن کے چشم و ابرو کے اشارے پر اُندلس کے تمام حکمران پابند چلے آتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُندلس کے حکمران تو صرف نام کے حکمران تھے، اصل حکومت انہی پادریوں کی تھی۔ اور یہ پادری ملک کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ پادری جسے چاہتے اُسے تخت سلطنت پر بٹھا دیتے اور جسے چاہتے اُتار پھینکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب اُندلس کے حکمرانوں کی یہ کیفیت تھی تو رعایا کی حالت تو اس سے کہیں زیادہ بدتر اور قابل رحم تھی۔ حکومت کے جابرانہ قوانین اور اُس کے امیروں اور جاگیرداروں کے ظالمانہ معاشی نظام سے اندلس کے عیسائی عوام بے حد نالاں تھے۔ اور کچھ ایسا ہی سلوک یہودیوں کے ساتھ بھی روا رکھا جاتا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی حالت تو جانوروں سے بھی زیادہ بدتر تھی۔ مختصر یہ کہ بادشاہ اور اُس کے اُمراء سے لے کر خانقاہ کے راہبوں اور کلیسا کے پادریوں تک سبھی مئے عشرت میں مدہوش تھے۔ اُن کے دربار اندر کا اکھاڑہ اور اُن کی خانقاہیں حسین عورتوں کا پری خانہ بنی رہتی تھیں۔

اُس زمانہ میں اُندلس کی حکومت گاتو قوم کے آخری بادشاہ رداد ٹیزر کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ رداد ٹیزر جسے اہل عرب ''غیطشہ'' کہتے تھے، ایک عیش پرست حکمراں تھا، تاہم اُس نے اپنے زمانہ میں کلیسا کی اجارہ داریوں کی تھوڑی بہت اصلاح کی۔ اُن کی بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کو روکا۔ کلیسا کے اقتدار میں کمی کی۔ ایسے تمام قوانین جو نہایت جابرانہ تھے یک قلم منسوخ کر دیئے۔ علاوہ ازیں عوام کو امیروں اور جاگیرداروں کے خونی پنجے سے نکالنے کی کوشش کی اور یہودیوں کو بھی چند ایک مراعات دے کر خوشحال بنا دیا۔ چونکہ وہ خود بھی عیش پرستی میں مبتلا تھا اس لئے پادریوں نے جب اُسے اپنے خلاف پایا اور دیکھا کہ وہ اُن کے اقتدار کو مٹی میں ملانے پر آمادہ ہے تو اُنہوں نے اُس کی عیش پرستی کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومت کے اُمراء اور وزراء اور عیسائی عوام کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اُسے بے دین قرار دیتے ہوئے تخت سے اُتارنے کی جدوجہد شروع کی۔ آخر کار مذہب کے جس مقدس نام پر اُنہوں نے عوام کو اپنی مدد پر پکارا تھا وہ اس میں کامیاب ہوئے اور شاہ رداد ٹیزر تخت سے اُتار دیا گیا۔

اب کلیسا اور عیسائی پادریوں کے لئے میدان خالی تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے حکومت، معزول بادشاہ کی بجائے ایک ایسے تجربہ کار فوجی جنرل راڈرک کے ہاتھ میں دیدی جسے شاہی خاندان سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مگر عیش پرستی اور ہوس کوشی میں وہ پادریوں کے مزاج کے مطابق تھا۔

گاتو قوم کے حکمرانوں میں حکومت اور اُمراء کے درمیان تعلقات کو اُستوار اور مضبوط رکھنے کے لئے سیاسی مصلحت اور حکمت کے تحت مدتوں سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ اندلس کی حکومت کے رئیسوں، امیروں اور جاگیرداروں کے بچے شاہی محل میں بادشاہِ وقت کی ملکہ کی زیرِنگرانی پرورش اور تعلیم وتربیت پاتے تھے۔ اس کے علاوہ بسا اوقات ان بچوں کی بیاہ شادیاں بھی اُن کے ماں باپ کی بجائے خود شاہ کی طرف سے ہی کر دی جاتی تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان بچوں کی جان کے خوف یا بچوں کی بیاہ شادی کا اہتمام کرنے کے احسان سے اُن کے ماں باپ، حکومت کے فرمانبردار اور مطیع رہیں۔

بوڑھا اور خبیث راڈرک (غیطشہ) جب اسپین کے تخت پر بیٹھا تو اُسے دادِ عیش دینے کے سوا چونکہ دوسرا کام نہ تھا اس لئے اُس نے سب سے پہلے اس دستور سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ شاہی محل اور اُمراء وزراء کی لڑکیوں کی پرورش گاہ جسے "جنت ارضی" کا نام دیا گیا تھا، کے درمیان صرف ایک پانچ فٹ اُونچی دیوار حائل تھی۔ اس دیوار کے پاس کھڑے ہو کر درمیانہ قد کا انسان بھی دوسری طرف کھیلتی کودتی، حسین وجمیل لڑکیوں کی شوخیوں اور کلیلوں کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ نیچی دیوار تو محض ایک دکھاوے کا پردہ تھا کیونکہ اس دیوار میں لڑکیوں کی جنت ارضی میں جانے آنے کے لئے دو دروازے تھے جو ہمہ وقت کھلے رہتے تھے۔

بوالہوس اور خبیث شاہ راڈرک نے تخت سنبھالتے ہی اپنے سرکاری دربار کے علاوہ ایک ذاتی دربار اپنے محل کے اندر لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس پرائیویٹ (ذاتی) دربار میں بادشاہِ وقت کی تخت نما کرسی، اس دیوار میں لگے ہوئے ایک دروازے کے بالکل مقابل برآمدے میں بچھائی جاتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ بادشاہِ وقت کی نظریں دیوار کی دوسری طرف بھاگتی دوڑتی ان چنچل لڑکیوں کی شوخیوں پر پڑتی رہیں۔ اکثر ایسا ہوا

کہ دو چار لڑکیاں آگے پیچھے بھاگتی ہوئی دیوار میں لگے دروازے کو عبور کر کے شاہ غیطشہ (راڈرک) کے ذاتی دربار کی حدود میں داخل ہو جاتیں جنھیں دیکھ کر راڈرک کا بوڑھا دل، سینے میں زور زور سے اُچھلنے لگتا اور وہ بے چین ہو کر ان کھلتی ہوئی کلیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتا تھا۔

شاہ راڈرک اور ان بچیوں (لڑکیوں) کے درمیان اخلاقی طور پر باپ بیٹی کا رشتہ تھا کیونکہ لڑکیوں کی اس پرورش گاہ یا ہوسٹل کی ناظم اعلیٰ شاہِ وقت کی بیوی یعنی شاہ راڈرک کی ملکہ تھی۔ مگر شاہ راڈرک کی بوالہوس نظروں نے جلد ہی یہ راز فاش کر دیا کہ شاہِ وقت ان بچیوں کو اپنی بچیاں سمجھنے کی بجائے انہیں اپنی دل بستگی کا سامان سمجھنے لگا ہے۔

کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ شاہ راڈرک نے اپنی شیطانی طینت سے مجبور ہو کر اپنے جواں عمر باڈی گارڈ فلپ جو اُس کا رازدار بھی تھا کو بلا کر اُس سے سرگوشیوں میں گفتگو کی۔ اُس کی یہ تمام گفتگو اُن بچیوں کے بارے میں تھی جو دیوار کی دوسری سمت رہتی تھیں۔ پھر ایک دن فلپ نے شاہ کے محلاتی دربار میں حاضر ہو کر اُسے سلام کیا اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ مگر اُس نے بادشاہ کو کنکھیوں سے دیکھ کر یہ ضرور اندازہ لگا لیا تھا کہ آج بادشاہ کی بے چینی کچھ معنی ضرور رکھتی ہے۔ فلپ نے یہ بھی اندازہ لگایا تھا بادشاہ ادھر کچھ عرصہ سے زیادہ ہی شوخ و شنگ ہو گیا ہے اور دفتری اور سرکاری باتوں کی بجائے وہ جوانی کی گفتگو کرنے کو ہر وقت تیار رہنے لگا ہے۔

فلپ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ شاہ راڈرک نے اُسے چونکا دیا۔ راڈرک نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"فلپ! کیا تم اپنے بادشاہ کا ایک اہم کام کر سکتے ہو؟"

"عالیجاہ ......!" فلپ نے ادب سے جواب دیا۔ "غلام آپ کے حکم پر اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے۔ حضور مجھے کسی خدمت پر مامور تو کریں۔"

فلپ ـــــــ! راڈرک نے بھاری لہجے میں کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ایک چیز بہت پسند ہے؟"

فلپ گھبرا گیا۔ وہ شاہ کا اشارہ یا مقصد نہ سمجھ سکا۔ اُس نے دبی آواز میں کہا۔

"شاہ! آپ بادشاہِ وقت ہیں۔ آپ کسی چیز کو بھی پسند کر سکتے ہیں اور اُسے حاصل بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے حکم سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔"

"فلپ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو ......" راڈرک نے نرمی سے کہا۔ "دراصل مجھے ایک خوبصورت ہستی پسند آ گئی ہے اور میں اُسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

فلپ مسکرایا اور بولا۔

"شاہ کے حضور، غلام کا مسکرانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ حضورِ اعلیٰ فرماتے ہیں کہ اُنہیں ایک ہستی بھا گئی ہے۔ یہ تو ایک انسانی فطرت ہے۔ مگر حضور کا یہ کہنا کہ آپ اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہ بات میرے خیال میں مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ آپ کی ذات اس ملک کی مالک و مختار ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ہستی آپ کو پسند آئی ہے اُسے آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ اس ملک کی ہر شے، ہر چیز، ہر ہستی، ہر فرد و بشر آپ کے حکم کا تابع ہے۔ وہ ہستی یقیناً بدقسمت ہو گی جسے آپ پسند فرمائیں اور وہ آپ کے پاس آنے سے انکار یا گریز کرے۔"

"تمہاری یہ بات ٹھیک ہے فلپ ......!" راڈرک نے آواز میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس کو کیا، کیا جائے کہ وہ ہستی جسے ہمارے دل نے پسند کیا ہے وہ ہماری پرواہ نہیں کرتی یا ہم پر توجہ نہیں دیتی۔ ہمارا خیال ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے؟"

فلپ دوبارہ مسکرایا اور بولا۔

"میں سمجھ گیا عالیجاہ! وہ ہستی جو آپ کی آنکھوں کو بھا گئی ہے، اُس کا تعلق اس محل کی خواتین سے نہیں۔ بلکہ آپ نے شاید کسی دوسری ہستی کو پسند کیا ہے جس پر آپ کا نہ تو اقتدار اثر کرتا ہے اور نہ وہ آپ سے مرعوب ہوتی ہے۔"

"فلپ ——!" راڈرک چڑ گیا۔ "یہ تم کیا غلط ملط سوچ رہے ہو۔ کون ہے جو ہمارے اقتدار کا سامنا کر سکے۔ وہ ہمارے اقتدار میں ہوتے ہوئے بھی ہمیں بے اختیار سمجھتی ہے۔ اور غالباً وہ ٹھیک ہی سمجھتی ہے۔"

"عالم پناہ!" فلپ بھی دل ہی دل میں جھلا اُٹھا۔ "میں چونکہ ایک ان پڑھ غلام ہوں اس لئے آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا اُمید کروں کہ آپ مجھے صاف

صاف الفاظ میں بتائیں گے کہ وہ کون سی اور کس جہان کی پری ہے جس پر ہمارے تاجدار کا دل آ گیا ہے؟"

"میں اُس کا نام تو نہیں جانتا ——" راڈرک نے شدید بے بسی سے کہا۔ "مگر میں روز اپنی ان آنکھوں سے اُسے اپنے سامنے دوڑتے بھاگتے دیکھتا ہوں ——"

راڈرک نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے کی دیوار میں لگا ہوا دروازہ ایک زوردار جھٹکے اور آواز کے ساتھ کھلا اور چار پانچ حسین و جمیل دوشیزائیں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے شاہی محل کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ دروازے کے کھلنے کی آواز سے فلپ اور راڈرک دونوں ہی چونک پڑے تھے اور دونوں کی نظریں دروازے سے آنے والی لڑکیوں پر لگ گئی تھیں۔

اُسی وقت شاہ راڈرک نے فلپ کو اپنی طرف مخاطب کیا۔

"فلپ! دیکھ اُس پری پیکر کو دیکھ! جس کے گلے میں سرخ ریشم کا گلوبند بندھا ہوا ہے۔"

فلپ کی نظریں آنے والی لڑکیوں پر پہلے ہی لگی ہوئی تھیں۔ لڑکیوں کا یہ گروہ محل شاہی کے برابر کے پری خانہ کی طرف سے آیا تھا جہاں اُمراء اور عمائدین سلطنت کی بچیاں رہائش پذیر تھیں جن کی سرپرستی خود شاہ راڈرک کے ہاتھوں میں تھی۔

"خوب —— بہت خوب۔" فلپ کی زبان سے ایک دم نکل گیا۔ "حضور نے کیا صورت اور کیا پری جمال دوشیزہ انتخاب کی ہے۔ میں تو حضور کے انتخاب کا غلام ہو گیا۔"

"کیا تو پہلے ہی ہمارا غلام نہیں تھا جو اب ہو گیا ہے؟" راڈرک جیسے ناراض ہو گیا۔ "تو کیا تیرے باپ دادا بھی ہمارے غلام تھے۔ تیری کیا مجال ہے کہ تو ہماری پسند کو ناپسند کرے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں حضور ——!" فلپ نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ "کیا اس مغرور اور نادان لڑکی نے آپ کو پسند کرنے میں کوئی عذر پیش کیا ہے، اور کیا اُسے یہ نہیں معلوم کہ شہنشاہِ وقت نے اُسے پسند کر لیا ہے؟"

"یہی تو مشکل ہے فلپ ——!" شاہ راڈرک نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"ابھی تو اُس نے ہم سے بات بھی نہیں کی۔"

"اب آپ بالکل فکر نہ کیجئے ——" فلپ نے مٹھی بند کر کے جواب دیا۔ "آپ کی طرف سے اب میں اُس سے بات کروں گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ وہ کس طرح ہاتھ جوڑے آپ کے قدموں میں حاضر ہوتی ہے۔"

"ایسی غلطی نہ کرنا فلپ!" شاہ نے اُسے سمجھایا۔ "پہلے یہ معلوم کرنا کہ وہ کس کی چشم و چراغ ہے۔ پھر اگر موقع مناسب معلوم ہو تو ہمارا نام درمیان میں لانا۔ مگر احتیاط سے۔ کہیں بات کا بتنگڑ نہ بن جائے اور رعایا ہمارے خلاف اُٹھ کھڑی ہو۔"

"آپ بھی کیا فرماتے ہیں شاہِ محترم ——!" فلپ نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ جب میں اُس کو یہ بتاؤں گا کہ شاہِ اُندلس، تجھے اپنی ملکہ بنانا چاہتے ہیں تو وہ خوشی سے ناچنے لگے گی۔"

شاہ راڈرک، اُس حسین و مہ جبین دوشیزہ کو دیکھتے ہی اُسے دل دے بیٹھا تھا۔ حالانکہ اُس بچی کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال سے زیادہ نہ دکھائی دیتی تھی۔ اور شاہ راڈرک اپنی پوری جوانی اِدھر اُدھر لٹا کر بڑھاپے کی دلدل میں دھنس چکا تھا۔ مگر آج بھی وہ خود کو ایک چھبیلا جوان ہی سمجھتا تھا۔

آخر شاہ راڈرک نے اپنے منہ چڑھے غلام کو حکم دیا۔

"فلپ! ہم تمہیں اس معاملہ کو نہایت ذہانت اور دلیری سے حل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ مگر احتیاط شرط ہے۔ ہاں تمہیں خوف کھانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ہر وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہسپانیہ (اندلس) کا بادشاہ ہر وقت تمہاری مدد پر ہے۔"

فلپ نے فوراً جھک کر راڈرک کو سلام کیا اور خود آہستہ آہستہ اُن لڑکیوں کی طرف چلا جو شاہی محل کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اب آگے پیچھے واپس جا رہی تھیں۔

فلپ کے اُن کے پاس پہنچنے کے دوران نصف لڑکیاں دروازے سے گزر کر دوسری طرف پری خانہ، جسے شاہ راڈرک نے امن گھر کے نام سے مشہور کر رکھا تھا، جا چکی تھیں۔ مگر شاہ راڈرک (لرزیق کی محبوبِ نظر یعنی نواب جولین کی معصوم اور حسین و جمیل بیٹی) ابھی دیوار کے اس طرف ہی تھی۔ اُس کے ساتھ صرف ایک اور لڑکی تھی جو اُس کی گہری اور محبوب سہیلی تھی۔

شاہ لرزیق کا غلام فلپ اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ لپکتا ہوا دونوں لڑکیوں کے پاس پہنچا۔ فلپ چونکہ بادشاہِ وقت کا منہ چڑھا غلام تھا اس لئے لوگ عام طور سے اُس کی عزت کرتے یا خوفزدہ رہتے تھے۔ دونوں معصوم لڑکیاں شاہ کے منہ چڑھے غلام کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

فلپ نے لڑکیوں کے قریب پہنچ کر ادب سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو راستے میں روک کر گفتگو کر رہا ہوں۔ دراصل میرا نام ——"

"فلپ ہے اور تم شاہ لرزیق کے منہ چڑھے غلام ہو ——" یہ بات دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے فلپ کی بات کاٹ کے کہی۔

"آپ بہت تیز معلوم ہوتی ہیں۔ میرا نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اور فلپ نے گردن تان لی۔

"شیطانوں کے نام نہ پوچھے جاتے ہیں اور نہ بتائے جاتے ہیں۔ وہ تو خود بخود مشہور ہو جاتے ہیں۔" لڑکی نے فلپ کو منہ توڑ جواب دیا۔ "تمہاری اطلاع کے لئے بتاتی ہوں کہ میرا نام حفصہ ہے۔ اور میری ساتھی سہیلی "فلورا" کے نام سے مشہور ہے۔"

"صرف فلورا نہیں، بلکہ فلورا فلورنڈا ——" فلپ نے لقمہ دیا۔ "آپ کو تو میں نہیں جانتا مگر آپ کی سہیلی کافی مشہور ہیں۔ ان کا نام تو شاہی محلات میں اس طرح مشہور ہے جیسے چمن میں گلاب مشہور ہوتا ہے۔"

"بس بس —— بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" حفصہ نے سخت لہجہ اختیار کیا۔

"شاہی محلات کے غلام تو اس طرح بات کرتے ہیں جیسے وہ خود بادشاہِ وقت ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے حفصہ اور فلورا نے قدم آگے بڑھائے۔ اسی وقت فلپ نے اُنہیں روکتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ تھوڑی دیر اور ٹھہریں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میرے پاس آپ کے لئے ایک پیغام ہے۔"

"کس کے لئے پیغام ہے؟" حفصہ بپھر گئی۔ "کس کی جرأت ہوئی کہ وہ ہمیں

تمہارے ذریعہ پیغام بھیجے؟"

"حفصہ! ذرا تحمل سے بات کرو۔" فلورا نے حفصہ کو روکا۔ "پہلے یہ معلوم کرو کہ پیغام کسی مرد کا ہے یا عورت کا۔ ہوسکتا ہے تمہاری یا میری کسی سہیلی نے کوئی پیغام بھیجا ہو۔"

حفصہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس نے فوراً بات سنبھالی۔

"اے میرے بھائی! پہلے ذرا یہ تو بتاؤ کہ پیغام میری یا فلورا کی کسی سہیلی نے بھیجا ہے یا کسی غیر مرد کا ہے؟"

اس کے جواب میں شاہی غلام اکڑ کے بولا۔

"پیغام آپ کی سہیلی فلورا کے لئے ہے۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ پیغام بھیجنے والی نہیں، بلکہ بھیجنے والا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی ـــــ" فلورا کا رنگ اُڑ گیا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ "وہ کون کمینہ ہے؟ اُس کے کلے چیر کے رکھ دوں گی۔"

"اُس کا نام سن کے آپ کے منہ میں پانی آ جائے گا ـــــ" فلپ نے ایک بے تکا قہقہہ لگایا۔

فلورا کا پہلے رنگ اُڑا تھا اور اب اُس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ آہستہ آہستہ فلپ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"میرے بھائی فلپ! میرے کان میں بتاؤ کہ وہ کون ظالم ہے جس نے تمہارے ذریعے مجھے پیغام بھیج کر مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے؟"

فلپ تیز قدم اُٹھاتا فلورا کے پاس پہنچا اور اُس کی طرف جھک کے آہستہ سے بولا۔

"خوش نصیب نواب زادی فلورا! تمہیں بادشاہِ وقت شاہ راڈرک نے پسند کیا ہے اور اب وہ تمہاری ملاقات کے لئے بے چین ہیں۔"

فلورا اور حفصہ دونوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اُس دن تو دونوں بچیاں ذلیل فلپ کو کسی نہ کسی طرح فریب دے کر اپنی قیام گاہ (ہوسٹل) میں واپس آ گئیں۔ مگر وہاں پہنچتے ہی اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دیوار کے اُس پار قدم بھی نہیں رکھیں گی۔

فلورا نے ہوسٹل میں پہنچتے ہی حفصہ کو وارننگ دی۔

"اب دروازہ کے اُس پار جانے کے لئے بھول کے بھی نہ کہنا۔"

"لو ـــــ میں کیوں کہوں گی جانے کو؟" حفصہ نے منہ بنا کر کہا۔ "مجھے تو فلپ کی بات پر اس قدر غصہ آیا تھا کہ میں اُسے جوتیاں مارنے پر تیار ہوگئی تھی۔"

"نہ حفصہ! ایسا کبھی نہ کرنا۔" فلورا نے اُسے سمجھایا۔ "یہ چھوٹے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ فلپ، بادشاہ وقت کی ناک کا بال ہے۔ وہ ہماری دشمنی پر اُتر آیا تو زمین آسمان کے قلابے ملا دے گا۔ یہ غلط باتیں اور غلط کاریاں تو اس دور کی پیداوار ہیں۔ کیا ہم لرزیق (راڈرک) کو اپنے باپ کا درجہ نہیں دیتے؟"

"کیوں نہیں ......؟" فلورا نے اس کی تائید کی۔ "میری ماں اور بابا نواب جولین نے مجھے یہی بتایا ہے کہ ملک کا بادشاہ، ملک کی بہو بیٹیوں کا باپ ہوتا ہے۔ مگر یہ کمبخت کیسا بادشاہ ہے؟ یہ اپنی بچیوں کو بھی بری نظر سے دیکھتا ہے۔"

"بہر حال ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" حفصہ نے اُسے سمجھایا۔ "فلپ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس کی پشت پر دراصل اسپین (اندلس) کا خود مختار بادشاہ لرزیق ہے۔"

پھر دونوں بچیوں نے اپنے اپنے کان پکڑے اور قسم کھائی کہ وہ دیوار کے پار شاہی علاقے میں کبھی قدم نہ رکھیں گی۔

○□○

اُس زمانہ میں اسپین (اندلس، ہسپانیہ) اپنی قدرتی عطیات اور حسن و دلفریبی کی وجہ سے مختلف اقوام کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ چنانچہ کبھی ایک قوم نے اُس کے سبزہ زاروں کو لوٹا، اُس کے مرغزاروں کو تاراج کیا، کبھی دوسری نے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے قدم یہاں پہنچے جنہوں نے سات آٹھ صدیاں مستقل طور پر وہاں حکومت کی۔ وہ بھی اس طرح کہ اُس کی صنعت و حرفت، رنگینی اور لطافت، تجارت اور زراعت، تعمیر و اختراعات میں گرانقدر اضافے کرتے رہے۔ حتیٰ کہ عیسائیوں نے اپنے اُکھڑے قدم جمائے جواب تک جمے ہوئے ہیں۔

کہنے کو تو یہاں آئریا، کلٹ، فنیقی، یونانی، رومانی، شیوانی، الانی، وانڈال، قوطی (گوتو) سبھی قوموں نے اپنا اپنا رنگ جمایا اور اس حسین و شاداب علاقے کو کبھی آباد کیا اور کبھی برباد۔

یہ ساری قومیں بجز فینیقیوں کے جو ملک شام سے وابستہ تھیں، باقی سب مشرقی یا وسطی یورپ سے متعلق تھیں۔

فینیقیوں نے حضرت محمدؐ کی پیدائش سے بہت پہلے شام سے آکر اسپین سے تجارتی رشتہ جوڑا اور کئی بستیاں قائم کیں۔ بعد میں جب افریقہ میں علاقہ قرطاجنہ میں اُن کی باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی تو 247 ق م میں اُنہوں نے جنوبی اسپین میں بھی اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یونانی بھی یہاں آئے اور انہوں نے اسپین کے مشرقی ساحل پر کچھ شہر بھی آباد کئے اور اُن پر حکومت بھی کی۔ دوسری صدی کے آخر میں رومنوں نے قوت پکڑی اور اُن کی حکومت کئی سو برس تک اسپین میں قائم رہی۔ مگر جب اُن کی طاقت کا زور ٹوٹا تو اسپین ہی کے باشندے جو شمال

مغرب میں پھیلے ہوئے تھے اور شیوانی کہلاتے تھے، اس کے اُوپر قابض ہو گئے۔ مگر اُن کے حوصلے بھی جلد پست ہو گئے اور بحیرۂ خزر کے نواح میں بسنے والی ایک قوم نے جو الانی کہلاتی تھی، وسط یورپ اور فرانس کو فتح کیا اور بعد میں اسپین میں بھی اپنے قدم جمائے۔ ان کے بعد قوطیوں کا رنگ جما۔ 414ء میں وہ اسپین میں داخل ہوئے اور 419ء میں انہوں نے شیوانی اور الانی مقبوضات کو بھی فتح کرلیا اور اسپین سے لے کر دریائے لوائر (LOIR) تک اپنی حکومت کو پھیلایا۔ مگر حسین و شاداب گہوارے کو عرصہ تک اُن کے قبضے میں کیسے رہنے دیا جاتا؟ جرمن سے ایک قوم دندل نامی فرانس کی سرحدوں کو پار کرتی اسپین میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئی اور بیس برس تک یہاں حکومت کر کے افریقہ واپس چلی گئی۔ انہی کے نام پر اسپین، واندلیکہ یا واندلیسہ کہلایا اور ان کے بعد وہ قوم داخل ہوئی جو ''گوتو'' کہلاتی تھی۔ جب یہ شمال کی جانب بڑھے اور اٹلی پر قابض ہوئے تو استرد گوتو کہلاتے۔ اور جب اسپین میں حکومت کا سنگ بنیاد رکھا تو ویزی گوتو کے نام سے پکارے گئے۔ اس قوم کا آخری بادشاہ غیطشہ (WITZA) تھا جس کو اٹلی کی باغی فوج کے سردار لرزیق (راڈرک) نے شکست دی اور قتل کرا کر عنان حکومت سنبھال لی۔ اس کا زمانہ 53ھ یا 71ء میں تھا جب مسلمانوں نے اسپین میں نقل و حرکت شروع کی۔

یہ ایک دو خشک صفحات دراصل اندلس (اسپین) کی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے جن کا بیان اس لئے ضروری تھا کہ آپ کو ناول کی اصل کہانی سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ پس ہم اس تھوڑی سی خشک تحریر کے بعد اپنے بہاریہ پلاٹ کی طرف آتے ہیں اور اندلس کے رنگین مزاج بادشاہ کا پھر ذکر شروع کرتے ہیں۔

اُس دن شام کو جب فلپ اپنے بادشاہ کے حضور پیش ہوا تو اُس کا چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا۔ فلپ کو بادشاہ کے مزاج میں اتنا دخل حاصل ہوگیا تھا یا بادشاہ نے اُسے اتنا منہ چڑھا لیا تھا کہ وہ بادشاہ سے بھی برابری کے انداز میں گفتگو کرتا تھا اور بادشاہ بھی اُسے اپنے ایک دوست یا ہمدرد کا درجہ دیتا تھا۔

بادشاہ نے فلپ کا منہ لٹکا ہوا اور چہرہ اُترا اُترا سا دیکھا تو ہنس کے بولا۔

''فلپ! تیرا منہ تو ایسے لٹکا لٹکا سا ہے جیسے اس پر جوتیاں برسی ہوں۔''

راڈرک ایک آزاد ملک کا خودمختار بادشاہ تھا۔ مگر وہ اپنے ایک حقیر ملازم کو اس انداز سے مخاطب کر رہا تھا؟ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بادشاہ لرزیق اور فلپ دونوں آپس میں گہرے دوست ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فلپ کو بادشاہ کے مزاج میں نہ صرف پورا پورا دخل تھا بلکہ وہ ملازم ہوتے ہوئے بادشاہ کو اپنے برابر کا خیال کرتا تھا۔ پس فلپ نے بھی بادشاہ کو اُسی بے تکلف انداز میں جواب دیا۔

''حضور! بادشاہ سلامت! آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لئے کل کی چھوکریوں کی جوتیاں کھاتا رہوں اور آپ میرا ہنس ہنس کے مذاق اُڑاتے رہیں۔''

شاہ راڈرک کو فلپ کے اس جلے کٹے جواب پر اور ہنسی آئی۔ وہ بولا۔

''ہم تمہارے جوتیاں کھانے کا بدلہ تو نہیں اُتار سکتے۔ مگر تمہیں یہ یقین ضرور دلاتے ہیں کہ اگر تم جوتیاں مارنے والی کی جوتیاں ساتھ لاتے تو ہم انہیں سونے چاندی میں تلوا کر وہ سونا چاندی تمہارے حوالے کر دیتے۔''

مگر فلپ کا منہ پھولے کا پھولا رہا۔

بادشاہ راڈرک نے پھر اُسے چھیڑا۔

''اچھا یہ بتاؤ فلپ! کہ تمہیں کتنی جوتیاں پڑیں؟''

''حضور! آپ میرا دل کیوں جلاتے ہیں؟'' فلپ کھسیانا ہو کر بولا۔ ''میں نے اُس سے تو صرف یہی کہا تھا کہ اے نیک بخت! تیری قسمت کھل گئی۔ شاہِ وقت نے تجھے پسند کر لیا ہے اور تو اب شاہی محل کی زینت بنا دی جائے گی ــــــ''

''پھر ــــــ پھر کیا ہوا؟'' فلپ کہتے کہتے رُکا تو بادشاہ نے بات آگے بڑھائی۔

''ہوا کیا سرکار ــــــ'' فلپ نے بتایا۔ ''میں نے اُسے جیسے ہی یہ خوشخبری سنائی تو وہ فوراً جوتی اُتار کر میری طرف لپکی۔ میں نے یہی بہتر خیال کیا کہ وہاں سے بھاگ نکلوں ورنہ واقعی جوتیاں پڑ جائیں گی۔''

''احمق کہیں کا ــــــ'' راڈرک نے منہ بنایا۔ ''تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ہم نے اُسے پسند کر لیا ہے اور ہم اُسے اب شاہی محل میں جگہ دیں گے۔''

''میں نے یہ سب کچھ کہا تھا سرکار!'' فلپ نے بتایا۔ ''مگر وہ دونوں تو مارنے مرنے پر تیار ہو گئیں۔''

''یہ دونوں کون ہیں؟'' بادشاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ایک تو وہی جس کے گلے میں سرخ گلوبند تھا ــــــ'' فلپ نے بتانا شروع کیا۔ ''اور دوسری اُس کی سہیلی حفصہ۔ مجھے تو وہ دونوں آپس میں بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔''

''یک نہ شد دو شد۔'' اور شاہ راڈرک جیسے کھل اُٹھا۔ ''اچھا یہ تو بتا کہ وہ دوسری لڑکی جس کا نام تو نے بتایا ہے ــــــ؟''

''حفصہ حضور ــــــ'' فلپ نے فلورا کی سہیلی کا نام بتایا اور پھر رونا سا منہ بنا لیا۔

شاہ راڈرک کو جیسے غصہ آ گیا۔ اُس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''فلپ! ہم نے تجھے لڑکی کو اپنے ساتھ لانے کا حکم دیا تھا اور تو اُسے لانے کی بجائے منہ بناتا ہمارے پاس آ گیا۔''

''پھر میں کیا کرتا شاہ حضور؟'' فلپ بھی چڑ گیا۔ ''اگر لڑکیوں سے پھر بات کرتا تو تمام لڑکیاں میرے اُوپر ہلہ بول دیتیں اور میری اچھی طرح مرمت ہو جاتی۔''

''تو نے ہمارا نام لے کر اُنہیں ڈرایا نہیں؟'' شاہ نے مصنوعی غصہ سے منہ بنا لیا۔

''بادشاہ حضور ــــــ!'' تجربہ کار فلپ نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا۔ ''لڑکیاں تو بس لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ پھر جب ان پر جوانی چڑھتی ہے تو اس مثل کہ ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا کے مطابق، وہ زمین پر قدم نہیں رکھتیں۔''

''اُن پر ہمارے نام کا بھی کوئی خوف نہیں پڑا؟'' شاہ راڈرک (لرزیق) نے اپنی شان جھاڑی۔ ''تجھے چاہئے تھا کہ اُنہیں ہمارے عزت، وقار اور دبدبے کا رُعب دیتا۔ یہ چھوٹے لوگ صرف رُعب داب سے ہی ڈرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تجھے ایک بار اور کوشش کرنا چاہئے ــــــ''

شاہ اندلس راڈرک (لرزیق) کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سامنے کی دیوار میں لگا ہوا دروازہ ایک بار پھر کھل گیا اور لڑکیوں کے غول ایک بار پھر شاہی بیٹھک کے طویل صحن میں بھاگنے دوڑنے لگے۔ عیاش اور بوالہوس شاہ راڈرک لرزیق کے منہ میں پانی بھر آیا اور اُس کی آنکھیں ایک عیارانہ مسرت سے چمک اُٹھیں۔

شاہ نے فلپ سے پُر رُعب لہجے میں کہا نہیں بلکہ حکم دیا۔

''فلپ! قدرت نے تجھے اپنی کارگزاری دکھانے کا ایک اور موقع عطا کیا ہے۔''

آگے بڑھ اور اپنا کام دکھا۔"

فلپ کو بھی شاید شاہ کی باتوں پر غصہ یا شرم آ گئی تھی۔ اُس نے ایک جھرجھری لی اور آستینیں چڑھا کر دبے پاؤں لڑکیوں کی طرف بڑھا۔

شاہ راڈرک لرزیق نے اُسے حوصلہ دینے کے لئے کہا۔

"شاباش فلپ ــــــ! فکر کی ضرورت نہیں۔ ہم تیری پشت پر ہیں۔"

اور فلپ مزید شہ پا کر تیز قدم اُٹھاتا لڑکیوں کے قریب پہنچ گیا۔ خوش طبع اور بیباک لڑکیاں تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر دوڑ دُھوپ میں مصروف تھیں۔ فلپ، لڑکیوں کی نظریں بچاتا ایک درخت کے موٹے تنے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے نظروں ہی نظروں میں فلپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ اتنی آڑ میں تھا کہ شاہ راڈرک کو نظر نہ آ سکا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شاہ راڈرک کی نظریں فلپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ لڑکیاں حسب معمول دوڑ دُھوپ میں مصروف تھیں اور فلپ پیڑ کی آڑ میں چھپا اپنے شکار یعنی فلورا کو نظروں ہی نظروں میں تلاش کر رہا تھا۔ اسی طرح کچھ وقت اور گزرا تھا کہ فلورا اور اُس کی سہیلی حفصہ آگے پیچھے بھاگتی فلپ کو دکھائی دیں۔ فلپ کو اُن دونوں پر بہت غصہ تھا۔ بادشاہ راڈرک کے سامنے بھی اُسے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ فلورا کو ضرور پکڑے گا اور اُسے شاہ کے حضور پیش کر کے انعام حاصل کرے گا۔

اتفاق سے دونوں سہیلیاں یعنی فلورا اور حفصہ اسی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں۔ پس فلپ نے سیٹی بجا کر اپنے ساتھ کے دونوں غلاموں کو ہوشیار کیا۔ ان دونوں کو وہ احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا کہ اگر وہ لڑکیوں میں گھر جائے یا پکڑا جائے تو اُس کے ساتھی غلام اُسے چھڑا لیں۔

فلورا اور حفصہ جب بھاگتی ہوئی اُس درخت کے بالکل قریب پہنچ گئیں جہاں فلپ چھپا کھڑا تھا تو فلپ بڑی تیزی سے نکل کر فلورا کے سامنے آ گیا۔ فلورا اپنے سامنے فلپ کو دیکھ کر گھبرا گئی اور زور سے چیخ مار کر رُک گئی۔ اُس وقت تک فلپ اور اُس کے دونوں ساتھی غلام بھی وہاں پہنچ گئے۔ چونکہ فلپ کو شاہ اُندلس کا تعاون

حاصل تھا اس لئے جب فلورا اُس درخت کے بالکل قریب پہنچی جہاں فلپ چھپا ہوا تھا تو چالاک اور مکار فلپ پیڑ کی آڑ سے نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا فلورا کے سامنے پہنچ گیا۔

فلورا اپنے سامنے فلپ کو دیکھ کر کانپنے لگی اور خوف کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی۔ فلورا کی سہیلی حفصہ اُس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اُس نے فلورا کی چیخ سنی تو دوڑ کر اُس کے پاس پہنچی۔ ٹھیک اُسی وقت فلپ نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر بیچاری فلورا کی اُبھری ہوئی چھاتیوں کو پکڑ لیا۔ فلورا پہلے ہی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ فلپ کی اس حرکت سے اُس کے ہاتھ پیروں نے بالکل جواب دے دیا اور وہ ایک دلدوز چیخ مار کر گرنے لگی۔ وہ تو حفصہ بالکل اُس کے قریب تھی، اُس نے فوراً فلورا کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا ورنہ وہ گر جاتی تو پتہ نہیں کتنی چوٹ آتی۔

اس حادثہ یا واقعہ سے دیوار کے دونوں طرف طوفان برپا ہو گیا۔ شاہ راڈرک کی وہ ملکہ جس کے انتظام اور نگہداشت میں یہ بچیاں پرورش پا رہی تھیں، اُسے جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اُس نے اُسی وقت دیوار میں لگے ہوئے اُس واحد دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کروا دیا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ دوسری طرف جب فلپ نے بادشاہ راڈرک کو اس واقعہ کی تفصیل بتائی تو وہ اُلٹا فلپ پر برس پڑا۔

شاہ نے سخت لہجے میں فلپ کو پھٹکارا۔

"تو نے فلورا کے سینے پر ہاتھ کیوں ڈالا؟ میں نے تو کہا تھا کہ تو فلورا کو پکڑ کر اور اُسے اپنی پیٹھ پر ڈال کر مجھ تک پہنچا دے، پھر میں جانوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی شوخیوں میں آ گیا اور لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔"

"نہیں حضور......!" فلپ نے فوراً عذر پیش کیا۔ "میں نے تو فلورا کو محض بے بس کیا تھا تا کہ اُسے لانے میں آسانی ہو۔ مگر تمام لڑکیاں مجھے چمٹ گئیں اور مجھے جان بچانا مشکل ہو گئی۔"

"تو بہت بے وقوف ہے۔" بادشاہ بولا۔ "اب اُسے حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"اگر حضور اجازت دیں تو میں ایک مشورہ دُوں؟" فلپ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تو اور مشورہ ـــــ؟" بادشاہ نے منہ بنایا۔"تجھ سے ایک لڑکی نہیں پکڑی گئی۔ حالانکہ میں نے تیری مدد کو دو اور غلام بھی ساتھ کر دیئے تھے۔ اب تو کوئی مشورہ پیش کرنا چاہتا ہے۔"

"حضور کی مرضی۔" فلپ نے منہ بنایا۔"حضور کو چاہیئے تھا کہ وہ کم از کم میرا مشورہ تو سن لیتے۔"

"اچھا عقلمند! بتا تیرا کیا مشورہ ہے؟" شاہ راڈرک نے منہ بنا کر کہا۔

فلپ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کے اور آواز دبا کے بادشاہ سے کہا۔

"حضور! میرا مشورہ ہے کہ اس سلسلے میں گرو دیو (پجاریوں کا سرغنہ) کی مدد حاصل کی جائے۔"

ایک غلام کی زبان سے یہ مشورہ سن کر بادشاہ چونک پڑا۔ اُس نے حیران نظروں سے فلپ کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو نے زندگی میں شاید پہلی بار ایک درست اور صحیح بات کی ہے۔ ہم تیرے مشورے کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں تو گرو دیو کا خیال ہی نہیں آیا۔ آخر وہ روز ہی ہم سے کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے ہیں اور ہم اُن کا ہر مطالبہ بے عذر پورا کر دیتے ہیں ـــــ کیوں نہ ہم گرو دیو کو آزما کے دیکھیں؟"

"آپ گرو دیو (لارڈ پادری) کو ضرور امتحان میں ڈالیں۔ آخر وہ بھی تو روز کسی نہ کسی کام کے لئے آپ سے مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔" فلپ نے شاہ راڈرک کو پھونک بھری۔"گرو دیو چاہیں تو وہ اپنے چار غنڈے، پری خانہ بھیج کر فلورا کو زبردستی وہاں سے اُٹھوا سکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" بادشاہ نے غلام کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔"آخر اُن کے ہاتھ میں تمام کلیساؤں کی چابی ہے۔"

جس زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے اُس دور میں اسپین کی معاشرتی حالت بہت دِگرگوں تھی۔ ہر طرف تنگ نظری، تعصب، جہالت، بے دینی، گمراہی، انتشار، اضطراب، جھوٹ، پست خیالی، شراب خوری، قمار بازی اور زنا کاری وغیرہ وہ چند برائیاں تھیں جو نہ صرف اسپین بلکہ ماسوائے اسپین میں بھی بدرجہ اتم پھیلی ہوئی تھیں۔ دولت کی

زیادتی کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ اچھائیوں نے اپنا دامن سمیٹ لیا تھا۔ گوتھ قوم نے دو صدیاں حکومت کرنے کے باوجود رومنوں کی خرابیوں اور گمراہیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے ان عیوب میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں تھا کہ گوتھ جری اور دلیر تھے۔ مگر اُن کی دلیری، اخلاقی کمزوریوں کو دُور کرنے کی بجائے اُن میں اور اضافہ کا سبب بن گئی تھی۔ عیسائی پادری اور علمبردار کمزوریوں کا مجموعہ تھے۔ اُن کی عبادت گاہیں، شاہی حرم سراؤں سے بھی بڑھ کر تھیں۔ اُن کے خزانے دولت سے معمور مگر اخلاق سے خالی تھے۔ اُن کی عورتوں کی عصمتیں نہ محفوظ تھیں اور نہ اُن کی بیٹیوں کی ناموس۔ اُن کے اعصاب پر کلیسا کے ناخداؤں کا پہرہ تھا اور اُن کی بیٹیوں کو کسی وقت بھی غلام بنایا جا سکتا تھا۔

پست طبقہ لوگ جنہیں عوام کہہ کر پکارا جاتا تھا وہ حقیقت میں غلام تھے بلکہ غلاموں سے بھی بدتر۔ مزے میں تھے تو بس دو طبقے۔ یا حاکم وقت یا مذہب کے خداوند۔ جہاں حسن وعشق کی چاشنی تھی، رنگینیوں اور رعنائیوں کے مزے تھے۔ اگر کوئی کام تھا تو بس جیو تو عیش کی خاطر اور اگر مرو تو کئے ہوئے عیش کے غم میں۔ پادری اور لارڈ پادری (گرو، مہا گرو) آلہ کار تھے حکومت کے اور حکومت سہارا تھی مذہبی پیشواؤں کا۔ جب یہ عالم ہو تو کسی اخلاق کے سدھارنے والے اور انسانیت کے علمبردار کو کہاں جگہ مل سکتی تھی؟

چنانچہ وہاں کے سابق شاہ وٹیزا جو یہودیوں کا بہی خواہ تھا، کے خلاف بغاوت ہوئی خود فوج کی جانب سے۔ اور لرزیق (راڈرک) نے تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔ اُس عہد کے رواج کے مطابق نوابین، روسا، اُمراء اور حکام اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو حرمِ شاہی میں آدابِ شاہی اور اصولِ تہذیب سکھانے کی غرض سے بھیجتے تھے۔ پس گورنر سبتہ نواب جولین کی لڑکی فلورا فلورنڈا بھی اسی غرض سے محلسرا میں داخل کی گئی تھی۔ اس کی عزت کی حفاظت شاہ راڈرک پر اسی قدر واجب تھی جتنی اپنی لڑکی کی۔ مگر شاہ راڈرک تمام اصول اور قوانین کو بالائے طاق رکھ کر خوبصورت اور شوخ وچنچل فلورا پر عاشق ہو گیا اور اُسے اپنے قبضے میں لانے کے لئے ڈول ڈالنے لگا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اُس وقت صرف دو طبقے مزے میں تھے، ایک حاکم

یعنی بادشاہ اور دوسرا مذہب کا خداوند یعنی پوپ۔ ہر طرف حسن و عشق کی چاشنی تھی، رنگینیوں اور بے حیاؤں کے مزے تھے، دولت کی بہتات تھی اور عشرت سے التفات تھا۔ اگر پادری حکومت کے آلۂ کار تھے تو حکومت اُن کی سرپرست اور مددگار۔ سابق شاہِ اندلس وٹیزا قوم گوتو کا آخری تاجدار، یہودیوں کا بہی خواہ، غریبوں کا معاون اور شرافت کا حامی تھا۔ وہ عبادت گاہوں میں ناسور کی طرح رِستے ہوئے گناہوں اور گنہگار زندگی سے متنفر تھا اور یہی سب سے بڑی اُس کی خامی اور کمزوری تھی جو اُس کے زوال کا باعث بنی اور وہ ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں چلا گیا۔

مذہب اور پیشواؤں کے احکام کی خلاف ورزی اس عہد کا سب سے بڑا گناہ تھا جو ناقابلِ معافی سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ شاہ وٹیزا اس کی سزا نہ بھگتتا؟ پوپ کا حکم مذہب کے ماننے والوں کے لئے فریضۂ الٰہی تھا۔ اور پھر اس میں تو خود غرضوں اور خود پرستوں کا فائدہ تھا۔ چنانچہ بغاوت ہوئی خود فوج کی جانب سے راڈرک (لرزیق) کی سرکردگی میں۔ اُس نے ویٹزا کو واجب القتل قرار دے کر خود تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔

پس جس جگہ اور جس زمانہ میں راڈرک (لرزیق) حکمران تھا، اُس ملک اور قوم کی سب سے عظیم ہستی مہا گرو یا پوپ تھا۔ بادشاہِ وقت ہر وقت اور ہر کام میں ''پوپ'' سے مشورہ کرتا تھا۔ چنانچہ موجودہ شاہ لرزیق یعنی راڈرک نے ملک اور قوم کے عذاب سے بچنے کے لئے پوپ کا سہارا ڈھونڈا۔ جس طرح بادشاہِ وقت پوپ کا لحاظ کرتا تھا اُسی طرح تمام جھگڑوں اور عذابوں سے بچنے کے لئے پوپ بھی ہر کام اور ہر بات میں پہلے شاہِ اُندلس کی طرف دیکھتا تھا اور اُس کی خوشی ہر دم مقدم رکھتا تھا۔

چنانچہ جب شاہ لرزیق (راڈرک) کے منہ چڑھے غلام فلپ نے مذہب کے ناخدا پوپ کے عشرت کدے پر دستک دی تو پوپ کا پورا بدن لرز اُٹھا۔ فلپ اگرچہ شاہِ وقت کا غلام تھا مگر بہرصورت وہ ملک کی سب سے عظیم ہستی یعنی بادشاہِ وقت کا نمائندہ ہو کر آیا تھا۔ فلپ نے اپنے بادشاہ کا نہ صرف وقار اور عزت برقرار رکھتے ہوئے بلکہ اُسے عظیم ثابت کرنے کے لئے پوپ کے محل یا عشرت گاہ کے چیف دربان کو سلام کرتے ہوئے پیغام دیا۔

''سب انسانوں سے عظیم تر اندلس کے پوپ اعظم کو شاہِ وقت کا پیغام پیش کیا جائے کہ شاہِ ہسپانیہ (اندلس) کے تاجدار راڈرک (لرزیق) کا یہ حقیر و فقیر غلام اور زلہ بردار فلپ اُن کے حضور حاضر ہے اور ایک نہایت اہم معاملہ میں اُن کی مشورت کا خواستگار ہے۔''

فلپ کے اچانک آ جانے سے پوپ کی عشرت گاہ میں پہلے ہی کھلبلی پڑ گئی تھی۔ اب جب اُنہوں نے سنا کہ شاہ کا ہرکارہ پوپ سے فوری مشورے کا خواہشمند ہے تو اُن سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ شاہ راڈرک اور پوپ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ وقت کے کسی ہرکارے نے پوپ سے فوری ملاقات کی درخواست کی ہو۔

پھر جب یہ پیغام پوپ کے گوش گزار کیا گیا تو وہ پہلے ہی سے گھبرایا ہوا تھا۔ مگر فلپ کے تند اور تلخ لہجے نے جس کا ذکر پیغام لانے والے خادم نے پوپ سے پہلے ہی کر دیا تھا، اُس کے اور ہوش اُڑا دیئے۔

پوپ نے اپنے خادم سے دبی زبان میں پوچھا۔

''جس وقت شاہ راڈرک کے غلام نے تمہیں پیغام دیا اُس وقت اُس کے چہرے پر کس طرح کے تاثرات تھے؟''

کہا جاتا ہے اور شاید درست ہی کہا جاتا ہے کہ بعض بادشاہوں کے دور میں بادشاہِ وقت سے زیادہ اُس کے ملازم عقلمند اور سمجھدار ہوتے تھے۔ تو یہی حال اس وقت پوپ کا تھا۔ وہ بادشاہِ وقت نہ تھا مگر اُس کی حیثیت، بادشاہ سے کسی طرح بھی کم نہ تھی مگر وہ فوری ملاقات کا پیغام سن کر سر سے پیر تک کانپ گیا تھا۔

شاید پوپ سے زیادہ اُس کا ہرکارہ سمجھدار تھا۔ اُس نے حد درجہ سکون اور اطمینان سے پوپ کو جواب دیا۔

''حضور بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں شاہ کے منہ چڑھے غلام فلپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت بڑا اُلّو کا پٹھا ہے۔''

''اور تم اُس سے زیادہ اُلّو کے پٹھے ہو ـــــ'' پوپ اپنے غلام کی بات سے چڑ گیا۔ ''تم نے غلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ پیغام بھیجنے والی ہستی اس ملک اور قوم کی سرتاج اور مالک ہے۔''

غلام کو جو جھاڑ پڑی تو اُس نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بع
پوپ نے کہا۔

"تم واپس جاؤ اور فلپ سے کہو کہ پوپ، شاہِ اُندلس کے محترم ہرکارے کی آ
سے بہت مسرور ہیں اور وہ اسی وقت اُسے خوش آمدید کہنے اور گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔"

پوپ کے ہرکارے نے واپس جا کر فلپ کو اطلاع دی کہ اُس کے آقا، شاہ
ہرکارے کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اُس سے اسی وقت گفتگو کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ
نہیں بلکہ پوپ، شاہی ہرکارے کی ملاقات سے بہت خوش ہوں گے۔

فلپ، پوپ کے ہرکارے کے ساتھ پوپ کی عشرت گاہ جسے وہ ڈرائنگ رُوم کے
طور پر بھی استعمال کرتا تھا، میں داخل ہوا۔ پوپ بہت مہربان نظر آ رہا تھا۔ اُس نے
فلپ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور اپنا دایاں ہاتھ فلپ کی طرف بڑھا دیا کہ اُسے
بوسہ دے۔ فلپ نے نہایت ادب سے پوپ کی ہتھیلی پر بوسہ دیا۔ پھر دو قدم پیچھے
ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

پوپ نے اپنے ہرکارے کو حکم دیا۔

"ہم شاہی ہرکارے سے شاہی پیغام پر گفتگو کر رہے ہیں۔ کسی فرد و بشر کو اجازت
نہیں کہ وہ ہماری گفتگو میں دخل اندازی کی کوشش کرے۔"

ہرکارہ حکم پا کر باہر نکلا۔ پھر اُس نے پوپ کے حکم سے دوسرے غلاموں کو باخ
کیا۔ اُسی وقت تمام صحنوں، دروازوں اور راہداریوں میں پہرہ لگ گیا اور اعلان کر د
گیا کہ پوپ اعظم، شہنشاہِ وقت کے پیغام رساں سے اہم گفتگو کر رہے ہیں اس لئے
پورے محل کی راہداریوں میں آمد و رفت کی ممانعت کی جاتی ہے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے پوپ کے شاہانہ محل میں چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جو جس
جگہ اور جس کمرے میں تھا وہیں قید ہو گیا۔ یہاں تک کہ پوپ کے لونڈی غلام بھی
پھونک پھونک کے قدم اُٹھا کے چلتے تھے۔

گفتگو کا آغاز شاہ کے منہ چڑھے غلام فلپ نے کیا۔

اُس نے نہایت ادب سے کہا۔

"اندلس کے شاہِ معظم نے پوپ اعظم کی خدمت میں سلامِ نیاز پیش کیا ہے ا
ان کی خیریت معلوم کی ہے۔"

پوپ نے گمبھیر آواز میں جواب دیا۔

"میں شاہِ معظم کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھے اپنا
خاص پیغام اپنے خاص ہرکارے کے ذریعے بھیجیں۔ میں شاہ کی اس ذرہ نوازی کا
جان و دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ شاہِ معظم جب بھی مجھے کسی کام
کا حکم دیں گے تو میں اسے سرانجام دینے میں سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔"

"سب سے پہلے پوپ معظم کے لئے شاہِ اُندلس کا یہ پیغام ہے کہ وہ آپ کی
خیریت کے خواہاں ہیں اور ہر دم آپ کی صحت اور درازئ عمر کی دُعا کرتے رہتے
ہیں۔" فلپ نے نہایت ادب سے کہنا شروع کیا۔

"ہم شاہ کی اس ذرہ نوازی کے شکر گزار ہیں۔" پوپ نے جواب دیا۔ "ہم شاہِ
معظم کی ہر خدمت کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ وہ ہمیں اس قابل سمجھیں۔"

"اے غریبوں اور امیروں دونوں کو ایک نظر سے دیکھنے والے پوپ اعظم! یوں تو
بادشاہ سلامت، اُن کی دُعاؤں کی طفیل بہت ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی
رعیت کی بھلائی کے لئے ہر وقت ہر کام کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔" فلپ نے موقع
ملتے ہی چاپلوسی شروع کر دی۔ "مگر اس وقت یعنی ان دنوں مزاج عالی کچھ مکدر
رہنے لگا ہے۔ شاہِ معظم کو کسی پہلو چین نہیں ملتا اور وہ دن رات کھوئے کھوئے سے
رہتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شاہِ معظم کسی پوشیدہ موذی مرض کی گرفت میں آ گئے
ہیں۔" پوپ اعظم نے اندازے سے کہا۔ "یہ صورتِ حال مزاجِ عالی کے لئے کسی طور
درست نہیں۔ اے شاہ کے قابل اعتماد ہرکارے! کیا تم شاہ کی اس خطرناک بیماری
کے بارے میں مزید کچھ اور آثار بتاؤ گے؟"

"جی ہاں پوپ اعظم ——!" فلپ نے سر جھکا کر کہنا شروع کیا۔ "شاہِ معظم کی
بھوک کم ہو گئی ہے۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ رات کو سوتے سوتے چونک کے
اُٹھ بیٹھتے ہیں اور فلورا فلورا کی آوازیں لگانے لگتے ہیں۔"

"فلورا —— یہ کون ہے؟ اس بیماری کا نام ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا۔" پوپ

اعظم پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا شاہ معظم نے اس سلسلے میں کسی طبیب سے مشورہ کیا ہے؟''

فلپ نے قدرے جھلاتے ہوئے کہا۔

''حضور پوپ معظم! یہ دواؤں سے بھاگنے والی کوئی مُردہ بیماری نہیں، بلکہ چلتی پھرتی اور دوڑتی بھاگتی بیماری ہے جس نے ہمارے شاہِ معظم و محترم کا کھانا پینا حرام کر رکھا ہے۔ حضور، شاہ پر جلد توجہ فرمائیں۔ ورنہ یہ مرض اُنہیں لے ڈوبے گا۔''

''اے فلپ! تم بے شک شاہِ اُندلس راڈرک اعظم کی ناک کا بال ہو ——'' پوپ اعظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مگر کسی کسی وقت تم عجیب اُلجھی اُلجھی باتیں کرنے لگتے ہو۔ ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ بادشاہ کو ایک خطرناک بیماری لگ گئی ہے۔ پھر کہتے ہو کہ وہ بیماری مُردہ نہیں بلکہ زندہ ہے اور دوڑتی بھاگتی پھرتی ہے۔ میری سمجھ میں تمہاری یہ بات نہیں آئی۔''

فلپ بھی مسکرا دیا۔ پھر اُس نے وضاحت کی۔

''پوپ اعظم! دراصل ہمارے شاہ معظم، پرستان کی ایک چلتی پھرتی پری پر عاشق ہو گئے ہیں اور اُس کے عشق نے شاہ کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اگر اُن کا جلد علاج نہ کیا گیا تو —— تو ——''

''تم بہت شوخ ہو گئے ہو فلپ ——!'' پوپ نے فلپ کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ پری ایسی ہی خوبصورت ہے جسے دیکھ کر شاہِ معظم پاگل ہو گئے ہیں؟''

''اے کلیساؤں کے ناخدا ——!'' فلپ نے اور زیادہ شوخی دکھائی۔ ''آپ کے کلیسا کی بھول بھلیوں میں کیسی کیسی صورتیں اپنی جلوہ نمائی کرتی اور دل لبھاتی ہیں۔''

پوپ نے اُسے مزید کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بات دوسری طرف موڑ دی اور صرف یہ کہا۔

''بادشاہ تو بہرحال بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اُس کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ آخر وہ کون سی ایسی ہستی ہے کہ جس تک شاہ کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا اور اُنہیں میری مدد کی ضرورت پڑ گئی؟''

فلپ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔

''آپ نے نواب جولین کا نام تو سنا ہو گا —— شاہ کا دل جس پری پیکر پر آیا ہے وہ اُسی نواب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اور ایک اطلاع کے مطابق اُس کی جلد ہی شادی ہونے والی ہے۔''

''یہ نواب جولین وہی تو نہیں جو قلعہ سبتہ کا مالک ہے؟'' پوپ نے کان کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل وہی —— آپ نے ٹھیک پہچانا۔'' فلپ نے تائید کی۔

قلعہ سبتہ اُن دنوں یورپ کی کنجی تھا۔ پہلے حاکم سبتہ بازنطینی حکومت کے ماتحت تھا مگر اُس کے زوال کے بعد اُس نے اسپین کی حکومت سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور اُس کا باجگزار ہو گیا تھا۔ قلعہ سبتہ کی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے پیہم دو حملے اُس کی فصیلوں کو شکستہ نہ کر سکے اور نہ اس کی مضبوط دیواروں کو ہلا سکے۔ آگ کے گولے وہاں ناکارہ ہو جاتے تھے۔ منجنیق سے حملے کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بیرونی حملوں کو روکنے کے لئے وہ آہنی دیوار بھی تھا اور سدِ سکندری بھی۔ اور اسی لئے اسپینش ہمیشہ سے اپنے آپ کو بیرونی حملوں سے محفوظ سمجھتا تھا۔

پوپ کی گھبراہٹ درست اور بجا تھی۔ اس قلعہ کی مضبوطی اور حاکم قلعہ نواب جولین کی شجاعت اور دلیری کا پورا یورپ قائل تھا۔ اُس کے قلعہ سبتہ کا نام سن کر پوپ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

فلپ نے پوپ کو خاموش دیکھا تو تنگ آ کے بولا۔

''پوپ اعظم! آپ نواب جولین کا نام سن کر تو ایسے خاموش ہو گئے ہیں جیسے اُس نے حملہ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسپین تو کیا پورا یورپ آپ کا غلام ہے۔ نواب جولین کی آپ کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟''

پوپ نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''اچھا —— تم پوری بات تو بتاؤ! شاہِ اُندلس اس سلسلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''چاہتے کیا ہیں ——'' فلپ نے پوپ کے آخری الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

"شاہِ معظم چاہتے ہیں کہ نواب جولین کی چنچل بیٹی کسی طرح اُن کے عشرت کدے میں پہنچا دی جائے۔"

"کسی طرح سے تمہاری کیا مراد ہے؟" پوپ نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" فلپ چڑچڑا ہو گیا۔ "صاف ظاہر ہے کہ نواب جولین کی بیٹی شاہِ اُندلس کے بلانے سے تو اُن کے عشرت کدے میں نہیں آ جائے گی۔ اُس کو تو وہاں لے جانا پڑے گا۔ اور اُسے لے جانے کے لئے نہایت مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے۔"

"تو کیا شاہ کے غلاموں کے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں؟" پوپ کو جیسے غصہ آ گیا۔ "تم دو چار غلام کیا اُس چھوکری کو پکڑ کر شاہ کے شبستاں تک نہیں پہنچا سکتے؟"

"نہیں معزز پوپ ــــ یہ ممکن نہیں۔" فلپ نے صاف انکار کر دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے ــــ" پوپ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تم شاہ کے تمام غلام مفت اور حرام کی روٹیاں توڑتے ہو۔ ایک ذرا سی لڑکی تمہارے قابو میں نہیں آ سکتی۔"

"اے پوپ اعظم ــــ!" فلپ کو بھی جیسے غصہ چڑھ گیا۔ "کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ شاہی سایۂ عافیت میں پلنے والی یہ لڑکیاں ایک سے ایک بڑے نواب اور لارڈ کی بیٹیاں یا بھتیجی اور بھانجیاں ہیں۔ اُن پر ہاتھ ڈالنا آگ سے کھیلنا ہے۔ ہم ٹکے ٹکے کے غلام تو اُن سے نظریں بھی نہیں ملا سکتے۔"

"اچھا چپ ہو جا ــــ خواہ مخواہ میں بکواس کئے چلا جا رہا ہے۔" اور پوپ نے فلپ کو پھٹکارنا شروع کر دیا۔ "تم سب حرام کا مال کھا کھا کے موٹے ہوتے چلے جاتے ہو۔ اگر ذرا سا کام پڑ جائے تو اِدھر اُدھر بغلیں جھانکتے ہو۔ اور وہ تمہارا دل پھینک اور لفنگا جو اپنے آپ کو اُندلس کا خداوند سمجھتا ہے، اُس نے اپنے محل میں عشرت کدہ کھول رکھا ہے۔ کہنے کو تو وہ رعیت کا باپ ہے۔ اور اُس کی وہ نک چڑھی ملکہ جو اُس کے عشرت کدے کی ناظمِ اعلیٰ ہے، اُس کو کس بات کا اتنا زعم ہے؟ وہ تو جگہ جگہ پروپیگنڈا کرتی پھرتی ہے کہ میں نے نئی نسل کو سدھارنے کے لئے ایک عظیم تربیت گاہ کھول رکھی ہے۔ مگر اس تربیت گاہ میں ہوتا کیا ہے؟ یہی نا کہ وہاں سے خوبصورت چڑیوں کو پکڑ کر شاہِ اُندلس کے قفس میں قید کر دیا جائے۔ اُن کی زندگیاں برباد کر دی

جائیں اور ــــ اور ــــ"

اور کہتے کہتے پوپ کا منہ تھوک سے بھر گیا اور مجبور ہو کر اُسے خاموش ہونا پڑا۔

فلپ کا یہ حال تھا کہ اُس کا پورا جسم جیسے سن پڑ گیا تھا۔ وہ اگرچہ شاہِ اُندلس اور پوپ اعظم دونوں ہی کے کرتوتوں سے پوری طرح واقف تھا مگر اس وقت پوپ، شاہ کے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی شاہِ اُندلس راڈرک کی تمام عیاشیوں سے نہ صرف واقف تھا بلکہ خود اُن میں شریک بھی رہتا تھا۔

پوپ بولتے بولتے تھک گیا تو فلپ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"پوپ اعظم ــــ!" فلپ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں جس کام اور مقصد سے آپ کے پاس آیا تھا اُس کی بابت آپ نے کچھ نہیں کہا۔"

"کام ــــ مقصد ــــ" پوپ نے فلپ کے دونوں الفاظ دہرائے۔ "مگر میں شاہِ اُندلس کا کام اور مقصد کس طرح پورا کر سکتا ہوں؟"

اور فلپ بے ساختہ ہنس پڑا۔ پھر اُس نے سنبھل کر کہا۔

"اے عظیم اور قابل احترام پوپ! شاہ یہ چاہتا ہے کہ نواب جولین کی کنواری بیٹی اُن کی عشرت گاہ میں بہر طور پہنچا دی جائے۔ اور یہ کام آپ کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ آپ اپنے چند چیلے میرے ساتھ کر دیجئے۔ میں رات بھر اُنہیں اپنا مہمان بنا کر رکھوں گا۔ اور صبح کو جب پری خانہ گرم ہو گا اور پریاں اِدھر اُدھر پھرنے لگیں گی تو میں آپ کے چیلوں کو فلورا کی نشاندہی کر دوں گا۔ پھر میرا کام ختم ہو جائے گا اور باقی کام آپ کے چیلے دم کے دم کر لیں گے۔"

"یعنی ...... یعنی ......" پوپ نے دو بار لفظ یعنی پر زور دیا۔

"یعنی یہ کہ آپ کے چیلے فلورا کو دبوچ کر شاہی عشرت گاہ کے دروازے پر لے آئیں گے۔" فلپ نے پوپ کو جواب دیا۔ "میں دروازے پر چند غلاموں کے ساتھ موجود رہوں گا اور فلورا کو آپ کے چیلوں سے وصول کر لوں گا۔ چلئے، قصہ ختم ــــ"

اور پوپ نے اتنی زور سے ہنکاری بھری کہ پورا ماحول گونج اُٹھا۔

○□○

دوسرے دن بچیوں کی پرورش گاہ (پری خانہ) اور شاہی محل کے درمیان کا دروازہ جسے پرورش گاہ کی نگرانِ اعلیٰ یعنی شاہ راڈرک کی ملکہ کے حکم سے بند کر دیا گیا تھا، ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ بچیوں نے اس سلسلے میں قطعی غور نہیں کیا کہ دروازہ کیوں بند کیا گیا تھا اور پھر خود ہی کیوں کھول دیا گیا ہے؟ اُنہوں نے دروازہ کھلا دیکھا تو بھرے مار مار کر دروازے سے شاہی احاطے میں داخل ہو گئیں اور حسب معمول چہلیں اور کلیلیں کرنے لگیں۔ یہ بچیوں کا عام دستور تھا اس لئے کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک دو بار دُور گیلری میں فلپ چلتا پھرتا دکھائی دیا۔ اُس کے ساتھ دو چار آدمی بھی تھے مگر یہ کوئی بات نہ تھی۔ فلپ اگرچہ غلام تھا۔ غلام بھی شاہِ وقت کا اس لئے اس کے ماتحت بھی کئی غلام تھے جو ہر وقت اُس کی جوتیاں سیدھی کرنے پر تیار رہتے تھے۔

گلابی جاڑوں کا زمانہ تھا۔ دُھوپ آہستہ آہستہ گرم ہو رہی تھی اور کھیلنے کودنے والی لڑکیاں تھک کر درختوں کے سائے میں ستانے اور سانس لینے کے لئے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ایک جگہ کئی اُونچے اور سایہ دار درخت قریب قریب ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کے نیچے گہرا سایہ بلکہ ایک حد تک اندھیرا سا چھایا ہوا تھا مگر وہاں ستانے اور سانس لینے کے لئے گرمی کی بجائے ہلکی ہلکی ٹھنڈک تھی۔

بچیاں اور لڑکیاں حسب معمول بھاگ دوڑ کر رہی تھیں۔ دُھوپ میں اب کافی تیزی آ گئی تھی اور لڑکیاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ستانے کے لئے اُس جگہ جمع ہو جاتی تھیں جہاں گہرا سایہ تھا۔ ٹھیک ایسے موقع پر سایہ دار جگہ کے قریب ہی ایک بار پھر شاہ کے منہ چڑھے غلام کی صورت نظر آئی مگر اس وقت فلپ تنہا نہ تھا بلکہ اُس کے ساتھ چار پانچ مضبوط جسم کے جوان بھی تھے۔ مگر وہ سب مزدور اور کام کرنے والے نظر

آتے تھے۔

ٹھیک اُسی وقت ایک طرف سے دوڑتی ہوئی بچیوں کا ایک ریلا آیا۔ اس ریلے میں نواب جولین کی بیٹی فلورا فلورنڈا اور اُس کی گہری سہیلی حفصہ بھی تھی۔ دونوں بچیاں کبھی آگے پیچھے اور کبھی برابر برابر بھاگ رہی تھیں۔ پھر جب وہ تھک کے ستانے کے لئے سائے کے قریب پہنچیں تو نہ جانے کہاں اور کدھر سے فلپ لپکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اُس کے عقب میں چار پانچ لٹھ بردار مسٹنڈے بھی تھے۔

فلپ اپنے ساتھ آنے والوں کو آہستہ آہستہ کچھ ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ پھر جب وہ گہرے سایہ میں کھڑی ہوئی بچیوں کے قریب پہنچا تو اُس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا جہاں فلورا اور اُس کی سہیلی حفصہ کھڑی ستا رہی تھیں۔ فلپ کا اشارہ پا کر اُس کے مسٹنڈوں میں سے دو غریب حفصہ پر پل پڑے۔ اُنہوں نے اُس معصوم اور کمزور بچی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ دوسری طرف تین غنڈوں نے فلورا کو اس طرح گھیر لیا جس طرح شکاری کتے، بلی کو گھیرتے ہیں۔

غریب اور معصوم فلورا کا یہ صورتِ حال دیکھ کر رنگ فق ہو گیا تھا اور اُسے اپنا بدن اس قدر وزنی معلوم ہو رہا تھا جسے سنبھالنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ پھر فلورا کو چکر آیا اور وہ غش کھا کر گری۔ مگر فلپ کے غنڈوں نے اُسے زمین پر گرنے نہیں دیا، بلکہ ایک غنڈے نے گرتی ہوئی فلورا کو ہاتھوں کا سہارا دے کر اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ فلورا اس وقت بے ہوش اور دنیا سے بے خبر ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ صرف چند لمحوں میں ہوا۔ معصوم اور بے زبان بچیاں بھاگ کر اپنے حصے یعنی جائے پناہ میں پہنچ گئیں اور ہر طرف سناٹا سا چھا گیا۔ فلپ اپنا کام کر کے اور فلورا کو ایک غنڈے کی پیٹھ پر لدوا کر شاہی محل کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ اب چاروں طرف ایسا ہُو کا عالم تھا کہ جیسے قبرستان ہو۔

مگر ٹھیک اُسی وقت لڑکیوں کی پناہ گاہ یا ہوسٹل کی ناظمہ، شاہ راڈرک کی وہ ملکہ جس کے سپرد اور پناہ میں اس تربیت گاہ کی بچیاں تھیں، وہ بدحواس اور گھبرائی ہوئی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اُس کے ساتھ ایک درجن سے زیادہ کنیزیں تھیں اور وہ مسلح نہیں تو نیم مسلح ضرور تھیں۔ ہر کنیز کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار نہ سہی مگر ڈنڈا

ضرور تھا۔

ملکہ یعنی اپنی وارڈن کو دیکھ کر کونے کھدروں میں چھپی ہوئی بچیاں بھی ایک ایک کر کے اُس کے پاس آ گئیں۔ مگر اس طرح کہ ہر ایک کا چہرہ فق اور رنگ اُڑا ہوا تھا۔ بعض بچیاں تو سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ ملکہ کا غصہ سے رنگ لال بھبھوکا ہو گیا اور وہ شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ اور لڑکیوں میں شور مچا ہوا تھا۔

”فلورا کو شاہی غلام پکڑ کر لے گئے۔“

”ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“

”ہمیں گھر واپس بھیجا جائے۔“

اور کسی طرف سے ایک لڑکی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

”شاہِ اُندلس ہمارا باپ نہیں بلکہ بھیڑیا ہے، غنڈہ ہے، بدمعاش ہے۔ ہم بے سہارا نہیں۔ ہمیں فوراً ہمارے گھروں کو بھجوایا جائے۔“

ہوسٹل کی وارڈن یعنی ملکہ غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر ملکہ نے چیخ کر کہا۔

”تمام کنیزیں میرے پاس آ جائیں۔ مگر خالی ہاتھ نہیں، بلکہ جس کو جو ہتھیار مل سکے وہ اُسے لے کے آئے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے پچیس تیس کنیزوں کا مجمع، ملکہ کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ ملکہ کے حکم کے مطابق ہر کنیز اپنے طور پر مسلح تھی۔ مگر اُن کا اسلحہ ایک ایک دو دو فٹ کے ڈنڈے، پھکنیاں چمٹے، مسالہ پیسنے کے چٹو بٹے تھے۔ بہت کم کنیزوں کے ہاتھوں میں سبزی کاٹنے کے چھری کانٹے تھے۔

جب ملکہ کے گرد نیم مسلح کنیزوں کا مجمع ہو گیا تو اُس نے شاہی محل کے مہمان خانہ کا رُخ کیا۔ وہاں پندرہ سولہ مسلح محافظ کھڑے تھے۔ ملکہ نے مہمان خانہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور اس کا آغاز ملکہ نے اس طرح کیا کہ ایک باڈی گارڈ پر لوہے کی ایک سلاخ کھینچ ماری۔ ایک تو ملکہ کا رُعب دوسرے سلاخ کی ضرب، مسلح پہریدار مار کھا کر فوراً محل کے اندر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

ملکہ نے مہمان خانے میں داخل ہو کر وہاں توڑ پھوڑ مچا دی۔ وہاں بھی مسلح پہریدار

موجود تھے مگر ملکہ کو روکنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی۔ ملکہ تو بہرحال ملکہ ہی ہوتی ہے۔ پہریدار گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے اور ملکہ اپنی کنیزوں کو ساتھ لئے مہمان خانہ سے گزر کر پچھلی دیوار تک پہنچ گئی۔ اس دیوار کی دوسری جانب شاہ راڈرک کی شاہی خواب گاہ تھی جس پر سخت پہرہ لگا تھا۔

ملکہ نے آگے بڑھ کر خواب گاہ کے پہریدار کے ناظم کو حکم دیا۔

”ہمارے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ہم شاہ کی خوابگاہ میں جانا چاہتے ہیں۔“

”میں مجبور ہوں ملکہ عالم!“ پہریدار نے عاجزی سے کہا۔ ”شاہ عالی مقام کا حکم ہے کہ کوئی بھی شخص ان کی خوابگاہ کے ورانڈے میں بھی داخل نہ ہونے پائے۔“

”ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہمارا راستہ چھوڑ دو ——“ ملکہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ”ہم خوابگاہ میں داخل ہو کے رہیں گے۔“

یہ کہتے ہوئے ملکہ نے قدم آگے بڑھائے۔ مگر پہریداروں کے حاکم نے پہریداروں کو حکم دیا کہ سوائے ملکہ عالیہ کے اور تمام خواتین کو دھکے مار مار کر برآمدے سے باہر نکال دو۔ اس حکم کو سنتے ہی پہریداروں نے ملکہ کی کنیزوں پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ کے ساتھ آنے والی تمام کنیزیں اپنی جانیں بچا کر اِدھر اُدھر جا چھپیں اور ورانڈے میں صرف ملکہ کھڑی رہ گئی۔

ملکہ نے یہ صورت حال دیکھی تو اُس نے پہریداروں کے ہاتھوں مار کھانے اور بے عزت ہونے سے بہتر یہ خیال کیا کہ اُن سے ٹکرانے کی بجائے واپس چلی جائے۔

چنانچہ ملکہ مزید کسی پیش قدمی کے شاہی خوابگاہ کے برآمدے سے لوٹ آئی۔

ملکہ —— ملک اُندلس کے عظیم تاجدار، بادشاہ اور فرمانروا راڈرک کی جلیل القدر ملکہ اس وقت کس قدر بے بس اور مجبور تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ برآمدے کے اُس پار شاہی خوابگاہ میں کیا ہو رہا ہے؟ کتنا بھیانک اور گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ مگر وہ کتنی مجبور تھی۔ شاہی پہریداروں اور شاہ کے منہ زور سپاہیوں نے اُسے آگے بڑھنے اور ایک معصوم کی عزت بچانے سے روک دیا تھا——

ٹھیک اُسی وقت برآمدے کا دروازہ کھلا اور ایک لرزتی اور لڑکھڑاتی ہستی کو دروازے سے باہر کر کے دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔ یہ لرزتی اور لڑکھڑاتی ہستی نواب

جولین والی سبتہ کی اکلوتی لختِ جگر فلورا فلورنڈا تھی جسے راڈرک بادشاہِ وقت نے اپنے غنڈوں کے ذریعہ تربیت گاہ کے میدان سے زبردستی اُٹھوا لیا تھا اور پھر اُس مجبور سے جو اُس کی اپنی بیٹی سے بھی عمر میں چھوٹی تھی، شاہ راڈرک نے اپنا منہ کالا کیا تھا۔ اُس نے فلورا ہی کی عزت نہ اُتاری تھی بلکہ راڈرک نے ملک اُندلس کی تمام معصوم اور کنوری بچیوں کے سر سے چادر کھینچ کر سب کو مادر زاد ننگا کر دیا تھا۔

لرزتی اور کانپتی فلورا نے خواب گاہ سے نکل کر ایک اتنا لمبا سانس لیا کہ اُس کی چیخ نکل گئی۔ ملکہ اُندلس جو اُس وقت تک خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ چکی تھی، اُس نے فلورا کو لرزتے اور کانپتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔

فلورا اُسی طرح لرزتی اور کانپتی ملکہ اُندلس کے گلے لگ کر اُس سے چمٹ گئی اور چیخ مار کے بولی۔

''مادر ملکہ ــــــ! میں لٹ گئی ــــــ میں برباد ہوگئی ــــــ''

ملکہ نے اُسے سینے سے بھینچ لیا اور اُس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

''بیٹی فلورا! صرف تو ہی برباد نہیں ہوئی۔ بلکہ اُندلس کے بھیڑیے نے کنواریوں کے ماتھے سے کنوار پن کی بندیا نوچ لی ہے۔ اُس نے صرف تجھے ہی نہیں بلکہ پوری سلطنت کی عزت اور حرمت کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو اس بدکار اور بدمعاش بادشاہ کو معاف نہیں کرے گی۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ شاید وہ تیری خوشامد کرے اور تجھے انعام و اکرام سے نوازنے کا دھوکہ دے کر معافی مانگے اور تو ترس کھا کر اُس کا گناہ بخش دے۔ مگر میں ــــــ میں ملکہ اُندلس ــــــ اُندلس کی تمام کنواریوں کی سرپرست اور اُن کی عزت کی رکھوالی، اس غلیظ، بدکار اور اوباش بادشاہ کو کسی صورت معاف نہیں کروں گی۔ میں اعلان کرتی ہوں کہ میں راڈرک کی زوجگی سے منکر ہوگئی ہوں۔ میں اُس کی عمر بھر صورت نہیں دیکھوں گی۔ اور نہ کبھی اُس کے سامنے جاؤں گی۔''

فلورا پر شاید ملکہ اُندلس کے اس اعلان اور حق گوئی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ''ہائے ملکہ'' کہہ کر ایک بار پھر ملکہ سے چمٹ گئی۔ مگر شاید اُس کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے کہ وہ

زمین پر گر گئی اور بے ہوش ہوگئی۔ اُسی وقت سامنے سے فلورا کی سہیلی حفصہ آتی دکھائی دی جسے شاہ راڈرک کے غنڈوں نے مار مار کر بیچاری کا کچومر نکال دیا تھا اور وہ بیہوش ہو کر ایک طرف گر گئی تھی۔

حفصہ کو جب ہوش آیا تو لڑکھڑاتی ہوئی فلورا کی تلاش میں نکلی اور یہاں پہنچی جہاں فلورا کا ملکہ کے گلے سے چمٹے ہوئے اور روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ ملکہ اُندلس کو فلورا اور حفصہ کی دوستی کا پتہ تھا کیونکہ یہ دونوں سہیلیاں ہر اتوار کو ملکہ کے سلام کو اُس کے پاس جایا کرتی تھیں۔

ملکہ نے حفصہ کو دیکھ کر کہا۔

''لو حفصہ! اپنی سہیلی کو سنبھالو ــــــ!''

فلورا نے آنکھیں کھولیں اور حفصہ کو دیکھا۔ پھر وہ ہچکیاں لیتی ملکہ کو چھوڑ کر حفصہ کے گلے لگ گئی۔ پھر فلورا نے رو رو کے حفصہ کو اپنے اُوپر گزرنے والی ایک ایک بات کو تفصیل سے بتایا۔ اس گفتگو کے دوران فلورا کے نہ تو آنسو رُکے اور نہ اُس کی ہچکیاں بند ہوئیں۔ فلورا کا رونا پیٹنا بند نہ ہوا تھا کہ حفصہ کا بھائی شوشی سلمان آ گیا۔

اُس نے تیز نظروں سے اپنی بہن کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ فلورا کو کیا ہوا؟ حفصہ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور اُسے آہستہ آہستہ فلورا پر جو گزری تھی بتا دیا۔ شوشی سلمان کو نہ صرف یہ باتیں سن کر افسوس ہوا بلکہ اُس کے تن بدن میں غصے سے آگ لگ گئی۔

فلورا دُور کھڑی ان بہن بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب حفصہ خاموش ہوئی تو فلورا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اُن کے قریب پہنچی۔ شوشی نے شرم سے سر جھکا لیا کہ فلورا شرمندہ نہ ہو۔ مگر فلورا نے گردن اُٹھا کر شوشی کو غور سے دیکھا، پھر آہستہ سے کہا۔

''شوشی بھائی! کیا میرا ایک کام کر دیں گے؟''

''کیوں نہیں فلورا بہن!'' شوشی نے اطمینان سے کہا۔ ''میری نظر میں حفصہ کی طرح تم بھی میری بہن ہو۔ میری خدمات تمہارے لئے حاضر ہیں۔ تم جو کام بھی کہو وہ میں دل و جان سے کروں گا۔ بلکہ مجھے تمہارا کام کر کے خوشی ہوگی۔''

''میں تمہارا پہلے ہی شکریہ ادا کرتی ہوں شوشی!'' پھر فلورا نے وہیں کھڑے کھڑے

شوشی کو اپنے اوپر گزرنے والی مصیبت بلکہ قیامت کو پوری تفصیل سے بیان کیا۔فلورا کے لئے یہ بہت شرم کی بات تھی۔مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اُس نے شوشی سے ایک بات بھی چھپائی تو اُس کا اعتماد متزلزل ہو جائے گا اور شاید وہ اُس کا کام کرنے سے انکار کر دے۔

فلورا کی داستان اس قدر غم ناک اور الم انگیز تھی کہ شوشی بار بار ٹھنڈی سانسیں لیتا تھا اور اُس کے چہرے کا رنگ بار بار متغیر ہو جاتا تھا۔فلورا رو رو کے شوشی کو جب اپنی داستان سنا چکی تو شوشی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میری بد نصیب اور غمزدہ بہن! تمہاری غمناک کہانی سن کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسی وقت شاہی محل میں گھس کر شاہ راڈرک کو قتل کر دوں۔''

''نہیں میرے پیارے بھائی!'' فلورا نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتا ہے۔وہ کتنا ہی کمزور ہو جائے مگر اُس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے اس کی آڑ میں وہ انسان کیا، انسان کی بستیوں کی بستیاں اُجاڑ کر پھینک سکتا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری بہن!'' شوشی نے کہا۔''اچھا تم بتاؤ، تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو؟ میں تمہارے ہر کام کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔''

''تم میرے بابا کو تو جانتے ہی ہو ــــــ؟'' فلورا نے پوچھا۔

''اُنہیں کون نہیں جانتا بہن ــــــ!'' شوشی نے فوراً جواب دیا۔''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے والد نواب جولین ہیں اور وہ اس وقت سبتہ کے کاؤنٹ (نواب) ہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے بھائی ــــــ!'' فلورا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔''میں اگرچہ راڈرک کی طاقت سے آگاہ ہوں اور میں نے تمہیں اُس کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اُس سے مقابلہ کرنا آسمان سے تارے توڑنے کے برابر ہے۔مگر اُس نے مجھ پر جو ظلم توڑا ہے اُسے میں بھول نہیں سکتی۔میں اگرچہ حقیر ہوں، مگر بابا کی ایک طاقت ہے۔اُن کا نام ہے۔وہ ایک علاقے کے حاکم ہیں۔اپنی روداد اُن کے کانوں تک پہنچانا چاہتی ہوں۔میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے بابا اکیلے شاہ راڈرک کا مقابلہ

نہیں کر سکتے۔مگر اُن کا ایک مقام ہے، اُن کا نام بھی ہے۔میرا حال سن کر اُن کا خون ضرور کھول اُٹھے گا۔کیونکہ وہ ایک علاقے کے حاکم کے ساتھ ساتھ ایک صاحب اثر نواب اور اُندلس کی ایک عظیم ہستی ہیں۔ممکن ہے کہ وہ راڈرک سے انتقام لینے کی کوئی صورت نکالیں، کہیں دوڑ دُھوپ کریں۔اُن کے چاروں طرف کے نوابوں اور شاہوں سے اچھے مراسم اور تعلقات ہیں ــــــ''

''بہن فلورا ــــــ!'' شوشی اُلجھتے ہوئے بولا۔''ان باتوں کو تو الگ رکھو! مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو ــــــ؟''

''میں ــــــ میرے بھائی ــــــ!'' فلورا کی آواز بھرا گئی۔''میں اپنے آپ پر گزرنے والی قیامت کو باپ کے کانوں تک پہنچانا چاہتی ہوں۔اس لئے کہ وہ مجھ سے زیادہ سمجھدار اور طاقتور ہیں۔''

''بس ــــــ میں سمجھ گیا۔'' شوشی نے پُر اعتماد لہجے میں فلورا کو یقین دلایا۔''میں آج ہی سبتہ روانہ ہو جاؤں گا اور انکل جولین تک ایک ایک بات تفصیل سے پہنچاؤں اور سناؤں گا۔''

''مگر ایک بات کا خیال رہے بھائی شوشی ــــــ!'' فلورا نے شوشی کو جیسے چونکا دیا۔

''کس بات کا ــــــ کیا بات ہے وہ؟'' شوشی نے گھبرا کے پوچھا۔

''اس بات کا خیال رہے کہ اُن کے سوا میری حالت کی کسی اور کو خبر نہ ہو۔'' فلورا نے زور دے کر کہا۔

''کیسی بات کر رہی ہو بہن ــــــ'' شوشی نے مضبوط لہجے میں کہا۔''میں تم میں اور حفصہ میں کوئی فرق نہیں کرتا۔پھر اس بات کو پھیلانا اپنے آپ کو بدنام کرنا ہے۔میں نواب بہادر کے علاوہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دُوں گا۔''

اور دوسرے دن شوشی، نواب جولین کی طرف سبتہ روانہ ہو گیا۔



قلعہ سبتہ جس کا حاکم بدنصیب فلورا کا باپ نواب جولین تھا، اُن دنوں یورپ کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے اس قلعہ کو حاصل کرنے کے لئے اس پر پہلے بھی دو حملے کئے تھے مگر وہ اس کی فصیلوں کو شکستہ نہ کر سکے تھے اور نہ اس کی مضبوط دیواروں کو ہلا سکے تھے۔ آگ کے گولے وہاں ناکارہ ہو جاتے تھے اور منجنیق کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بیرونی حملوں کو روکنے کے لئے یہ قلعہ آہنی دیوار بھی تھا اور سد سکندری بھی۔ اسی لئے اسپین ہمیشہ سے اپنے آپ کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ سمجھتا تھا۔

نواب جولین اس قلعہ پر ایک عرصہ سے قابض تھا اور اُندلس کے شاہ راڈرک کو اُس سے کوئی شکایت یا شکوہ نہ تھا۔ آس پاس کی تمام ریاستوں اور قلعوں کے قلعہ دار اور حاکم نواب جولین کی عزت و احترام کرتے تھے اور اُس کے تمام بادشاہوں سے گہرے مراسم تھے۔ شاہ راڈرک کو علم تھا کہ فلورا کا باپ ایک مشہور حاکم اور قلعہ دار ہونے کے ناطے اُس زمانہ میں کافی معروف تھا۔ مگر شاہ راڈرک نے اپنی طاقت کے زور پر نواب جولین کی عزت کا قطعی خیال نہ کیا اور اُس پر شہوت کی دیوی ایسی سوار ہوئی کہ اُس نے دنیا سے آنکھیں بند کر کے نواب جولین کی معصوم بیٹی کی دوشیزگی اور عزت و حرمت کو پارہ پارہ کر دیا۔

مگر قدرت کے انتقام سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ راڈرک تو اپنی شیطانی حرکت کر چکا تھا۔ مگر اب قدرت کے انتقام کا موقعہ تھا جس کے لئے اُس کی معصوم بیٹی فلورا نے خود اپنی سہیلی کے بھائی کے ذریعے اپنے باپ کے پاس پیغام بھجوایا تھا۔ چنانچہ حفصہ کا بھائی شوشی سلمان بھاگم بھاگ سبتہ پہنچا اور اُس نے فلورا پر گزرنے والی پوری داستان الف سے لے کر ے تک سنا دی۔

نواب جولین ایک عزت دار قلعہ دار ہی نہ تھا بلکہ وہ محبت کرنے والا باپ بھی تھا۔

بیٹی پر گزرنے والی قیامت کی تفصیل سن کر اُس کا خون کھول اُٹھا اور پورے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اس قدر بے چین اور بے قرار ہوا کہ اسی وقت تلوار کھینچ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اُسی وقت وہاں اُس کا جگری دوست دُرّانی پہنچ گیا۔ اُس نے جو نواب کی تیوریوں پر پڑے ہوئے بل دیکھے تو پریشان ہو گیا۔ اُس نے جولین کی باگ پکڑتے ہوئے دریافت کیا۔

"جولین ——! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟ کدھر جانے کا ارادہ ہے؟"

نواب جولین نے دوست کا ہاتھ جھٹک دیا اور گھوڑا بڑھاتے ہوئے غصے اور پورے جوش سے بولا۔

"مجھے مت روکو درّانی —— میں جا رہا ہوں۔ میں اُسے قتل کر دوں گا۔ کچا چبا جاؤں گا۔"

"کس کو قتل کرو گے؟ کس کو کچا چباؤ گے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ! آخر میں تمہارا دوست ہوں۔" درّانی نے خوشامد سے پوچھا۔

"شاہ راڈرک نے میری بے عزتی کی ہے —— بلکہ میری عزت اُتاری ہے۔ میں ہسپانیہ جا رہا ہوں۔ اُس کے دربار میں جا کر اُسے قتل کروں گا تب میرا دل ٹھنڈا ہو گا۔"

"آخر شاہ نے تمہاری کیا بے عزتی کی ہے —— تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" یہ کہتے ہوئے درّانی نے نواب جولین کے ہاتھ سے باگیں کھینچ کر اُسے گھوڑے سے اُتار لیا۔ نواب جولین اُس وقت اس قدر پریشان اور مضمحل ہو رہا تھا کہ گھوڑے سے اُتر کر درّانی کے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"تمہیں کیا ہوا نواب ——؟" درّانی نے اُسے آہستہ سے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔ "شاہ راڈرک نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"اُس ظالم نے —— اُس بھیڑئیے نے میری عزت لوٹی ہے۔ میں اُسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔" نواب پھر درّانی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے دوبارہ رونے لگا۔

یہ منظر دیکھ کر دو ایک تماشائی وہاں جمع ہو گئے۔

دُرّانی نے نواب کے گھوڑے کی باگ سنبھالی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے کہ
"چلو! گھر چلو ۔۔۔ یہاں مجمع لگ گیا ہے۔ خوامخواہ تماشہ بننے سے کیا فائدہ ہوگا"

پھر نواب جولین چپ چاپ دُرّانی کے ساتھ چلنے لگا۔

دُرّانی، نواب جولین کے گھر جانے کی بجائے اُسے معہ اُس کے گھوڑے کے ا
گھر لے آیا۔

پھر جب وہ دونوں دُرّانی کے ڈرائنگ رُوم میں اطمینان سے بیٹھ گئے تو دُرّانی
بات چھیڑی۔

"ہاں نواب جولین! اب بتاؤ کہ اصل قصہ کیا ہے؟ اور تم شاہ اُندلس کے اس قد
خلاف کیوں ہو گئے؟"

"راڈرک، شاہ اُندلس نہیں بلکہ ایک بھیڑیا ہے جو تخت و تاج کے زور پر اپنی رعا
اپنی بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔"

دُرّانی کے دریافت کرنے پر نواب جولین نے اپنی معصوم بیٹی پر بھیڑیا صفت
راڈرک کی ذلیل اور کمینہ حرکت کی پوری تفصیل روتے ہوئے بیان کر دی۔ دُرّانی
یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ اب تک یہی سنتا آیا تھا کہ بادشاہ اور ملکہ رعیت
ماں باپ ہوتے ہیں۔ مگر راڈرک کا تو طریقہ ہی اُلٹا ہو گیا تھا۔ اُسے علم تھا کہ ملکہ
شاہی محل میں نوابین کی بچیوں کے لئے ایک تربیت گاہ کھول رکھی تھی جس کا ایک سیا
مقصد یہ تھا کہ جن جن نوابین اور اُمرائے سلطنت کی بچیاں، ملکہ کی تربیت گاہ میں
پرورش پا رہی تھیں، اُن کے باپ بھائی، شاہِ وقت کے خلاف کسی بغاوت میں شریک
نہ ہوں اور ہر دم بادشاہ کی وفاداری کا کلمہ پڑھتے رہیں۔

مگر اب تو شاہ اُندلس راڈرک (لرزیق) نے اس تربیت گاہ کی معصوم بچیوں کی
عزت سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس سے پہلے کتنی بچیوں کی زندگی تباہ کر
چکا تھا کہ وہ بیچاری اُس کے خلاف آواز نہ اُٹھا سکیں۔ ہاں نواب جولین کی بیٹی نے
اس ظلم و جبر کے خلاف نہ صرف صدا بلند کی بلکہ اپنے باپ کو لکھ بھیجا کہ اُس کی بے
عزتی کا بدلہ شاہ راڈرک کے تخت و تاج کو اُلٹ کے لیا جائے۔

قلعہ سبتہ کا حاکم اعلیٰ نواب جولین ایک نہایت ذہین اور بہادر انسان تھا۔ اُ

جب اپنی بیٹی کا خط ملا تو وہ تڑپ اُٹھا اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ شاہ راڈرک کی
حکومت کا تختہ اُلٹ کے رہے گا، یا پھر اس کوشش میں اپنی جان گنوا دے گا۔

اب نواب جولین کے جگری دوست دُرّانی نے سلسلہ کلام ایک بار پھر شروع کیا۔
اُس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"نواب جولین! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور تم شاہ راڈرک کے
خلاف جو قدم بھی اُٹھاؤ گے، اس میں، میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ مگر میں تمہیں
لوہے کی دیوار سے ٹکرانے کا مشورہ کبھی نہیں دوں گا۔"

"لوہے کی دیوار سے تمہارا مطلب شاید شاہ راڈرک ہے؟" نواب جولین نے
غمگین آواز میں سوال کیا۔

"بالکل ۔۔۔!" دُرّانی نے جواب دیا۔ "راڈرک اس وقت اندلس کا بلا شرکت
غیرے بادشاہ اور حکمراں ہے۔ اُس کے پاس لاؤ لشکر ہے، شاہی خزانہ ہے، دنیا کے
دوسرے حکمرانوں سے اُس کے تعلقات ہیں۔ مطلب یہ کہ اُس کے ہاتھ لمبے ہیں اور
ہمارے اور تمہارے ہاتھ اُس کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم تم تو راڈرک کی اجازت
کے بغیر اُس کے دربار میں داخل بھی نہیں ہو سکتے۔ اس صورت میں ہم اُس کا کیا بگاڑ
سکیں گے؟"

نواب جولین چڑ گیا۔ اُس نے چیخ کر کہا۔ "میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں راڈرک
کا سر قلم کر دوں گا یا اُس کی فوجوں کا میدانِ جنگ میں مقابلہ کروں گا۔ میں تو اپنی اور
اپنی بیٹی کی بے عزتی کا بدلہ اُس سے لینا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس
کوشش میں، میں کامیاب نہ ہوں گا بلکہ شاید میں اُس کے دربار اور تخت تک پہنچنے
سے پہلے ہی اُس کے پہریداروں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ مگر میں کوشش کرنا چاہتا
ہوں۔ اگر اس کوشش میں، میں مارا جاؤں تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔ اس سے میری بیٹی
جس کی عزت و آبرو راڈرک نے خاک میں ملائی ہے، اُس کے دل کو کم از کم یہ تسلی تو
ہو جائے گی کہ اُس کے غیرت مند باپ نے شاہِ وقت کے مرتبہ کا ذرا خیال نہ کیا اور
اپنی عزت پر قربان ہونے کے لئے اُس کے دربار میں زبردستی گھس گیا اور اس کوشش
میں مارا گیا ۔۔۔"

"بس بس جولین! ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔" دُرّانی نے اُسے سمجھایا۔ "اگر تم اپنی اور اپنی بیٹی بلکہ ملک اور اس کی تمام بہو بیٹیوں کی عزت اور حرمت کا شاہ راڈرک سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو تمہیں عقل سے کام لینا ہوگا۔ تمہیں اُس طاقت کو تلاش کرنا ہوگا جو شاہ اُندلس راڈرک کے مقابلے پر کھڑی ہو سکے اور اُس کی کلائی مروڑ سکے۔"

نواب جولین کی سمجھ میں دُرّانی کی بات بالکل نہ آئی اور وہ اُس کا منہ دیکھنے لگا۔
دُرّانی نے نواب جولین کو ہکا بکا دیکھا تو مسکرا کے کہا۔

"نواب! تم صرف ایک بہادر قلعہ دار ہو ـــــ مگر عقل سے بالکل خالی۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہے کہ شاہ راڈرک کی کلائی مروڑنے کے لئے اُس سے زیادہ مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہے۔ اور وہ مضبوط ہاتھ تمہیں خود تلاش کرنا ہوگا۔"

"میں تمہاری بات بالکل نہیں سمجھ سکا دُرّانی!" نواب جولین بڑی بیچارگی سے بولا۔ "میرے خیال میں راڈرک کو شکست دینے والی طاقت اس وقت پورے افریقہ اور یورپ میں کوئی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو میری اُس تک کیسے پہنچ ہو سکتی ہے؟"

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ تم بہت بھولے ہو ـــــ" دُرّانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے مسلمان قوم کا نام نہیں سنا، اور کیا تم مسلمانوں کی طاقت سے واقف نہیں؟"

دُرّانی کی بات پر نواب جولین ہنس دیا۔ "میں مسلمانوں کو خوب جانتا ہوں اور اُن کی طاقت سے بھی واقف ہوں۔ مگر وہ میرا ساتھ کیوں دینے لگے؟ مسلمان تو میرے دشمن ہیں۔ وہ میرے قلعہ پر دوبارہ حملہ آور ہوئے ہیں۔ اور اُنہوں نے دونوں بار منہ کی کھائی ہے۔ وہ میرا ساتھ کیوں دینے لگے؟"

"یہی تو تمہاری عقل کا پھیر ہے نواب بہادر ـــــ!" دُرّانی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "مسلمان بھی شاہ راڈرک کے اسی طرح دشمن ہیں جس طرح تم ہو۔ اگر تم مسلمانوں سے صلح کر لو تو وہ راڈرک کے خلاف تمہاری مدد کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اور پھر تم دیکھو گے کہ شاہ راڈرک کس طرح میدانِ جنگ میں چاروں شانے چت گرتا ہے۔"

نواب جولین کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہ آیا۔ وہ ذرا دیر دُرّانی کا منہ دیکھتا رہا، پھر اُس نے وضاحت طلب کی۔

"دُرّانی! بات تو تمہاری ٹھیک معلوم ہوتی ہے ـــــ" آخر اُس نے مطلب کی بات شروع کی۔ "یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ مسلمان بھی راڈرک کا خاتمہ چاہتے ہیں اور میں تو اُس کا دشمن ہوں ہی۔ مگر سوال یہ ہے کہ میں مسلمانوں کے پاس کس منہ سے جاؤں؟ جبکہ میں دو بدو ایک بار نہیں دو بار اُن کے ساتھ شمشیر زنی کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں نے دونوں بار اُن کے حملے ناکام بنا دیئے تھے اور وہ شکست کھا کر پسپا ہو گئے تھے۔ اب میں اپنے مطلب کے لئے اُن کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں؟ وہ تو شاید مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کریں ـــــ"

"یہ تو تمہارا خیال ہے۔" دُرّانی نے اُس کی بات کاٹی۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جب تم اُنہیں راڈرک کے خلاف مدد دینے پر آمادگی ظاہر کرو تو وہ تمہاری اس مدد کو اپنی خوش بختی تصور کریں اور تمہیں گلے سے لگائیں۔"

"میری سمجھ میں یہ بات آئی نہیں ہے۔" نواب جولین نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "اگر مسلمان ـــــ"

"اگر مگر کچھ نہیں ـــــ" دُرّانی نے نواب کی بات کاٹ دی۔ "ٹھیک ہے کہ مسلمانوں نے تم پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ مگر یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ اس واقعہ کو شاید دو سال سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں۔ تم اس سے انکار تو نہیں کر سکتے کہ دو سال میں حالات کچھ سے کچھ ہو سکتے ہیں۔ اگر تمہیں کچھ شک وشبہ ہے تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ہم مسلمانوں کے پاس اپنا سفیر بھیج کر اُن کا عندیہ معلوم کئے لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔" نواب جولین خوش ہو گیا۔ "اگر مسلمان ہمارا تعاون حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اُنہیں پوری پوری مدد دیں گے۔ اور اگر ہم اور مسلمان، شاہ اُندلس کے خلاف ایک جان دو قلب ہو کر ڈٹ جائیں تو راڈرک کو صرف شکست ہی نہیں بلکہ اُس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔"

یہ بات دُرّانی اور نواب جولین میں طے ہو گئی اور وہ مسلمانوں کے پاس سفیر بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُسی وقت دُرّانی نے بڑے زوردار الفاظ میں ایک پیشکش کی۔

دُرّانی نے کہا۔

"کسی سفیر کو مسلمانوں کے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ سفیر تو بہرصورت سفیر ہی ہوتا ہے۔ وہ پتہ نہیں کس انداز سے گفتگو کرے؟ پھر پتہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی بات پر قائل کر بھی سکے کہ نہیں۔ اس لئے میں اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔"

نواب جولین نے حیران نظروں سے دُرّانی کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس تم خود سفیر بن کے جاؤ گے؟"

"اور کیا ——" دُرّانی نے زور دے کر کہا۔ "اپنی بات تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ جب میں سفیر ہوں گا تو بات کھل کے کروں گا۔ اور اُمید ہے کہ میں مسلمانوں کو شاہ اُندلس پر حملہ کرنے کے لئے تیار کرلوں گا۔"

"یہ تو تمہارا بہت ہی اچھا خیال ہے۔" نواب جولین نے فوراً تائید کی۔ "دُرّانی! اس پیشکش کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ مگر اس سلسلے میں، میں خود بھی ایک رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور —— ضرور ——!" اُس نے تائید کی۔

نواب جولین نے ایک لمبی سانس لی، پھر کھڑے ہو کر مضبوط لہجے میں کہا۔

"میرے دوست! تم نے مسلمانوں کے دربار میں جانے کی پیشکش کر کے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ تم اب تک میرے دوست تھے۔ مگر یہ پیشکش کر کے تم میرے آقا بن گئے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے دربار میں کسی غیر مسلم کا جانا اپنی جان گنوانے کے برابر ہے۔ میرے دوست! تم نے میری پریشانی دیکھ کر اپنی جان کی بازی لگائی ہے۔ مگر میں اپنے دوست کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ راڈرک نے میری عزت کا دامن تار تار کیا ہے اس لئے یہ میرا فرض ہے کہ خود راڈرک کو تخت سے اُتاروں۔ خود اُس سے بدلہ لوں۔ خواہ اس کوشش میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

دُرّانی دوڑ کے نواب جولین سے لپٹ گیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نواب جولین! جس طرح فلورا تمہاری بچی ہے اسی طرح میری اولاد ہے، میری بچی ہے۔ اس لئے میں اُس کا بدلہ لینے کے لئے اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا —— خواہ ——"

"ٹھیک ہے —— ٹھیک ہے دُرّانی! تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ مگر قربانی دینے کے لئے پہلا فرض میرا ہے۔ مسلمانوں کے دربار میں پہلے میں جاؤں گا۔ اگر میں ناکام ہو جاؤں تو پھر تمہیں اختیار ہو گا کہ جس طرح چاہے اُسی طرح کوشش کرنا۔"

اس طرح تھوڑے بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پا گیا کہ مسلمانوں کے دربار میں خود نواب جولین جائیں گے۔ کیونکہ وہ مظلوم بچی کے باپ ہیں اور اُن کی بات کا بہرحال مسلمانوں پر زیادہ اثر ہونے کا امکان ہے۔ یہ مسئلہ طے ہو جانے کے بعد ایک دوسرا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مسئلہ بھی بہت اہم تھا۔ یہ بات تو طے ہو گئی کہ مسلمانوں کے دربار میں نواب جولین خود جائیں گے تو لازمی اس کا چرچا ہر طرف ہو گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خبر شاہ راڈرک کے کانوں تک بھی پہنچے۔ اس صورت میں غریب اور پریشان نواب زادی فلورا پر کیا گزرے گی؟ شاہ راڈرک تو اُسے پکڑوا کے سولی پر چڑھا دے گا۔

جب احباب کی محفل میں یہ بات اُٹھائی گئی تو نواب جولین کا مسلم دربار میں جانے کا فیصلہ روک دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ پہلے نواب زادی فلورا فلورنڈا کو اُندلس سے نکال کے کسی اور جگہ پہنچایا جائے تاکہ وہ شاہ اُندلس کے عذاب سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اس کا یہ حل نکالا گیا کہ نواب جولین کو شاہی دربار میں بھیجا جائے اور وہ شاہ راڈرک سے کوئی بہانہ بنا کر نواب زادی فلورا کو وہاں سے گھر لے آئیں۔ پھر اُسے اور اپنے پورے خاندان کو نواب کسی محفوظ جگہ منتقل کرنے کے بعد مسلمانوں کے تعاون کے لئے مسلمانوں کے دربار میں جائیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام فلورا کو شاہی مہمان خانے سے کسی بہانے سے واپس لانا تھا اور یہ کام سوائے نواب جولین کے اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ نواب جولین دوسرے ہی دن صبح ہی صبح شاہی دربار روانہ ہو گیا کہ کسی بہانے سے فلورا کو ظالم راڈرک کے خونی پنجوں سے نکال لائے۔

کاؤنٹ (نواب) جولین منزلیں مارتا تیسرے دن شاہی دربار پہنچ گیا۔ مگر اُس

نے دربار میں جانے والوں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ چلتے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ دربار کے صدر دروازے کی طرف ایک چھوٹا سا دفتر کھل گیا تھا جہاں دربار میں آنے والوں کے نام اور پتے درج کئے جاتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آنے والوں کا پورا کھاتہ شاہ راڈرک کے ملاحظہ کے لئے دربار کے اندر بھیجا جاتا تھا۔ پھر جب تک شاہ آنے والوں کو اجازت نہ دیتا، وہ اندر داخل نہ ہو سکتا تھا۔

پس دستور کے مطابق نواب جولین نے اپنا نام اور پتہ لکھ کر اپنا کھاتہ اندر بھجوایا۔ پتہ نہیں وہاں کیا کارروائی ہوئی؟ سوائے اس کے کہ نواب جولین کو نصف گھنٹے دفتر میں انتظار کرنا پڑا۔ پھر اُسے راڈرک کی سلامی کی اجازت ملی۔ نواب نے سمجھ لیا تھا اور اُسے سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ شاہ راڈرک کے سامنے کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالے جو اُسے مشکوک کر دے اور فلورا ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھ سے جاتی رہے۔ چنانچہ وہ پھونک پھونک کے قدم اُٹھاتا شاہ کے حضور پہنچا۔

نواب جولین میں قلعہ سبتہ کا علاقہ دار ہونے کے علاوہ ایک صفت یہ بھی تھی کہ وہ جب دربار شاہی میں حاضری کے لئے آتا تو اپنے ساتھ بازوں (پرندوں) کے دو تین جوڑے ضرور لاتا۔ شاہ کو بازوں کا بہت شوق تھا اور سبتہ کے علاقے میں نہایت اعلیٰ قسم کے باز پائے جاتے تھے۔ چنانچہ جولین ہر ملاقات میں شاہ راڈرک کو بازوں کے دو تین جوڑے ضرور پیش کرتا تھا۔ آج بھی جب اُس کا شاہ راڈرک سے سامنا ہوا تو شاہ نے اُس کا سلام قبول کرتے ہی سوال کیا۔

"ہمارے بازوں کے جوڑے کہاں ہیں؟"

نواب جولین نے بازوں کا تھیلا اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ شاہ کے سوال کرتے ہی جولین نے وہ تھیلا فوراً شاہ کے سامنے پیش کر دیا اور ادب سے بولا۔

"بھلا غلام اپنے آقا کی فرمائش کبھی بھول سکتا ہے؟"

اور شاہ راڈرک کے دل میں اُٹھتے ہوئے شکوک و شبہات ایک دم ختم ہو گئے۔ نواب جولین بازوں کا تھیلا پیش کرتے وقت اس انداز سے مسکرایا تھا کہ شاہ راڈرک کو اس پر کوئی شبہ نہ ہوا اور وہ بھی اُس سے عزت اور احترام سے پیش آنے لگا۔ شاہ نے بازوں کا تھیلا وصول کرنے کے بعد رسماً نواب سے پوچھا۔

"گھر میں سب طرح کی خیریت ہے ـــــ کسی قسم کی پریشانی تو نہیں تمہیں؟"

"بالکل نہیں عالیجاہ ـــــ!" نواب جولین نے دل میں اُٹھتے ہوئے جذبات کا گلا گھونٹتے ہوئے مسکرا کے جواب دیا۔ "بہت دن ہو گئے تھے حضور کی زیارت کو۔ پھر یہ بازوں کے دو تین جوڑے ہاتھ لگ گئے تھے۔ میں نے سوچا چلو شاہ معظم کا دیدار بھی ہو جائے گا اور آپ کے شوق کے خوبصورت پرندے بھی آپ کی نذر کر دوں گا۔"

"تمہاری یہی خدمت گزاری تو ہمارے دل کو بھاتی ہے نواب!" راڈرک نے مسرت کے لہجے میں کہا۔ "اگر تمہاری طرح ہمارے تمام نوابین اور معززین ہمارے خدمت گزار ہو جائیں تو ہماری حکومت اور جاہ و جلال کو چار چاند لگ جائیں۔"

"کیوں نہیں حضور عالی ـــــ!" نواب جولین نے کمال خوشامدانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جس ملک کا بادشاہ اپنی رعیت کا خیال رکھتا ہے اُس کی رعیت بھی اُس پر جان دینے کو حاضر رہتی ہے۔"

"کیوں نہیں ـــــ کیوں نہیں۔" بادشاہ نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"تمہارے بال بچے تو اچھے ہیں؟ اور وہ تمہاری جیون ساتھی یعنی بیگم کا کیا حال ہے؟"

بیگم کے ذکر پر نواب جولین نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا عرض کروں حضور والا! آپ نے میری جیون ساتھی کا ذکر کیا تو کلیجہ اک دم منہ کو آ گیا۔ اُس غریب کا تو بس اب خدا ہی حافظ ہے۔ خدا ہی رحم کرے تو شاید بچ سکے۔"

"کیا ہوا تمہاری بیوی کو ـــــ؟" شاہ نے اظہارِ ہمدردی کے لئے کہا۔ "وہاں علاج معالجے کی پریشانی تھی تو اُسے اپنے ساتھ یہاں لے آتے۔ ہمارے ڈاکٹر بہت اعلیٰ قسم کے ہیں۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اُسے یہاں لے ـــــ"

"کیسے لے آؤں حضور ـــــ!" نواب جولین نے ایک آہ بھری۔ "وہ بے چاری تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہے۔ کوئی دم ہے کہ جاتا ہے۔ اُس کا تو بس اب خدا ہی حافظ ہے۔"

شاہ راڈرک نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نواب! ہمیں بہت افسوس ہے۔ کاش ہم تمہاری بیوی کے لئے کچھ کر سکتے۔"

"حضور تو بس اُس کے لئے دُعا کریں کہ خدا جلد اُس کی مشکل آسان کرے۔"

نواب نے اس دوران دو تین ٹھنڈی سانسیں بھریں۔ "میرے تمام بچے، ماں کے پاس آ گئے ہیں اور اُس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں ــــــ"

نواب جولین بات کرتے کرتے ایک دم رُک گیا اور شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "عالیجاہ ــــــ! اس سلسلے میں ایک بات عرض کرنی ہے اگر بارِ خاطر نہ ہو؟"

"ضرور کہو! کیا بات ہے؟ ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" شاہ نے ہمدردی سے پوچھا۔ "جس چیز کی بھی ضرورت ہو اُس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔"

"حضور! دراصل بیمار نے کئی بار فلورا کو یاد کیا ہے۔" نواب جولین اب مطلب کی بات زبان پر لایا۔ "میں نے فلورا کو ماں کی بیماری کی خبر اب تک نہیں بھیجی۔ وہ بیچاری کیا کرتی سوائے اس کے کہ وہ بھی ہماری طرح رات دن روتی پیٹتی رہتی۔ اب میں ــــــ اگر حضور مناسب سمجھیں تو ــــــ فلورا کو دو چار دن کے لئے ماں کے پاس لے جاؤں۔ پتہ نہیں کل کو کیا ہو؟ ایک بار وہ ماں کی شکل تو دیکھ لے گی اور مرنے والی کو بھی تسلی ہو جائے گی۔"

شاہ راڈرک، فلورا کے نام پر ایک لمحے کے لئے چونکا۔ مگر نواب نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور فوراً بات بنائی۔

"میں جانتا ہوں اور مجھے پوری طرح احساس ہے کہ حضور والا ہم خدمت گاروں اور حکومت کے بہی خواہوں کی بچیوں کو اپنی اولاد کی طرح پرورش اور نگہداشت کرتے ہیں۔ مگر ماں تو پھر ماں ہی ہوتی ہے۔ اگر مرنے سے پہلے اُس کی یہ خواہش پوری ہو جائے تو شاہ کی بہت کرم نوازی ہو گی۔ اگر فلورا کی ماں کی ذرا بھی طبیعت بحال ہوتی تو میں اُسے فلورا سے ملانے ساتھ ہی لے آتا۔ مگر کیا کروں کہ وہ تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہے۔"

شاہ راڈرک کو ممکن ہے کہ پہلے کچھ شک گزرا ہو۔ مگر جس طرح نواب جولین نے فلورا کی ماں کی بیماری کا نقشہ جمایا، اُس نے بادشاہ کے تمام شکوک و شبہات یکسر غلط کر دیئے اور آخر راڈرک کو کہنا پڑا۔

"اولاد کی محبت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ اور ماں تو پھر ماں ہی ہوتی ہے۔ بیماری

کی حالت میں یوں بھی ماں اپنی اولاد کو ہمہ وقت اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہے۔ تم چاہو تو فلورا کو دو چار دن کے لئے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ میری ملکہ جو اُس ادارے کی سرپرست ہیں، میں اُنہیں اطلاع بھجواتا ہوں۔ وہ فلورا کو تمہارے ساتھ کر دیں گی۔"

"شاہ عالی مقام کا بہت بہت شکریہ۔" نواب جولین نے انتہائی خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر ماں کو اپنی بچی کو دیکھ کر مرنے سے پہلے کچھ سکون ضرور مل جائے گا۔"

نواب جولین، شاہی دربار کے دروازے پر آ کر رُک گیا جیسے اُسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ پھر وہ دربار میں واپس گیا اور اُس نے شاہ راڈرک سے بڑی خوش دلی کے ساتھ کہا۔

"میں اس مہربانی پر شاہ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی بار جب حضور کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو حضور کے لئے ایسے باز لاؤں گا جو حضور نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔"

نواب نے اگرچہ یہ بات بڑی خوشدلی سے کہی تھی۔ مگر اس میں ایک بڑا گہرا طنز تھا جسے شاہ راڈرک اُس وقت نہ سمجھ سکا۔

یہ بات یاد رہے کہ نواب جولین جس قلعہ سبتہ کا قلعہ دار تھا وہ قلعہ یورپ میں داخلے کا پہلا دروازہ کہا جاتا تھا۔ نواب جولین پہلے بازنطینی حکومت کے ماتحت تھا مگر اُس سلطنت کے زوال پر نواب جولین نے اپنا رشتہ اسپین کی حکومت سے جوڑ لیا تھا اور اُس کا باجگذار بن گیا تھا۔ یہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس قلعہ کی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کے پیہم دو حملے اُس کی فصیلوں کو شکستہ نہ کر سکے اور اُس کی مضبوط دیواروں کو ہلا نہ سکے۔ وہاں آگ کے گولے ناکارہ ہو جاتے تھے اور منجنیقیں اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں۔ بیرونی حملوں کے لئے قلعہ سبتہ، آہنی دیوار اور سد سکندری کا درجہ رکھتا تھا۔

معصوم اور بے گناہ شہزادی فلورا فلورنڈا کے باپ نواب جولین کے دل میں شاہ راڈرک کے خلاف نفرت اور حقارت کی جو آگ بھڑک اُٹھتی تھی اُس کو صرف طاقت سے بجھایا اور ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ طاقت نواب جولین میں نہ تھی۔ اس لئے اُس

نے مسلمانوں سے تعاون کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ کوششیں کیں، مگر جب ہر طرف سے تھک گیا تو اُس نے قیرواں کا رُخ کیا۔ براعظم افریقہ میں قیرواں اُس وقت مسلمانوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

وہ خلیفۃ الوقت ولید بن عبدالملک کا زمانہ تھا اور اسلامی لشکر مسلم سردار موسیٰ بن نصیر کی سرکردگی میں افریقہ میں فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ موسیٰ بن نصیر کا اُس وقت قیام قیرواں میں تھا۔ چنانچہ جولین نے اپنے دو سرداروں کے ساتھ قیرواں کا رُخ کیا۔ چونکہ نواب جولین کو مسلم سردار سے ملاقات کرنی تھی اس لئے وہ گھوڑے کی باگیں اُٹھائے، راستے میں پڑنے والی تمام آبادیوں سے منہ موڑے سیدھا قیرواں پہنچا اور اُس نے مسلم دربار میں پہنچ کے دستک دی۔

نواب کو جب مسلم دربار کے پہریداروں نے روکا تو اُس نے اُن سے اپنا اس طرح تعارف کرایا۔

"مسلم سردار موسیٰ بن نصیر کو اطلاع دی جائے کہ کاؤنٹ جولین اُن سے ملاقات کے لئے حاضر ہے۔"

درباری نواب جولین کو نہ تو پہچانتے تھے اور نہ نواب کے ساتھ کوئی فوجی دستہ تھا اس لئے اُنہوں نے اُس پر زیادہ توجہ نہ دی اور دریافت کیا۔

"ہمارے سردار سے ملاقات کے لئے آنے والے کو کیا ہمارے سردار نے طلب کیا ہے؟ اگر طلب کیا ہے تو اُس کے پاس اس کا کوئی تحریری ثبوت ہے؟"

"میرے پاس صرف یہی ثبوت ہے کہ میں نواب جولین ہوں اور مسلم سردار سے فوری طور پر ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

درباری افسر چڑ کے بولا۔

"ہمارے سردار ہر ایرے غیرے سے ملاقات نہیں کرتے۔ تم اپنا نام اور شناخت لکھ کے دو۔ ہم سردار کے سامنے وہ پرچہ پیش کریں گے۔ پھر جب وہ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کریں گے تو تمہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔ اُن کی اجازت کے بغیر تم اُن سے نہیں مل سکتے۔"

نواب جولین کو استقبالیہ افسر کا یہ خشک رویہ بہت ناگوار گزرا مگر اُس نے مجبوراً

ایک پرچہ پر اپنا نام اور شخصیت لکھ کر پرچہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ استقبالیہ افسر نے پرچہ سنبھالا اور اُسے لئے ہوئے اندر چلا گیا۔ اندر مسلم سردار موسیٰ بن نصیر اپنے چند ساتھیوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔

استقبالیہ افسر نے پرچہ مسلم سردار موسیٰ بن نصیر کے سامنے رکھ دیا۔ موسیٰ نے اپنی بات ختم کر کے سامنے رکھے ہوئے پرچہ کو اُٹھا کر پڑھا جس پر واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

"کاؤنٹ جولین۔ قلعہ دار سبتہ۔"

موسیٰ بن نصیر نے پرچہ پڑھا اور فوراً اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

"کون ـــــ کاؤنٹ جولین ـــــ کہاں ہیں وہ۔ یہ پرچہ کس نے لکھا ہے؟"

اُس کے ایک ساتھی نے بتایا۔ "یہ پرچہ استقبالیہ افسر ابھی رکھ کے گیا ہے۔"

موسیٰ بن نصیر پرچہ لئے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف چلا۔ استقبالیہ افسر، موسیٰ بن نصیر کو آتے دیکھ کر بھاگ کے اُس کی طرف آیا۔

موسیٰ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ پرچہ کون لایا ہے؟"

جولین اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ سامنے کھڑا تھا۔ نواب جولین دائیں جانب تھا۔ موسیٰ کی آواز پر وہ اپنی جگہ سے دو قدم آگے بڑھ کے بولا۔

"یہ پرچہ کوئی نہیں لایا، میں نے ہی لکھا ہے اور میں ہی آپ کا خادم سبتہ کا قلعہ دار نواب جولین ہوں۔"

موسیٰ بن نصیر نے سر کو جھٹکا دیا۔ جلدی جلدی کئی بار پلکیں جھپکائیں، پھر سنبھل کے بولا۔ "میرے کانوں کو یقین نہیں آتا کہ آپ ہی نواب جولین ہیں۔"

نواب جولین نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

موسیٰ بن نصیر نے بڑی گرمجوشی سے جولین سے مصافحہ کیا اور اُسے اپنی طرف کھینچ کے سینے سے لگا لیا۔ نواب جولین بھی اُس سے لپٹ گیا۔

پھر جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو موسیٰ بن نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ میں کاؤنٹ جولین سے بغلگیر ہوا ہوں۔
احساس ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ قلعہ سبتہ واقعی نا قابلِ تسخیر ہے۔ ہم
دو مرتبہ قلعہ پر چڑھائی کی مگر قلعہ کے مضبوط دفاع نے ہماری دونوں کوششوں کو
بنا دیا۔"

پھر موسیٰ بن نصیر، نواب جولین کا ہاتھ پکڑے ہوئے اُسے اندر لے گیا۔
موسیٰ کے کئی نائبین بیٹھے ہوئے تھے۔ موسیٰ نے نواب کا سب سے تعارف کرایا۔
لوگ بھی اپنے دشمن نواب جولین کو اپنے درمیان دیکھ کر حیران بھی تھے اور خوش بھی۔
تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد نواب جولین اصل
پر آیا۔ اُس نے موسیٰ سے کہا۔ "کیا تھوڑی دیر کے لئے ہم تنہا نہیں ہو سکتے؟ مجھے
سے کچھ خاص باتیں کرنا ہیں۔"

"ضرور ـــــ ضرور ـــــ کیوں نہیں ـــــ؟"

اس کے ساتھ ہی موسیٰ نے وہاں موجود تمام لوگوں کو رخصت کر دیا اور پہریدار
کو حکم دیا کہ ہم ضروری گفتگو کر رہے ہیں۔ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔
اب وہاں تنہائی ہی تنہائی تھی۔ سوائے نواب جولین اور موسیٰ بن نصیر کے کوئی
وہاں موجود نہ تھا۔ پھر نواب جولین نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لے کر شاہ اُندلس
کی اُس کمینی اور ذلیل حرکت کا ذکر شروع کیا جس نے اُس کی عزت پورے
میں خاک میں ملا دی تھی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گیا تھا۔ اور اب وہ
قدر مجبور ہو گیا تھا کہ اپنے کمینے دشمن سے بدلہ لینے کے لئے وہ مسلمانوں سے
کرے۔ کیونکہ اس دور میں دو ہی برابر کی طاقتیں تھیں۔ ایک سلطنت ہسپانیہ (اُندلس)
اور دوسری اُبھرتی اور ترقی کے راستے پر گامزن مسلم اسٹیٹ یعنی اسلامی حکومت۔
نواب جولین اس گفتگو کے دوران شروع وقت سے یعنی آغاز سے اختتام تک
رہا۔ ایک لمحے کے لئے بھی اُس کے آنسو نہ تھمے۔ نواب جولین کے دل پر جو گزری
اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر گفتگو کے بعد جب جولین نے مسلمانوں
سے تعاون کی درخواست کی تو موسیٰ بن نصیر نے اُسے سینے سے لگا کر اعلان کیا۔
"نواب! تم ہماری طرح اہلِ کتاب ہو۔ اگر تم اہلِ کتاب نہ بھی ہوتے، تو بھی

پر جو قیامت گزری، اس کا انتقام لینے کے لئے اسلامی لشکر ضرور حرکت میں آتا۔
ہمارے مذہب اسلام کا یہ اعلان ہے کہ برائی اور بدی کو اس طرح مٹاؤ کہ وہ دوبارہ
سر نہ اُٹھا سکے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسلامی لشکر تمہارا پورا پورا ساتھ دے گا
اور شاہ اُندلس سے اُس کے اس فعل کا پورا پورا انتقام لیا جائے گا۔"

نواب جولین سے اسلامی لشکر کا ہر سپاہی واقف تھا، اس لئے کہ موسیٰ بن نصیر کی
فوجیں نواب جولین کے قلعہ سبتہ پر دو بار حملہ کر کے اور شکست کھا کے واپس لوٹی
تھیں اور اب وہی نواب جولین ہاتھ باندھے اور سر جھکائے مسلمانوں سے تعاون
حاصل کرنے کے لئے خود اسلامی لشکر میں آیا تھا۔

نواب جولین کا دل بہت جلا ہوا تھا اس لئے اُس نے پہلے اسپین کے لہلہاتے
ہوئے کھیتوں کا ذکر کیا، بھرے پُرے سبزہ زاروں، شاداب اور حسین وادیوں، زر و
جواہر اور دولت و حشمت کا کچھ ایسے انداز میں تذکرہ کیا کہ مسلم سردار موسیٰ بن نصیر کے
منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر وہ با تدبیر اور باشعور تھا۔ باہم رنجش و رقابت اور مذہبی عناد
اکثر فتنے اُٹھاتا ہے۔ لیکن غرباء اور مساکین پر ظلم و تشدد کی داستانیں اس بوڑھے مگر
دلیر سپاہی کے عزم کو جوانی بخشنے کے لئے کافی تھیں۔

مسلم سردار موسیٰ بن نصیر نے اس معاملے پر ہر پہلو پر غور کرنا ہی صرف مناسب نہ
خیال کیا بلکہ اُس نے فوری طور پر ایک سمجھدار رقاصہ کو خلیفۃ الوقت یعنی خلیفہ ولید بن
عبدالملک کے دربار میں بھیجا اور خلیفہ سے اس معاملہ میں مشورہ طلب کیا۔ چنانچہ
نواب جولین کی درخواست پر کسی فوری عمل کا وعدہ نہیں کیا گیا بلکہ اُس سے تھوڑی
مدت مانگی گئی کہ سوچ بچار کے بعد ہاں یا نہیں کی جائے گی۔

نواب جولین کی ہر بات کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود اُس کی دیانتداری کا امتحان
لازمی تھا۔ دوسری طرف دربارِ خلافت سے منظوری مل جانے کے بعد بھی موسیٰ کو محتاط
اور ہوشیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ پس اُسے فوری طور پر کسی بڑی مہم کے لئے منع
کیا گیا۔ البتہ اُندلس (ہسپانیہ، اسپین) پر آزمائشی حملہ کی اجازت ضرور دی گئی۔ نواب
جولین سے کہا گیا کہ پہلے وہ خود ہی شاہ راڈرک کے فوجی دستوں پر حملہ آور ہو تا کہ
اُس کی ایمانداری کا یقین کیا جا سکے۔

نواب جولین چونکہ اپنے مقصد میں سچا اور کھرا تھا، چنانچہ اُس نے موسیٰ بن نص
(جو دراصل خلیفہ کا منشاء تھا) کا مطالبہ یا دوستانہ مشورہ تسلیم کیا اور تھوڑی سی اپنی فو
کے ساتھ مدینہ شدونہ کے ساحلی علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس یلغار م
اُس نے کلیساؤں کو نذرِ آتش کیا اور گرجاؤں کو زیرِ خاک کیا۔ اس طرح اُس نے اپ
ہی آقا سے دشمنی مول لی۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا تو شاہ اُندلس سے دکھاوے کے
لئے ایک معاہدہ بھی ہوگیا۔ اس معاہدہ میں سابق شہنشاہ اسپین وٹیزا کے بھا
''اوپاس'' کو بھی شامل کرلیا گیا اور اُس سے بھی ایک معاہدہ کرلیا گیا۔

پھر مزید احتیاط کے لئے ایک معمولی فوجی دستہ جس میں چار سو سپاہی اور ایک
گھڑ سوار شامل تھے، طریف نامی ایک جوان جنرل کی سرگردگی میں روانہ کیا گیا۔
دستہ جولائی 710ء مطابق 92ھ کو جزیرۃ الخضر کے مقام پر اُترا۔ آج بھی وہا
''طریف'' نامی مقام اُس جنرل کی یاد دلاتا ہے۔

معمولی جھڑپوں میں مسلمان اور نواب جولین کی مددگار فوجیں کامیاب و کامران
رہیں۔ یہ کوئی بڑی جنگ نہ تھی مگر اس سے عیسائیوں کی کمزوریوں، فوجیوں کی بزدل
اور عسکری نظام کی خامیوں کا پتہ چل گیا اور اب ایک بڑی مہم کی تیاریاں اعلیٰ پیمانے
شروع ہوئیں۔ اس مہم کی کمان ایک جوان تجربہ کار سپہ سالار کے سپرد کی گئی جس
تعلق بربر قوم سے تھا۔ اُس جوان کا کھلتا ہوا رنگ اور سرخ بال اس بات کی غمازی
رہے تھے کہ وہ قوم ڈنڈال کی اولاد میں سے ہے۔ اس جوان کا نام طارق بن زیا
تھا...... طارق دراصل موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام تھے۔



اسپین (اُندلس) براعظم یورپ کا ایک انتہائی وسیع و عریض ملک ہے جسے ہسپانیہ
کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کا مغربی حصہ ایک جزیرہ نما کی شکل کا ہے۔ اُس
کے ایک طرف پہاڑی سلسلہ ہے اور باقی تین اطراف میں سمندر موجیں مارتا ہے۔
آج کا اسپین، پرتگال سے الگ ہے۔ مگر جس وقت مسلمانوں کے قدم اُس سبزہ زار
ملک میں پہنچے تو ملک پرتگال بھی اُس میں شامل تھا۔

کبھی یونانیوں نے اسے آئیریا کے نام سے پکارا تو کبھی رومانیوں نے اسے
ہسپانیہ کا نام دیا۔ پھر جب مسلمان وہاں پہنچے تو انہوں نے اسے اُندلس کے نام سے
موسوم کیا۔ مگر یہ کہنا درست نہیں کہ اُندلس حضرت نوح علیہ السلام کے شجرۂ نسب سے
اُندلس بن طوبال بن یافت کے نام سے مشتق ہے۔ کیونکہ یہ محض ایک قیاس ہی ہے۔
تاریخ دان اسے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا لفظ بتاتے ہیں۔ مگر جو قول زیادہ
قرین قیاس ہے وہ یہ کہ جرمانی قوم نے اس جزیرہ نما کو دندال یا دنداس کا نام دیا تھا
جو بگڑ کر عربی میں فندس یا اُندلس بنا اور اب یہ اُندلس ہے۔ جرمانیوں کے بعد اسپین کے
جنوبی حصہ پر بائی ٹیکا قابض ہوئے اور اُنہوں نے اسے وانلڈیشیہ کے نام سے پکارا۔

بہرحال عربوں نے سب سے پہلے جنوبی حصہ پر حملہ کیا۔ چونکہ وہ وانلڈیشیہ ہی
کہلاتا تھا اس لئے اُسے اُندلس کہنے لگے۔ پھر جیسے جیسے فتوحات ہوتی گئیں تو کل کا
کل علاقہ اُندلس کہلانے لگا۔ پھر جو علاقے بعد میں عیسائیوں نے حاصل کئے اُنہیں
مسلمان بھی اُن کے ہی ناموں سے پکارنے لگے۔

یورپ کا یہ حسین ملک قدرتی نعمتوں اور جملہ رعنائیوں سے آراستہ ہے۔ اس میں
زمین کو زرخیز کرنے والی ندیاں بہتی ہیں، معدنیات سے پُر پہاڑوں کے سلسلے بھی
ہیں۔ حسین مگر تیز رو آبشاریں اور ہرے بھرے مرغزار ہیں۔ عربوں نے اگرچہ اسے

جزیرہ کہا مگر اپنی شکل میں یہ جزیرہ نما ہے کیونکہ اس کے تین اطراف میں سمندر
اور ایک طرف فرانس سے جدا کرنے والے پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔

اندلس کی زرخیزی، شادابی اور ہریالی بہت کچھ دریاؤں کی رہین منت ہے۔
اس چھوٹے سے ملک میں بارہ دریا ہیں جنہیں ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

1- دریائے وادی النساء۔ یہ ایک مختصر دریا ہے جو طریف اور جزیرہ خضرا کے درمیان بہتا ہے۔

2- وادی آرد۔ یہ دریا، جبل رند کے منہ سے نکلتا ہے اور بحر روم کے دا... میں گم ہو جاتا ہے۔

3- وادی القرشی۔ یہ دریا بھی جبل رنْد سے نکلتا اور بحر روم میں گرتا ہے۔ اس پر بہت سے مشہور شہر آباد ہیں جن میں اتقرہ، الورا، وادی المدینہ کی شاخ بھی اُس میں شامل ہو جاتی ہے۔

4- وادی شقورہ۔ یہ بڑا دریا ہے۔ اس کو برابیض بھی کہتے ہیں۔

5- وادی شقر۔ 6- وادی ابیض۔ 7- وادی ابرد۔ 8- برباطہ۔ 9- واد... لکہ یا بکہ۔ 10 وادی الکبیر۔ اس دریا کو نہر اعظم بھی کہتے ہیں۔ 11- واد... آنہ۔ اس کا پرانا نام اناس ہے۔ عرب اس کو آنہ ہی کہتے ہیں۔ اس طر...

یہ ملک گیارہ علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہ علاقے کئی بڑے شہر رکھتے ہیں مثلاً وادی الحجارہ، شہرینہ اور میڈرڈ۔ یہ اسپین کا دارالخلافہ ہے۔

اسپین یا اندلس اپنے قدرتی عطیات اور حسن و دلفریبی کی وجہ سے مختلف اقوام کی نگاہوں کا مرکز رہا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے قدم یہاں پہنچے۔ کہنے کو تو یہاں آئیریا، کلٹ، فنیقی، یونانی، رومانی، شیوانی، قوطی (گوتو) سبھی قوموں نے اپنا رنگ جمایا۔ فینیقیوں نے حضرت محمد ﷺ کی پیدائش سے بہت قبل شام سے آکر اسپین سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اس طرح 52ھ یا 671ء میں مسلمانوں نے اسپین میں نقل و حرکت شروع کی۔

ابوطریف بن مالک کی کنیت طبق تھی۔ پس طبق کی کامیابی ایک زبردست مہم کی پیش خیمہ بن گئی۔ اس سلسلے میں نواب جولین نے اپنی وفاداری کا مزید یہ ثبوت دیا کہ

اُس نے اپنی بیٹی فلورا اور اُس کی بہن میری دونوں ہی کو موسیٰ بن نصیر کے پاس بطور یرغمال پہنچا دیا۔ اب اُندلس پر حملے کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے اور دیر کرنا کسی بطور مناسب نہ تھا۔ اسپین (اُندلس) کی کمزوری کا حال پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔

پس طارق بن زیاد کا انتخاب بطور سپہ سالار عمل میں آیا۔ چنانچہ چھاؤنی میں ہتھیار بجنے لگے۔ تلواروں کی دھاریں تیز ہونے لگیں۔ اسلحے جسموں پر سجنے لگے۔ ادھر تو اسلامی علاقے میں یہ تیاریاں ہو رہی تھیں دوسری طرف اسپین (اندلس) میں ایک نیا گل کھل رہا تھا۔ شاہ راڈرک کی ملکہ مودونہ جو لڑکیوں کے ہوسٹل کی وارڈن تھی، اُس نے شاہی محل اور ہوسٹل کے درمیان پکی دیوار کے اُس دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا جس سے لڑکیاں شاہی محل میں داخل ہو کر اپنی زندگی تباہ کر لیتی تھیں۔

مگر وہ جو کہا ہے کسی نے کہ چور، چوری سے جائے، نا کہ ہیرا پھیری سے۔ یہی حال ملک اندلس کے شاہ راڈرک کا تھا۔ اُس نے ملک کے حکومتی کاروبار کو تو یکسر ختم کر دیا تھا اور صرف عیاشی اور بدمعاشی کا بازار گرم تھا۔ اُس کے تمام عمال ایک ادنیٰ سے لے کر بڑے سے بڑے جنرل تک شاہ کے لئے کام کرتے تھے اور دُور اور نزدیک کے شہروں اور دیہاتوں سے خوبصورت کنواریوں کو خرید کر یا طاقت کے زور پر پکڑ لاتے اور شاہ کی عیاشی کا سامان کرتے تھے۔

شاہ اُندلس، راڈرک (لرزیق) کی نیک دل اور شریف طبیعت ملکہ مودونہ ہی اس پورے شاہی محل میں صرف ایک نیک ہستی تھی جو عیاش اور اوباش شوہر یعنی راڈرک کی عیاشی پر پہرے بٹھانے کی کوشش کرتی۔ اُس نے لڑکیوں کے ہوسٹل اور شاہی محل کے درمیان واقع دیوار کو نہ صرف ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا بلکہ اُس نے اعلان کرا دیا تھا کہ بعض نا معلوم مشکلات کے پیش نظر بچیوں اور لڑکیوں کا ہوسٹل تا حکم ثانی بند کر دیا گیا ہے۔ بلکہ کسی بھی نواب یا اور عہدیدار کی بیٹی بہن کو ملکہ سے بغیر تحریری اجازت کے ملاقات ختم کر دی گئی۔

مگر شاہ راڈرک کے منہ کو بھی عیاشی کا خون لگ گیا تھا۔ اُسے ملکہ کی ان پابندیوں کا علم ہوا تو اُس نے ایسے تنخواہ دار ملازم رکھنا شروع کر دیئے جو شہروں اور دیہاتوں میں دن رات چکر لگاتے اور اُنہیں جو خوبصورت لڑکی نظر آتی اُسے محل شاہی کے عیش

و آرام کا لالچ دے کر یا پھر زبردستی اُٹھا لاتے اور شاہ راڈرک کی عیاشی کا لقمہ بنا
تے۔ اس طرح ملک کی درجنوں بچیاں ہوس کے اس بھیڑیے کی بھینٹ چڑھ گئیں
شاہ راڈرک کی ان عیاشیوں کا چرچا گھر گھر تھا۔ اور اُمراء اور وزراء نے
بیگمات اور بچیوں کے ساتھ شاہی تقریبات میں جانا بند کر دیا تھا۔ مگر بھیڑیے
عیاشی کے لئے روزانہ کسی نہ کسی لڑکی کی خواہش ہوتی تھی اور اُس کے کارندے
نہ کہیں سے کسی لڑکی کو رضا مندی سے یا زبردستی پکڑ لاتے تھے جس کی نہ داد تھی اور
فریاد۔

اور پھر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اُس دن ہلکی ہلکی بارش دن بھر ہوتی رہی تھی۔ اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی مگر
ننھی بوندیں اب بھی پڑ رہی تھیں۔ موسم اچھا خاصا خوشگوار تھا۔ لوگ گھروں سے
کر باہر کھیت کھلیانوں میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں پانچ چھ لڑکیاں
ایک ہرن کا پیچھا کرتی اُس مقام پر پہنچیں جہاں دو چار دیہاتی موسم کا لطف اُٹھا رہے
تھے۔ یہ لڑکیاں امیر زادیاں معلوم ہوتی تھیں کیونکہ اُن کے گھوڑوں کے ساز
چاندی کے بنے تھے اور دُھوپ میں چمک رہے تھے۔

لڑکیاں ہرن کا پیچھا کرتی یہاں پہنچیں تو اُن کا شکار اُن سے بہت آگے نکل چکا
اور نظروں سے تقریباً اوجھل ہو گیا تھا۔ لڑکیوں نے وہاں اپنے گھوڑے روکے اور
کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ اُنہوں نے لڑکیوں کو اُس طرف اشارہ کیا جدھر
ہرن بھاگ کر گیا تھا۔ یہ اشارہ پا کر لڑکیوں نے گھوڑوں کی باگیں اُدھر گھمائی تھیں
ایک طرف سے پچیس تیس گھوڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔

لڑکیاں اُدھر جانے کی بجائے سواروں کا انتظار کرنے لگیں۔ شاید وہ اُن سے
لینا چاہتی تھیں۔ آنے والے تیز بھاگتے ہوئے اُن کے قریب پہنچے اور گھوڑے روکنے
کی بجائے اُنہوں نے لڑکیوں کے گرد اس طرح گھیرا ڈال دیا جیسے اُنہوں نے
ڈاکو کو گھیر لیا ہو۔ لڑکیاں گھبرا کے ان گھیرنے والوں کو حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

ایک لڑکی نے چیخ کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ہمارا تعلق شاہی دربار سے ہے۔"

"ہمارا تعلق بھی شاہی دربار سے ہے۔ اور ہم سب شاہ راڈرک کے وفادار غلام
ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے لڑکیوں کے گرد گھیرا تنگ کر کے اچک اچک کر لڑکیوں
کی لگامیں پکڑنی شروع کر دیں۔ لڑکیوں نے شور مچانا شروع کیا تو حملہ آوروں نے
کمندیں پھینک کر لڑکیوں کو نہ صرف گھوڑوں سے کھینچ لیا بلکہ اُن کے منہ میں رومال
ٹھونس کر اُن کی زبانیں بند کر دیں۔ پھر اُنہی کے دوپٹوں سے اُن کے ہاتھ باندھ
دیئے اور اُنہیں کھینچ کر اپنے گھوڑے کے پیچھے لاد لیا اور نہایت اطمینان سے واپس
ہوئے۔

دیدہ دلیر حملہ آوروں کا یہ قافلہ تھوڑی دُور گیا تھا کہ سامنے سے مسلح خواتین
سواروں کا ایک پورا دستہ جو پوری طرح مسلح تھا، آتا دکھائی دیا۔ خواتین کے اس مسلح
دستے کو دیکھ کر حملے آور گھبرائے اور رُک کر کھڑے ہو گئے۔ خواتین مسلح سواروں کے
دستے کی قیادت ایک خاتون کر رہی تھی جس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا کوڑا تھا۔

خاتون سردار گھوڑا بڑھا کے ان سواروں کے پاس پہنچی۔ اُس نے ہر گھوڑے کی
پشت پر ایک بندھی ہوئی لڑکی دیکھی تو چیخ کے بولی۔

"تمہارا سردار کون ہے؟"

سواروں میں سے ایک گھوڑا بڑھا کے خاتون سوار کے قریب آ گیا۔

"میں ہوں اس دستے کا سردار۔" اُس نے کمال رعونت سے بتایا۔

خاتون سوار نے چیخ کر کہا۔

"تم نے ان لڑکیوں کو کیوں اور کس کے حکم سے گرفتار کیا ہے؟"

"شاہ اسپین راڈرک کے حکم سے۔" اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

خاتون سوار نے گردن آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم شاہ راڈرک کی محبوب ملکہ "مودونہ" کو جانتے ہو؟"

سوار ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ حملہ آور سواروں کے ایک سوار کی پشت سے
آواز بلند ہوئی۔

"ممی ـــــ! مادر ملکہ ـــــ! میں حریشہ، آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے چھڑائیے۔"

مجھے اس ظالم نے باندھ رکھا ہے۔"

یہ آواز بلند ہوتے ہی وہ سوار جس کی پشت پر شہزادی حریشہ بندھی ہوئی تھی جلدی سے گھوڑے سے کودا۔ اُس نے جلدی جلدی حریشہ کے ہاتھ پیر کھولے، اُسے گھوڑے سے اُتار کر زمین پر کھڑا کیا اور اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بولا۔

"شہزادی عالیہ! مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ شہزادی اُندلس ہیں۔"

اسی وقت ملکہ مودونہ، گھوڑا بڑھا کے وہاں پہنچی۔ اُس نے جو اپنی بیٹی حریشہ کو کھڑے دیکھا تو جست لگا کے گھوڑے سے اُتری اور دوڑ کر اپنی شہزادی بیٹی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"ممی ——— ممی ———!" شہزادی حریشہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "ان ڈاکوؤں کو سولی پر چڑھوا دیجئے۔ انہوں نے مجھے اور میری سہیلیوں کو بہت دُکھ دیا ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا بیٹی ———!" ملکہ مودونہ نے بیٹی کو چومتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بتاؤ! تم ان ظالموں کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟"

"ممی! میں تو محل میں تھی ———" شہزادی نے سسکیاں لے لے کے بتانا شروع کیا۔ "مگر سہیلیاں مجھے سیر کے لئے ادھر لے آئیں۔ پھر یہ ظالم ملے اور انہوں نے ہم سب کو پکڑ کر گھوڑوں کی پیٹھ سے باندھ دیا۔"

اور شہزادی اور اُس کی سہیلیوں کو گرفتار کرنے والے تمام سوار اُن کے سامنے سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے سردار نے لرزتے ہوئے کہا۔

"ہمیں معاف کر دیا جائے ملکہ عالیہ! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ شہزادی عالیہ اور ان کی سہیلیاں ہیں۔"

"تم انہیں پکڑ کے کہاں لئے جا رہے تھے؟" ملکہ نے کڑک کر پوچھا۔

"ہم شاہی دستے کے سوار ہیں ملکہ عالیہ ———!" سردار سوار نے گڑگڑاتے ہوئے بتایا۔ "ہم گناہ گار ہیں۔ مگر کیا، کیا جائے کہ یہ ذلیل کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے؟ اور ہم روزی کمانے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے یہ کام کرتے ہیں۔"

ملکہ مودونہ کی سمجھ میں اُن کی بات پوری طرح نہ آئی تو اُس نے ڈپٹ کے پوچھا۔

"تمہیں یہ ذلیل کام کرنے پر کس نے لگایا ہے؟ مجھے بتاؤ! میں اُس کمینے کو قید میں ڈال کر سڑا ڈالوں گی۔"

سواروں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اُن کا سردار ذرا تن کے بولا۔

"ملکہ عالیہ! ہم غلام ہیں اور ہمارا کام آقا کا حکم بجا لانا ہے۔ ہم نے یہ ذلیل کام ضرور کیا ہے۔ مگر اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

ملکہ کو سردار کے تلخ لہجے پر غصہ آ گیا۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چمڑے کا ہنٹر سردار پر کھینچ مارا۔

"ذلیل ——— کمینہ! اپنی غلطی ماننے کی بجائے زبان چلاتا ہے۔ میں تیری زبان کھینچ لوں گی۔" اور اُس نے سردار پر ہنٹر کی بارش شروع کر دی۔

سردار گھبرا کے پیچھے ہٹا۔ مگر ملکہ نے اُسے معاف نہیں کیا۔ اُس نے گھوڑا سردار پر چڑھا دیا اور ہنٹر مار مار کے اُس کا کچومر نکال دیا۔ سردار کے ساتھی سوار جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سردار نے بھی بھاگنے کی کوشش کی، مگر ملکہ نے اُسے پھر جا لیا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ———" ملکہ مودونہ نے دانت کچکچائے۔ "اچھا یہ بتا کہ تیرا بڑا سردار کون ہے؟ اور کس نے تجھے اس کام پر لگایا ہے؟"

"ملکہ عالیہ ———!" مار کھاتے ہوئے سردار نے سسکتے ہوئے کہا۔ "ہمارا کوئی بڑا سردار نہیں۔ ہم براہِ راست شاہ اُندلس کے ذاتی ملازم ہیں اور ہمارا کام ہی یہ ہے کہ خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو گھیر کر اور پکڑ کر شاہی محل لائیں اور بادشاہ معظم کے حضور پیش کریں۔"

بادشاہ کا نام سن کر ملکہ مودونہ کو ایک بار تو جھرجھری آ گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُسی وقت شہزادی حریشہ نے کہا۔

"مادر ملکہ! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ابا حضور ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

مگر ملکہ مودونہ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے خالی خالی نظروں سے اوپر آسمان کو دیکھا، پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔

"بیٹی حریشہ! تم اپنے ابا حضور کو نہیں جانتیں۔ وہ ایک عظیم شہنشاہ ہیں۔ اُن کی نظر

میں کسی کی کوئی عزت نہیں۔ مگر آج میں اُن سے پوچھ کے رہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے بڑے دُکھ سے کہا۔

"شاہی سوارو ____! ملکہ مودونہ نے تمہیں معاف کیا۔ آج سے تم شاہ نہیں بلکہ ہمارے ملازم ہو اور تمہارا کام یہ ہے کہ تم تمام ایسے لوگوں کو تلاش کرو جنہیں شاہ ہسپانیہ نے اس ذلیل کام پر لگایا ہے۔ ہم تمہیں اُن کی گرفتاری کا حکم دیتے ہیں۔ اگر وہ تمہارے ہاتھوں مارے جائیں تو ہم تمہیں اُن کے خون سے پہلے ہی معاف کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ملکہ مودونہ محل کی طرف سر جھکائے چل پڑی۔ اُس نے شہزادی حریشہ کو اپنی پشت پر بٹھا لیا تھا۔ سردار اور اُس کے دستے کے سواروں نے ملکہ کو سلام پیش کیا اور وہ تمام کے تمام دوسری طرف روانہ ہو گئے۔



وہ رات ملکہ مودونہ نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ تمام رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتی اور اُٹھتی بیٹھتی رہی۔ شہزادی حریشہ بھی دیر تک جاگتی رہی۔ مگر اُس نے ماں سے کوئی بات نہ کی۔ کیونکہ ملکہ سخت غصے میں تھی۔ یہ شاہی خوابگاہ کا زنانہ حصہ تھا۔ یہاں ملکہ مودونہ، اُس کی بیٹی حریشہ اور ملکہ کی دو بوڑھی بیوہ بہنیں رہتی تھیں۔ اس زنانہ حصے کے سامنے ایک وسیع لان تھا جس میں پھول بوٹے اُگے ہوئے تھے۔

اس لان اور چمن کے دوسری طرف بادشاہ راڈرک کی خوابگاہ تھی۔ وہاں شام ہوتے ہی گانے بجانے کی محفلیں لگنا شروع ہو جاتیں تھیں اور یہ محفلیں تقریباً صبح تک جاری رہتی تھیں جہاں رنگین مزاج بادشاہ کے اوباش مصاحبین اُودھم مچائے رکھتے تھے اور شراب کے نشے میں دُھت ہو کر اِدھر اُدھر گر کر سو جاتے تھے۔ اس حصے کے آخری حصہ میں شاہ راڈرک (لرزیق) کی نہایت شاندار خوابگاہ تھی جس کے چپے چپے پر حسین و جمیل، زرق برق لباس میں ملبوس کنیزیں ایک دوسری کو چھیڑتی اور کلیلیں کرتی رہتی تھیں۔ شاہی خوابگاہ نہایت آراستہ و پیراستہ تھی اور دنیا بھر سے آئے ہوئے تحفے اس خوابگاہ میں نہایت قرینے سے سونے چاندی کے بریکٹوں پر آویزاں تھے۔

یہ خوابگاہ نصف شب تک جاگتی تھی۔ شاہ راڈرک کے اوباش اور بدمعاش مصاحب اُودھم مچاتے رہتے تھے۔ رقص و موسیقی کی نیم برہنہ محفلیں بھی یہیں جمتی تھیں اور وہ شاہی ہرکارے جو ملک بھر سے خوبصورت لڑکیاں اغواء کر کے یا زبردستی پکڑ کے لاتے تھے اُنہیں یہاں کے کمروں میں ٹھہرایا جاتا۔ پھر وہ آراستہ پیراستہ کر کے شاہ راڈرک اور اُس کے مصاحبوں کے حضور پیش کی جاتی تھیں۔

یہ ایک اچھا خاصا طوائفوں کا چکلا تھا جہاں دنیا بھر سے پکڑ کے کنواریاں لائی جاتی تھیں۔ جنہیں شاہ راڈرک اور اُس کے مصاحبین اپنی ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ یہ

سلسلہ شاہ راڈرک کے اقتدار سنبھالنے سے اب تک جاری تھا۔ اُس رات بھی شاہی خوابگاہ میں اُودھم مچا ہوا تھا۔ شاہ راڈرک، زرنگار تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔ رقص ہو رہا تھا۔ شاہ راڈرک کے دونوں پہلوؤں میں دو لڑکیاں ڈری اور دبکی بیٹھی تھیں۔ یہ وہی رات تھی جس کے دن میں مادر ملکہ مودونہ نے شہزادی حریشہ کو شاہی غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا تھا۔

شراب کے دور چل رہے تھے اور رقص و موسیقی کی محفل اپنے شباب پر تھی کہ شاہی خوابگاہ کا دروازہ جو اندر سے بند کر لیا گیا تھا وہ بجنا شروع ہو گیا۔ دروازے کو باہر کی طرف سے کوئی پیٹ رہا تھا۔ دروازہ پیٹے جانے سے ایسا شور بلند ہو گیا کہ محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ شاہ راڈرک نے غصے سے تلملا کر دروازے پر کھڑے پہریدار کو دیکھا۔ پہریدار نے ایک لمحے کے لئے بادشاہ سے نظریں ملا کر نیچی کر لیں۔

اُسی وقت بادشاہ راڈرک نے غصے سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے۔ باہر سے دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟“

دروازے کے آگے کھڑے ہوئے پہریدار نے بادشاہ کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ شاہ راڈرک کو سلام کر کے پھر آنکھیں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”او کتے کی اولاد ——!“ شاہ راڈرک دھاڑا۔ ”نظر جھکائے کھڑا ہے، دروازہ کھول کے نہیں دیکھتا کہ کون بدتمیز ہے جس نے شاہی محفل کا رنگ بگاڑ دیا ہے۔ باہر نکل اور اُسے گدی سے پکڑ کر ہمارے سامنے پیش کر۔ ہم اُس کے اُن ہاتھوں کا سرمہ بنوا دیں گے جن ہاتھوں سے وہ ہماری محفل کا رنگ بگاڑ رہا ہے۔“

یہ حکم پاتے ہی دروازے کے آگے کھڑا ہوا پہریدار بجلی جیسی تیزی کے ساتھ دروازے پر پہنچا اور اندر سے لگی زنجیر کھینچ کر دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا۔ بادشاہ اور تمام حاضرین محفل کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی شاہ راڈرک جس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں، اُس کی زبان سے ایک دم نکلا۔

”ملکہ عالیہ —— آپ ——؟“

اور بادشاہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ پھر تمام محفل بھی بادشاہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

لوگوں نے دیکھا کہ ملکہ مودونہ اپنی بیٹی حریشہ کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی اور

حریشہ کو دھکا دے کر آگے دھکیلتے ہوئے چیخ کر کہا۔

”لو —— سنبھالو اپنی بیٹی حریشہ کو۔ جس کو پکڑنے کے لئے تم نے شہر بھر میں اپنے غلیظ اور خونخوار ہرکارے اور غنڈے بھیجے تھے۔“

”مگر ملکہ عالیہ —— بے بی حریشہ تو ——“ بادشاہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

ملکہ نے جل کر کہا۔

”تمہارے غنڈوں نے بے بی کو گھیر لیا تھا۔ وہ تو میں پہنچ گئی اور میں نے اسے بچا لیا۔ ورنہ یہ بھی دوسری بچیوں کی طرح تمہارے پاس پکڑ کے لائی جاتی۔“

شاہ راڈرک نے شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

ملکہ مودونہ نے فوراً ایک شاہانہ فرمان جاری کیا۔

”راڈرک ——! تمہاری قید میں جتنی لڑکیاں ہیں، انہیں فوراً چھوڑ دیا جائے۔“

شاہ راڈرک نے اپنے غنڈوں کی طرف دیکھا جو ملکہ مودونہ کو دیکھ کر اِدھر اُدھر دبکے کھڑے تھے۔

راڈرک چیخ کر بولا۔

”سنا نہیں تم لوگوں نے —— ملکہ نے کیا حکم دیا ہے؟“

ایک غنڈہ منمنایا۔

”حضور! صرف ایک لڑکی ہے۔ حکم ہو ——“

”فوراً چھوڑ دو اُسے۔“ راڈرک پھر دہاڑا۔

غنڈہ ایک طرف کو بھاگا تو راڈرک نے شاہانہ انداز میں حکم دیا۔

”ملکہ کا حکم ہے۔ لڑکی کو اُس کے گھر تک پہنچا کے آنا۔“

اور شاہی غنڈہ سر جھکا کر ایک طرف چلا گیا۔

اُسی وقت ملکہ مودونہ نے حکم دیا۔

”مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ ایک ضروری بات کرنی ہے شاہ سے۔“

بادشاہ نے سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ دربار میں موجود غلام، ہرکارے اور شاہ راڈرک کے آوارہ مزاج درباری ایک ایک کر کے مگر جلدی جلدی دربار سے نکل گئے۔

جب دربار میں سناٹا چھا گیا تو ملکہ مودونہ نے ایک کوچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شاہ معظم کو ملک کی کچھ خبر ہے کہ نہیں؟"

راڈرک نے گھور کے ملکہ کو دیکھا۔

"ملکہ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ ہماری آنکھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ ملکہ کا اشارہ کس طرف ہے؟"

"میں شاہ کو اُس طوفان کی خبر دے رہی ہوں جو اُٹھ چکا ہے اور اب ہمارے ملک کی طرف آتا محسوس ہو رہا ہے۔" ملکہ نے شاہ کو بتایا بھی اور اُسے آزمایا بھی۔ "مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ افریقی مسلمان قوم سمندر پار کر کے ہم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے۔"

"مسلمان قوم ——!" اور راڈرک نے ایک بے تکا قہقہہ لگایا۔ "ملکہ نے کس بزدل قوم کا نام لیا۔ مسلمان تو دو بار ہمارے قلعہ سبتہ پر حملہ آور ہو چکے ہیں اور دونوں مرتبہ شکست کھا کر اور دُم دبا کر بھاگ چکے ہیں۔"

"یہ پرانی بات ہے۔" ملکہ نے شاہ راڈرک کی بات کاٹی۔ "اب حالات بدل چکے ہیں۔"

"حالات بدلنے سے قومیں تو نہیں بدلا کرتیں۔" شاہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ جو کسی نے کہا ہے تو درست ہی کہا ہے کہ آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا جہالت ہے۔" (آزمودہ را آزمودن جہل است)

"شاہ پھر کچھ بھول رہے ہیں۔" ملکہ نے شاہ کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔ "جس وقت مسلمانوں نے ہم پر حملے کئے اُس وقت حالات آج جیسے نہیں تھے۔"

"ملکہ پہیلیاں بجھا رہی ہیں۔" راڈرک چڑ گیا۔ "آخر کیا کہنا چاہتی ہیں۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ مسلمانوں نے سبتہ پر دو بار حملہ کیا اور اُنہوں نے دونوں بار منہ کی کھائی۔ کیا یہ غلط ہے؟"

"یہ تو غلط نہیں ہے۔" ملکہ مودونہ نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ "مگر اُس وقت قلعہ سبتہ کا قلعہ دار نواب جولین تھا اور اس وقت وہی نواب جولین، مسلمانوں کی آغوش میں بیٹھا اُنہیں قلعہ سبتہ کا راستہ دکھا رہا ہے۔"

نواب جولین کا نام سنتے ہی شاہ راڈرک کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اُس نے چور نظروں

سے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر مری ہوئی آواز میں بولا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ نواب جولین ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہم سے باغی ہو گیا ہے۔ مگر ہمارا موجودہ قلعہ دار، جولین سے زیادہ بہادر اور سمجھدار ہے۔"

ملکہ مودونہ، راڈرک کی ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری سے تنگ آ گئی تھی۔ آخر اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"شاہ معظم! اپنی غلط روش تبدیل کر دیں۔ ورنہ آنے والا طوفان ہسپانیہ کے تخت کو اُلٹ کے رکھ دے گا۔ نواب جولین صرف مسلمانوں کی رہبری ہی نہیں کرے گا بلکہ اُس کی آواز پر قلعہ سبتہ کے دروازے مسلمانوں کے استقبال کے لئے کھل جائیں گے۔ اور عیسائیوں کے سر ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے سامنے جھک جائیں گے۔"

ہسپانیہ کے شاہ راڈرک نے یہ خبر کسی اور ذرائع سے بھی سنی تھی مگر مودونہ نے جس اعتماد سے مسلمانوں کی نقل و حرکت کی خبر دی تھی اس سے شاہ کے ہوش و حواس اُڑ گئے تھے۔ چنانچہ اُس نے فوراً جنگی تیاریوں کا حکم دے دیا۔

اُس وقت شمالی افریقہ کے مسلمان حاکم اور اسلامی لشکر کے سپہ سالار موسیٰ بن نصیر تھے۔ 89 ہجری میں موسیٰ بن نصیر نے اپنا مرکز شمالی افریقہ (قیرواں) میں بنایا تھا اور اُن کے قبضے میں مصر سے لے کر بحر اوقیانوس تک کا پورا علاقہ تھا۔ شمالی افریقہ میں بربر قوم بڑی سرکش تھی۔ اس سے پہلے بھی اس قوم نے عقبہ بن نافع کو معہ اُن کے سرداروں کے شہید کر ڈالا تھا اور پورے شمالی افریقہ اور تمام شہروں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر اور اُس کے بہادر بیٹوں نے ملک میں امن و امان قائم کرنے میں بہت وقت صرف کیا اور تمام بربر قوم کو قبضے میں کر لیا۔ اُن کے بڑے بڑے سرداروں سے تعلق پیدا کر کے اُن میں محبت، نرمی اور اچھے اخلاق کے ذریعے اسلام پھیلایا۔

تمام شمالی افریقہ میں اُنہوں نے اپنے مبلّغ اور واعظ مقرر کئے جو لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں شمالی افریقہ اسلام کے نور سے جگمگا اُٹھا۔ جب پورے شمالی افریقہ میں اسلام پھیل چکا اور امن و امان قائم ہو گیا تو موسیٰ

بن نصیر نے شمالی افریقہ کے ساحلی شہروں کی طرف توجہ کی۔ پاس کے جزیرے کیے۔ ان جزیروں میں سارڈینا، قبرص اور سسلی وغیرہ شامل تھے۔ ان جزیرو ترقی، خوشحالی اور امن و امان کے لئے انتہائی کوششیں کیں۔ چنانچہ یہ جزیرے ا چل کر اپنی خوش حالی اور امن وامان کے لئے اسلامی سلطنت میں بہت مشہور ہوئے

اُن دنوں اُندلس کی اندرونی حالت بہت خراب تھی۔ حکومت بہت کمزور تھی۔ ا اور مذہبی لوگ عیش وعشرت میں پڑے ہوئے تھے۔ عام لوگوں کی حالت افلاس تنگ دستی کی وجہ سے نہایت ہی ابتر تھی۔ سارا ملک چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹا تھا۔ اندلس کے قلعہ سبتہ کا قلعہ دار نواب جولین تھا جو راڈرک شاہ اُندلس کے ظلم سے تنگ آ گیا تھا۔ اسی نواب جولین کی بیٹی فلورا کی عزت شاہ راڈرک نے لوٹی تھ اور وہ موسیٰ بن نصیر کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔

موسیٰ بن نصیر نے نواب جولین کی مدد کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ خلیفہ وقت اُندل پر حملے کی اجازت دیں۔ اس سلسلے میں موسیٰ نے خلیفہ کے حضور ایک سفیر بھیجا تھا خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو مشروط اجازت عطا کر دی تھی۔ چنانچہ خلیفہ کی اجازت ک بعد موسیٰ بن نصیر نے اپنے ایک قابل اعتماد غلام جس کا نام طریف تھا کو ایک سواروں اور تین سو پیادوں کے ساتھ اسپین کی طرف بھیجا۔

طریف نے آبنائے کو عبور کر کے بعض ساحلی علاقوں پر حملے کیے اور بہت سا ما غنیمت لے کر واپس آیا۔ اُس کی واپسی پر اسپین کی فتح کے اصل کام کی ابتدا ہوئی۔ ا اس مہم کے لئے موسیٰ بن نصیر نے اپنے معتبر نومسلم غلام طارق بن زیاد کا انتخاب کیا پھر چھاؤنی میں ہتھیار بجنے لگے، تلواریں تیز ہونے لگیں اور اسلحے جسموں پر سجا جانے لگے۔

پھر 5 رجب 92 ہجری مطابق 9 جولائی 711ء کو یہ جانباز سات ہزار جوا مردوں کے ساتھ ساحل اُندلس (اسپین) کیپنے کے مقام پر قلعہ الاسد کے قریب اُترا علامہ مقری کے بیان کے مطابق یہ 27 ماہ شعبان تھا۔ مگر سن ہجری 92 تھا جب جولی کے عطا کردہ چار جہازوں پر سوار فوجیوں کی یہ قلیل تعداد ایک نئے ملک، نئی سرزمین نئی آب و ہوا، نئی فضا میں پہنچی۔ یہ لوگ وہاں کے حالات سے واقف تھے نہ انہیں

وہاں کی کیفیات کا اندازہ تھا۔ ایک اجنبی ملک میں جسے سمندر کے تیز دھاروں نے اُن کے وطن سے علیحدہ کر دیا تھا، صرف اپنے عزم، حوصلے، جوش اور قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر جا پہنچے تھے۔ طارق کے ساتھ تین سو سوار بھی تھے اور یہودی قوم کا ٹھک مغیث الردی اور یونانی جولین کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر اُن کی بلند حوصلگی اور تائید ایزدی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راستے میں طارق بن زیاد نے ایک خواب دیکھا کہ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مہاجر اور انصار صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور مسلح صحابہ کے درمیان طارق بن زیاد سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

"طارق! شان سے قدم بڑھاتے چلو!"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طارق کو مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے اور وعدے پورے کرنے کی ہدایت کی۔

پھر طارق نے دیکھا کہ حضور نبی کریمؐ صحابہؓ کے ہمراہ اُندلس (اسپین) میں داخل ہوئے ہیں اور طارق، حضورؐ کی مقدس جماعت کے عقب میں قدم بڑھا رہا ہے۔

طارق نے اپنا خواب ہمراہیوں کو سنایا تو سب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور سب کو یقین ہو گیا کہ انہیں اس مہم میں ضرور کامیابی ہو گی۔ طارق بن زیاد نے جبل الطارق کے کنارے اُترنے کے بعد ایک تقریر کی۔ واضح رہے کہ اس تقریر سے پہلے طارق بن زیاد نے اُن جہازوں کو جنھوں نے ان جانبازوں کو سرحد اُندلس پر پہنچایا تھا، نذرِ آتش کر دیا۔ عقلیں حیران تھیں اور سمجھ پریشان۔ بحر ذخار کا فاصلہ ان کشتیوں کے بغیر طے نہ ہو سکتا تھا۔ اور وہی کشتیاں جو ان کو ریگ زاروں سے نکال کر مرغزاروں میں لائی تھیں، شعلوں کی نذر کر دی گئی تھیں۔

یہ حیرانی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ہوش وخرد پر مزید کشمکش کا عالم طاری نہ رہا اور ہوا یوں کہ نعرہ کے ساتھ اُس مردِ جری کی آواز اُس کے ہمراہیوں کے کانوں سے ٹکرائی۔ اُس آواز نے کیا کہا؟ اُس گرج میں کون سی بجلی پنہاں تھی؟ اس کا اندازہ آپ خود کیجئے! طارق بن زیاد کا خطبہ جو انہوں نے ساحل اُندلس پر اُتر کے دیا۔ اس کا ترجمہ اس طرح ہے۔

"اے جوانمردو!

جنگ کے میدان سے اب کوئی مفر کی صورت نہیں۔ دشمن تمہارے سامنے ہے، سمندر تمہارے پیچھے۔ کشتیاں جلائی جا چکی ہیں۔ نہ راہِ فرار اس طرف ہے نہ اُس طرف ہے۔ صدق، صبر اور مستقل مزاجی کے علاوہ اب تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ یہ اچھی طرح جان لو کہ تمہاری مثال اس جزیرے میں ایسی ہے جیسے کنجوس دسترخوان پر یتیم کی۔ تمہاری ذرا سی کم ہمتی تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لئے کافی ہے۔ تمہارے دشمن کے پاس فوج بھی ہے اور اسلحہ جنگ بھی۔ تمہارے پاس بجز تمہاری تلواروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اُن کے پاس اسلحہ حاصل کرنے کے لئے ہزاروں ذریعے ہیں۔ تمہارے پاس ایک بھی نہیں۔ اگر تم نے ہمت سے کام نہ لیا تو تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ تمہاری عظمت خاک میں مل جائے گی۔ تمہارا رُعب ختم ہو جائے گا۔ دشمنوں کی ہمتیں بڑھ جائیں گی۔ تم اپنی عزت اور ناموس کو بچاؤ اور دشمن جو تمہارا مقابلہ کرنے کے لئے بڑھا آ رہا ہے اُس کے دانت کھٹے کرو۔ اُس کی قوت ختم کر دو۔ میں نے تم کو کسی ایسے کام سے نہیں ڈرایا جس سے میں خود گریز کروں۔ میں نے تم کو ایسی زمین پر لڑنے کے لئے آمادہ نہیں کیا جہاں میں خود لڑائی نہ کروں۔ اگر تم نے ذرا سی ہمت سے کام لیا تو اس ملک کی دولت اور عظمت تمہاری جوتیوں کی خاک ہو گی۔ اگر تھوڑی سی سختی برداشت کر گئے تو اس جزیرے کی ہر چیز تمہاری ملکیت ہو گی۔ امیر المومنین، ولید بن عبدالملک نے تم جیسے بہادروں کا انتخاب کیا کہ تم اس جزیرے کے شاہوں کے داماد بن جاؤ۔ یہاں کی حوروش عورتوں، مہ جبینوں اور حسینوں کے سرتاج ہو جاؤ۔ تم نے اگر یہاں کے شہسواروں سے دو دو ہاتھ کر لئے تو خدا کا دین، رسولؐ کا حکم یہاں جاری اور ساری ہو جائے گا۔ یہ جان لو! کہ جدھر میں تم لوگوں کو بلا رہا ہوں اُدھر جانے والا پہلا شخص خود میں ہوں گا۔ جب فوجیں ٹکرائیں گی تو پہلی تلوار میری ہو گی جو اُٹھے گی۔ اگر

میں مارا جاؤں تو تم لوگ عاقل اور دانا ہو۔ کسی دوسرے کا انتخاب کر لینا۔ مگر خدا کی راہ میں جان دینے سے منہ نہ موڑنا اور اُس وقت تک دم نہ لینا جب تک یہ جزیرہ فتح نہ ہو جائے۔"

جس طرح وہ خطبہ یادگار ہے اُسی طرح وہ جگہ بھی جہاں فرزندانِ توحید کے قدم سب سے پہلے پہنچے۔ وہ جگہ آج تک "طارق" کے نام پر "جبل الطارق" یا جبرالٹر کہلاتی ہے۔

طارق بن زیاد کے قدم ابھی جبرالٹر سے آگے نہ بڑھے تھے کہ اسپین کے شاہ "راڈرک" کے ایک آزمودہ کار جنرل تھیوڈومیر نے اس حملہ ناگہانی کی خبر پالی اور اُس کو دور کرنے کے لئے پوری طاقت سے اس نیم مسلح مگر مرتب فوج سے آ ٹکرایا اور پسپا ہوا۔ تھیوڈومیر کے دل و دماغ پر اس شکست نے ایسی ہیبت طاری کی کہ وہ دوبارہ مقابلے کے بجائے بھاگا بھاگا اپنے آقا شاہ راڈرک کی خدمت میں پہنچا اور اُس نے جو نقشہ ان بے سروساماں بادیہ پیماؤں کا پیش کیا اُس کے ایک ایک لفظ سے لشکر اسلام کی عظمت اور دہشت دونوں کا پتہ چلتا تھا۔ تھیوڈومیر نے ان حملہ آوروں کو بھوتوں کے نام سے تعبیر کیا جو نہ معلوم کہاں سے آ گئے تھے؟ کیوں آ گئے تھے؟ اور کیسے آ گئے تھے؟ اُن کا وطن یا اُن کی قومیت کا کوئی پتہ نہ تھا اور نہ اُن کے مقصد کی کوئی خبر تھی۔

اُندلس (ہسپانیہ) کا شاہ راڈرک اُن دنوں جرمن قوم بش کس کی بغاوت کو فرو کرنے کی غرض سے پمپلونہ یا بمبلونہ میں مقیم تھا۔ اگرچہ اُس میں صدہا اخلاقی کمزوریاں اور عیوب تھے لیکن اُس میں عزم اور استقلال کی ہرگز کمی نہ تھی۔ وہ تھیوڈومیر کی طرح نہ تو گھبرایا اور نہ اُس نے وحشت کا اظہار کیا بلکہ چپکے سے محاصرہ اُٹھا کر دارالسلطنت واپس آ گیا اور وہاں پہنچ کر اُس نے ہر طرف ہرکارے "مذہبی جنگ" کے اعلان کے ساتھ دوڑائے۔

اُس نے پادریوں سے درخواست کی کہ اس بری گھڑی میں ساتھ دیں اور جنگ کو مذہبی جنگ کا رنگ دے کر زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کریں۔ وعظ اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ عوام کو "شوقِ جنگ" بھی دلایا گیا اور اسے سعادتِ عظمیٰ کا رتبہ دیا گیا۔ انعام واکرام کے وعدے کئے گئے۔ لوگوں میں زمین اور جاگیریں عنایت کی جانے

لگیں۔ زر و جواہر بھی لٹائے گئے۔ مدد و معاش کے انتظامات کئے جانے لگے۔
بھرتی بھی شروع کر دی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک لاکھ فوج جمع کر لی گئی۔
اس لشکر میں گھوڑے بھی تھے، بیش قیمت اسلحہ جنگ بھی اور ساز و سامان بھی۔
راڈرک کا تخت سونے اور جواہرات سے آراستہ اور لعل و زمرد سے سجا ہوا تھا۔ یہ
زبرجد اور یاقوت سے لِسا ہوا دو گھوڑوں کی پیٹھ پر رکھا تھا جس پر سنہری چھتر لگا
ایک طرف یہ آن بان تھی، شان و شوکت تھی، تزک و احتشام تھا اور دوسری جا
پورے طور پر ہتھیار تھے نہ گھوڑے۔ نہ سامانِ رسد نہ اسلحہ۔ اگر کوئی چیز ساتھ تھی
جذبۂ جہاد، شوقِ شہادت اور قوتِ ایمانی۔

طارق بن زیاد کو جیسے ہی شاہ راڈرک کی ان تیاریوں کی خبر ملی، اُس نے فوراً
آقا اور سردار اعلیٰ موسیٰ بن نصیر کے پاس پیادے دوڑائے کہ ایک لاکھ کے مقا
میں سات ہزار کا کوئی تناسب نہیں۔ کوئی مقابلہ نہیں۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے
ہزار مزید کمک روانہ کی۔ اس طرح اب ایک اور دس کا مقابلہ تھا۔

طارق بن زیاد جذبۂ ایثار سے سرشار آگے بڑھے۔ پہلے اُنہوں نے کارچ
کیا۔ پھر جولائی 711ء کی ایک حسین اور دلفریب صبح کو اُنہوں نے دریائے گاڈ
وادی بکہ یا لکہ کے کنارے، جھیل لاجھنڈا کے پاس مدینہ سودینہ کے میدان میں
کیا اور قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھنے کے لئے بے چینی سے دشمنوں کی فوج کا ا
کرنے لگے۔ آخر وہ فوجیں بھی آ پہنچیں۔

ایک طرف خیموں سے چھنا چھن اور کھناکھن کی آوازیں تھیں تو دوسری جانب
تکبیر کی صدائیں۔ ایک طرف جام سے جام ٹکرائے جا رہے تھے، دوسری طر
سجدوں میں جھکے ہوئے سر فتح اور نصرت کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک طرف
بصد ناز و انداز اٹھکیلیاں کر رہے تھے تو دوسری طرف والے خدا سے آسرا لگا
ہوئے، تپتی ہوئی مٹی پر سجدے ادا کر رہے تھے۔ ایک طرف موتی اور جواہرات
ہوئی تلواریں ہوا میں لہرا رہی تھیں، دوسری طرف بے نیام کی ہوئی تلواریں پتھرو
رگڑ رگڑ کر تیز کی جا رہی تھیں۔ ایک طرف عیسائی چاندی ٹکے ہوئے نعل وا
گھوڑے ہنہنا رہے تھے، دوسرف طرف پاؤں میں چیتھڑے لپیٹے جا رہے تھ

کیفیت نہ معلوم کتنے دنوں تک دونوں کیمپوں میں قائم رہی۔ پھر آخرکار ''روزِ جنگ''
آ ہی گیا ____ طبل جنگ بج اُٹھا اور تکبیروں کے نعروں اور گونج سے صحرا میں جیسے
تلاطم پیدا ہو گیا۔ تلواروں کی چمک نے سورج کی روشنی کو ماند کر دیا۔ کھانڈے سے
کھانڈا ٹکرایا۔ تلواریں ایک دوسرے کا خون پینے لگیں۔ نیزوں نے سینوں میں سوراخ
کر دیئے۔ سپاہیوں کے سر، کلہاڑیوں کی ضرب سے پاش پاش ہونے لگے۔ میدانِ
جنگ میں دشمن کے چار سو یا چار ہزار فوجی نہ تھے بلکہ اُن کی تعداد ایک لاکھ سے بھی
زیادہ تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ جنگ کئی ہفتوں جاری رہے گی۔ مگر لڑائی کا نقشہ
آٹھویں ہی روز بدل گیا۔ طارق بن زیاد نے اپنے مخصوص دستوں کے ساتھ دشمن پر
ایک زبردست یلغار کی جس کے نتیجے میں دشمن کے لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی اور ہر
طرف دشمن کے دستوں کے درمیان انتشار اور محرومی کی علامتیں نظر آنے لگیں۔

دشمن کے کتنے ہی فوجی تلوار کی گھاٹ اور اُس سے زیادہ دریا کے گھاٹ اُتر گئے۔
ہر طرف موت رقصاں نظر آتی تھی۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں۔ سر تن سے جدا ہو
رہے تھے۔ ہاتھ کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ ہزاروں کو موت نگل گئی۔ بہت سے دریا
میں ڈوب گئے۔ خود شاہ راڈرک ایک دم سے غائب ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ راڈرک کا گھوڑا اور اُس کا سنہرا جوتوں کا جوڑا دریائے
گاڈلیٹ کے کنارے ملا۔ اس سے اندازہ لگایا گیا کہ شاہ خود بھی دریا میں ڈوب مرا
ہے۔ اُس کی گمشدگی کا عیسائیوں نے کچھ اور ہی مقصد نکالا اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا
ہو گئے کہ شاہ راڈرک نئی تازہ دم فوج لینے گیا ہے اور کسی دن واپس آ سکتا ہے۔ مگر یہ
خیال، خام ہی رہا۔ ہسپانوی لشکری عرصہ تک اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ شاہ اب
واپس آیا اور تب آیا۔ مگر شاہ کہاں واپس آتا؟ وہ تو سپاہیوں اور محافظوں کے ساتھ
مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اُس کی لاش دریا برد ہو گئی تھی۔

جنگ گاڈلیٹ کا شمار دنیا کی اُن عظیم الشان جنگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے چشم
زدن میں ایک قدیم سلطنت کی بنیادیں ہلا کر اُس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور ان
کی جگہ ایک نئی طاقت کو اس پر مسلط کر دیا جس نے تین سو سالہ پرانی تہذیب
(عیسائیت) کی جڑیں اُکھاڑ کر ایک نئی تہذیب کی جڑیں مضبوط کر دیں جس نے

تثلیث پرستوں کی حکومت پر توحید پرستوں کو غلبہ دلا دیا۔ جس نے غیر منظم اور ز
آلود نظام پر ایک منظم اور مرتب نظام کو قائم اور دائم کر دیا۔ جس نے مظلوم اور خا
بہ سر عوام کو از سر نو تازہ زندگی بخش دی۔ جس نے پٹے ہوئے یہودیوں کو ایک نئی
حیات کا پیغام دیا۔ ضبط شدہ املاک واپس کی گئیں۔ غیطشہ کے بیٹوں کو وہ سب کچھ
جو اُن سے چھین لیا گیا تھا۔

غیطشہ کا سب سے بڑا بیٹا المند تھا۔ اُس کو وعدے کا پاس کرتے ہوئے اسپین
کے مغربی اضلاع میں ایک ہزار جاگیریں عطا ہوئیں اور وہ اُن کے انتظام کے لئے
میں اشبیلیہ کے نزدیک جا بسا۔ دوسرے بیٹے کا نام ارطباش تھا۔ اُس کے حصے میں
اسی قدر جاگیریں آئیں مگر جو کچھ دُور وسط اسپین میں واقع تھیں۔ اُس نے اپنے لئے
قرطبہ کو پسند کیا۔ تیسرا بیٹا وقلہ تھا جو اسی قدر جاگیریں حاصل کرنے کے بعد اُن
چھین سے مشرقی حدود میں جا بسا اور طلیطلہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ المند کے مرنے کے
بعد اُس کی جائیداد اُس کی بیٹی سارہ عرف قوطیہ کے ہاتھ آئی۔ اُس کے چچا یعنی ا
کے دوسرے بھائی ارطباش نے اُس کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔

قوطیہ نے اس زیادتی اور ظلم کے خلاف خلیفہ سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا
اپنی فریاد خلیفۃ المسلمین کے سامنے پیش کرنے کے لئے دمشق روانہ ہوئی۔ اُس نے
ایک جہاز کرایہ پر لیا اور عقلان میں جا اُتری۔ وہاں سے قوطیہ، خلیفہ وقت ہشام
عبدالملک سے ملنے کے لئے پہنچی۔

خلیفہ نے فوراً پروانہ افریقہ کے وائسرائے حنظلہ بن صفوان کے نام جاری کیا
میں حکم دیا گیا کہ قوطیہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ یہ حکم فوراً ابو الخطار
پاس جو اُندلس کا عامل تھا اور ابن صفوان کا چچیرا بھائی تھا بھجوا دیا گیا۔ چنانچہ قو
(سارہ) کو اُس کی جاگیر واپس مل گئی اور ارطباش کو سرزنش کی گئی۔ خلیفہ ہشام کے
ایماء پر سارہ کی شادی عیسیٰ بن مزاحم سے ہوئی اور عیسیٰ کی موت کے بعد عمیر بن
کے ساتھ عقد ثانی کر دیا گیا۔

سارہ کے پہلے شوہر سے دو بچے ابراہیم اور اسحاق پیدا ہوئے۔ اُس کی اولاد
القرطبہ کہلائی۔ اور جب عبدالرحمٰن اوّل تخت نشین ہوا تو اُن کو خاص مراعات اور عزت

بخشی گئی۔

اس جنگ میں تقریباً پچاس ہزار قوطی (گوتھک) فنا سے دوچار ہوئے اور بیس
ہزار قید کر لئے گئے اور اُنہیں اُن رسیوں سے باندھا گیا جو مسلمانوں کو باندھنے کے
لئے لائی گئی تھیں۔ مقتولین میں ہزاروں رؤسا، اُمراء اور حکماء تھے جن کی زر و جواہر
سے زرنگار تلواریں زمین پر پڑی ہوئی سورج کی روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کر رہی
تھیں۔ جن کے مرصع ہتھیار اُن کے جسموں سے لپٹے ہوئے اُن کی موت پر گریہ
کناں تھے۔

جنگ گاڈلیٹ نے بے سرو سامان مسلمانوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور اُن
میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ اُن کی شکستہ ہوتی اُمیدیں ایک دم تر و تازہ ہو
گئیں۔ جذبوں میں نیا رنگ آ گیا۔ ہمتوں جرأتوں میں حد درجہ اضافہ ہوا۔ اُنہوں
نے مٹھی بھر ہوتے ہوئے بھی ایک عظیم لشکر پر فتح حاصل کی تھی۔ اُنہوں نے دیس سے
دُور پرائے ملک میں اپنی سچائی کے علم گاڑے تھے۔ ان بے آسرا مسلمانوں نے نہ
صرف بہادری کے جوہر دکھائے تھے بلکہ ہمت اور جرأت کا ایسا مظاہرہ کیا تھا جس کی
مثال موجود نہ تھی۔ ان مسلمانوں نے عملاً وہ کر دکھایا جو بظاہر ممکن نظر نہ آتا تھا۔

حقیقت میں اس نئے ماحول میں ان مسلمانوں نے اُس وقت نصرت و کامیابی کو
ہم آغوش کیا تھا جب یاس و حرماں کے آثار ہر مسلمان کے چہرے سے ہویدا تھے اور
نصرت و فتح کی اُمید نہ ہونے کے برابر تھی۔ چنانچہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ
اس قدر دولت آئی جس کا وہ کئی کئی دن تک حساب کرتے اور خدا کا شکر بجا لاتے
رہے تھے۔ اس جنگ نے ایک طرف مسلمانوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ
عیسائیوں کے رہے سہے حوصلوں کو بھی بالکل پست کر دیا۔ اُن کی مضبوط اور انتہائی
مستحکم سلطنت دیکھتے ہی دیکھتے پارہ پارہ ہو گئی۔ اُن کی اُمیدوں اور آرزوؤں کی کشتی
بھنور میں ایسی پھنسی کہ پھر نہ اُبھر سکی۔ اُن کی ناؤ منجدھار میں ایسی ڈوبی جو پھر نہ اُبھر
سکی۔ اُن کی تہذیب کی بنیادیں اس طرح ہلیں کہ آئندہ سات سو سال تک اُن کے
نشان بھی نظر نہ آئے۔

جنگ گاڈلیٹ کی شکست نے دراصل عیسائیوں کی طاقت اور عظمت کا شیرازہ اس

طرح بکھیر کر رکھ دیا جو پھر مجتمع نہ ہو سکا۔ اُن کی ہمتوں نے اس طرح سے جواب د
کہ پھر کبھی سنبھالا نہ لے سکیں۔ اُن کی جراُتوں نے اس انداز میں دم توڑا کہ پھر عر
تک ان میں زندگی کی رمق پیدا نہ ہو سکی۔ اُن کی عظمت اور رفعت کو وہ ضربِ کاری لگ
کہ پھر دوبارہ اس کے نشانات بھی نمایاں نہ ہو سکے۔ اُن کی تہذیب وتمدن کو وہ صدر
پہنچا کہ پھر اُجاگر ہی نہ ہو پائی۔ اُن کی عقل، فہم و ذکا اس طرح سے ناکارہ ہوئی کہ پھ
کوئی کارنامہ وجود میں آیا ہی نہیں۔ غرض یہ کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک قوم
''قوطہ'' میں تاریکی چھا گئی اور اُن کا اقتدار فنا کی گود میں سو گیا۔

اور پھر دنیا نے اس جنگ کو دنیا کی فیصلہ کن جنگوں کا نام دے دیا۔

طارق بن زیاد نے اس جنگ میں بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ مگر اُس کی ہمتیں مزید
معرکوں کا مطالبہ کر رہی تھیں اور سرورِ کائنات کا یہ ادنیٰ غلام اور منزلیں طے کرنے کے
لئے مضطرب تھا۔ چنانچہ اس بلند نظر فاتح کی سرکردگی اور اس کے استاد موسیٰ بن نصیر کی
ہدایات کے پیش نظر اس کلمہ گو کے قدم آگے بڑھے اور بڑھتے ہی گئے۔ میدونہ شدونہ
کی فتح کی خبر قیرواں سے ہوتی ہوئی افریقہ کی بستی بستی اور قریہ قریہ پہنچ گئی۔ اس کی
دولت اور مالِ غنیمت کی داستان ہر کان سے ٹکرائی۔ موسیٰ بن نصیر نے سجدۂ شکر ادا کیا
اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں اپنی کامرانی کی خبریں روانہ کیں۔ موسیٰ بن
نصیر نے خلیفہ کو لکھا۔

''امیر المومنین! یہ جنگ کوئی معمولی جنگ نہ تھی۔ یہ معرکہ کوئی معمولی
معرکہ نہ تھا۔ اور یہ جہاد کوئی سہل جہاد نہ تھا۔ بلکہ یہ میدانِ حشر کا ایک ایسا
نمونہ تھا کہ جس کے ذکر سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور جس میں
کامیابی کا سہرا فرزندانِ توحید کے سر رہا——!''

مگر اس کے ساتھ ہی شاید جذبۂ رشک نے اُسے طارق بن زیاد کے پاس یہ
پیغام بھی بھیجنے پر مجبور کیا۔ اُس نے طارق بن زیاد کو یہ مختصر پیغام بھجوایا۔

''نزاکت حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مزید پیش قدمی مناسب نہیں۔''

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں موسیٰ بن نصیر کے جذبۂ رشک کو کس قدر دخل تھا
کیونکہ حالات کا تقاضہ تھا کہ عیسائیوں کی منتشر طاقت کو پھر سے متحد نہ ہونے دیا

جائے۔ یہی رائے نواب جولین کی تھی۔ جمہور بھی یہی چاہتے تھے کہ عیسائیوں کو دوبارہ
متحد نہ ہونے دیا جائے۔ اُس وقت طارق بن زیاد نے بھی اس بات کو مناسب سمجھا
کہ وہ آگے نہ بڑھنے کے مشورہ پر عمل نہ کرے اور اپنے آقا موسیٰ بن نصیر کو بعد میں
پوری صورت حال سے آگاہ کرے۔ مگر موسیٰ کا شاید خیال تھا کہ وہ ہوا کے دوش پر سوار
جلد از جلد اُندلس جا پہنچے اور فتح و کامرانی میں اپنا اور صرف اپنا نام شامل رہنے دے۔

خیالات کے اس اختلاف کی وجہ سے طارق بن زیاد کے قدم آگے ہی بڑھتے
گئے۔ افریقہ کے ہزاروں بربر قسمت آزمائی کے لئے مسلمانوں کے کیمپ میں آ پہنچے۔
طارق نے سب کا خیر مقدم کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنے والوں کی تعداد ایک اندازے
کے مطابق چھیاسی ہزار تک پہنچ گئی۔ اُنہیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

ایک حصہ کی قیادت اپنے ذمہ لے کر طارق نے سب سے پہلے شدونہ پر قبضہ کیا۔
اس کے بعد آگے بڑھ کر قرمونہ جیسے مضبوط شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول
کھینچا تو ایک نیا اور نرالا طریقہ اختیار کیا گیا۔ نواب جولین اپنی یونانی فوج کا دستہ لے
کر بے سروسامان اور بے یارو مددگار ہونے کے عالم میں قرمونہ کی فصیل کے نیچے
پہنچا اور پناہ طلب کی۔ قلعہ والوں نے سمجھا کہ یہ مسلمانوں کے خوف سے لرزاں،
حراساں امان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ چنانچہ قلعہ والوں نے دروازہ کھول کے
جلدی جلدی اُنہیں اندر بلا لیا۔

پھر رات کی تاریکی میں اس دستے نے محافظین کو تہ تیغ کر کے پھاٹک کھول دیئے
اور مسلمان فوج اندر داخل ہو گئی۔ اس طرح طارق بن زیاد نئی فتوحات حاصل کر
رہے تھے۔ اس کے بعد طارق بن زیاد نے ای۔سی۔ جا کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں میڈوز
شدونہ کے بھاگے ہوئے عیسائی سپاہیوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اُنہوں نے ذلت کی
موت پر عزت کی موت کو ترجیح دی اور کھلے میدان میں قسمت آزمائی کی۔ ہر چند کہ
اُن کے دل ٹوٹے ہوئے اور ہمتیں پست تھیں۔ پھر بھی اُنہوں نے کھلے میدان میں
اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا مناسب سمجھا۔ کیونکہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے زیست اُن کے لئے
ناممکن تھی۔

پس وہ سروں کو ہتھیلی پر رکھ کر اور تلواریں سونت کر جنگ کے شعلوں میں کود

پڑے۔ وہ انتہائی بے جگری سے لڑے اور پھر ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ
گئے۔ مرنے کو تو وہ مر گئے مگر مسلمانوں کا بھی بے انتہا نقصان کر گئے۔ وہاں پہلی
مسلمانوں کو بہت کچھ کھونا پڑا جواب تک اسپین کے کسی میدان میں نہیں کھویا تھا۔

یہ شہر مذہب عیسوی کا ایک بڑا مرکز تھا جہاں پادریوں کے علاوہ راہب ا
راہبات ہزاروں کی تعداد میں معبد گاہوں اور خانقاہوں میں خشک اور زاہدانہ زند
بظاہر مقدس مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے نام پر گزارتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ خانقا
عیش و عشرت کے مرکز تھے اور راہبات جن کے حسن کا چرچا دُور دُور تھا، اپنے حسن ا
عزت کی حفاظت کرنے سے معذور تھیں۔ اُن کا کنوار پن ایک دھوکہ تھا، اُن کی مقد
زندگی ایک فریب تھی۔ راہبوں اور پادریوں نے جب مسلمانوں کے وحشی پن کا تذ
کیا اور اُنہیں بتایا کہ اگر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں پڑیں تو ابریشم، دیبا اور حریر
بجائے ٹاٹ کے ٹکڑوں پر لٹائی جائیں گی تو اُن بے چاریوں نے رو رو کے اپنی جانیں
ہلکان کر لیں۔ اُنہوں نے اپنی خوبصورتی ختم کرنے کے لئے اپنے چہروں کو بگاڑ ا
اپنے حسن کو داغدار کیا۔ ایس پی اسکاٹ کہتا ہے کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ ان قزاقوں
مسلمانوں کے دل پسیج جاتے اور اُن کو رحم آ جاتا مگر وہ (مسلمان) اپنے شکار کو ہا
سے نکلتا دیکھ کر غیض و غضب میں بھر گئے۔ اور پھر اُنہیں تہ تیغ کر دیا۔

پتہ نہیں مسٹر اسکاٹ نے یہ نتیجہ کس ماخذ، کس اطلاع کی بنا پر نکالا تھا؟ اگر
حقیقت ہوتی تو عیسائی مسلمانوں کی شرافت کا دم نہ بھرتے۔ اُن کی انسانیت ک
قصیدے نہ گاتے اور اُن کی بلند کرداری اور وسیع النظری کے اُٹھتے بیٹھتے چرچے
کرتے۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو عیسائی اُن (مسلمانوں) کو اپنے عیسائی حکمرانوں
برتر اور افضل نہ سمجھتے۔ اُن کے دلیر اور وسیع القلب ہونے کے راگ نہ الاپتے اور اُ
(مسلمانوں) کے وہاں سے رخصت ہونے پر خون کے آنسو نہ بہاتے۔

اگر مسلمان قزاق، لٹیرے اور راہزن ہوتے تو شاہ وٹیزا کے سارے بیٹوں اور
بھائیوں کو اُن کی جائیدادیں نہ بخشتے۔ اُس کے بھائی کو طلیطلہ کی حکومت سپرد
کرتے۔ راڈرک کے بہادر جنرل تھیوڈومیر (تدمیر) کو پورا مرسیہ کا علاقہ نہ د
ڈالتے۔ یہودیوں کو چھینی ہوئی املاک واپس نہ کرتے۔ مگر مسلمانوں نے اُنہیں شہر

حقوق بخش دیئے۔ گرجاؤں اور عبادت گاہوں کو کوئی گزند نہ پہنچایا۔ مسلمانوں نے
خانقاہوں کے وظیفے اور ٹرسٹ بحال رکھے۔ مکتبوں میں علم کے چراغ روشن رہنے
دیئے۔ مزارعین کو تقاویاں دیں۔ مزدوروں کو اُن کی محنت سے زیادہ مزدوری دی۔
فنکاروں کو بیش بہا معاوضے دیئے۔ پھر بھی اگر وہ قزاق تھے، وہ لٹیرے تھے تو بتایئے
کہ شرافت اور نیک نامی کس چیز کا نام ہے؟

خیال ہے کہ ای۔ سی۔ جا کے مقام ہی پر طارق بن زیاد کو اپنے آقا اور سپہ سالارِ
اعظم موسیٰ بن نصیر کی جانب سے ہدایات ملیں کہ۔

"اب مزید آگے نہ بڑھا جائے اور مسلمانوں کو خطرے سے دوچار نہ
ہونے دیا جائے۔"

بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ موسیٰ بن نصیر کا یہ حکم رشک اور حسد کی بناء پر تھا۔ مگر
یقین کیجئے کہ دل نہیں مانتا۔ کیونکہ سارے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ پھر طارق بن
زیاد، موسیٰ بن نصیر کا غلام نہیں بلکہ اُنہوں نے اسے اپنا بھائی اور بیٹا بنا لیا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ موسیٰ بن نصیر یہ چاہتے تھے کہ اس عظیم الشان ملک کی فتح بھی اُن
کے نام سے منسوب ہو۔ کیونکہ دوسری صورت میں اگر اُنہیں (دشمنوں کو) آرام دیا
جاتا تو یہ اپنے ساتھ دشمنی کے مترادف تھا۔ عیسائیوں کو اپنی حالت درست کرنے کا
موقع دینا مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرنے کے برابر تھا۔ چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد
یہی رائے ہوئی کہ ابھی پیش قدمی بہرصورت جاری رہے اور یہ مسلمانوں کی اور ان
کے آقا امیر المومنین کی سب سے بڑی خدمت تھی۔

ای۔سی۔جا کی حقیقت ایک چوراہے جیسی تھی جہاں سے اُندلس کے بڑے بڑے
شہروں کو راستے جاتے تھے۔ اُس کے ایک طرف قرطبہ تھا تو دوسری طرف ملاغہ۔ اسی
طرح ایک طرف غرناطہ تو دوسری طرف طلیطلہ تھا۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں تھی کہ اسلامی
فوجوں کے سیلاب کو یہاں پر منجمد کر دیا جائے اور اتنے بڑے بڑے شہروں کو
عیسائیوں کے قبضے میں رہنے دیا جائے تاکہ وہ اپنی گری ہوئی عظمت و اقبال کی
دیواروں کو سنبھال لیں اور اپنی بنیادوں کو مضبوط کر لیں۔

چنانچہ طارق بن زیاد ایک دستہ فوج لے کر قرطبہ کی جانب بڑھے۔ مغیث الرومی

اُن کے ساتھ تھے۔فوج کا دوسرا دستہ زید بن کسادہ کی سرکردگی میں جنوب کی طر
روانہ کیا۔قرطبہ کی فصیل بے حد مضبوط اور دیواریں بہت مستحکم تھیں۔ طارق بن ز
نے نو دن تک قرطبہ کا محاصرہ کئے رکھا مگر یہ مصلحت آمیز نہ سمجھتے ہوئے طلیطلہ کا ر
کیا اور مغیث الروی کو وہاں کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔

جب طارق نے آگے قدم بڑھائے تو عیسائی بہت خوش ہوئے کہ وہ اس بچی
فوج کو مار گرائیں گے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ حق ہمیشہ حق کے ساتھ ہوتا ہے اور تا
ایزدی، سچائی کے ساتھ۔ چنانچہ طارق بن زیاد کو وہاں کا ایک چرواہا مل گیا۔ اُس
اشارہ کیا کہ وہ قلعہ میں داخلے کا راستہ بتائے گا۔

طارق اُس چرواہے کو ساتھ لے آئے اور اُسے پیشکش کی کہ اگر اُس نے قلعہ
داخلہ کا کوئی آسان اور سہل راستہ بتایا تو اُسے منہ مانگا انعام ملے گا۔ چرواہے
درخواست کی کہ اگر اس کے بتائے ہوئے راستے سے مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے
وہ اسے (چرواہے کو) اپنی فوج میں ملازم رکھ لیں گے۔ طارق نے اُسے اُسی وق
سے لشکر کے باورچی خانہ کا ناظم مقرر کر دیا۔

پھر ایک شب جب انتہائی طوفان آیا ہوا تھا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا
گیا تھا، مسلمانوں نے اسے امدادِ غیبی سمجھا۔ مغیث چند چست و چالاک سپاہی لے
دریا عبور کر کے اُس حصہ میں پہنچ گئے جہاں دیوار کمزور تھی۔ وہاں ایک انجیر کا درخ
تھا جس کے سہارے سپاہی اُوپر چڑھ گیا اور پھر اپنا صافہ لٹکا کر دونوں کو بھی اُوپر
لیا۔ شدید طوفان کی وجہ سے محافظ مورچے چھوڑ کر اِدھر اُدھر پناہ لینے چلے گئے ہو
تھے۔ پس مغیث کے سپاہی مورچوں پر قبضہ کرتے ہوئے اور بازاروں کو پار کر
پھاٹک تک پہنچ گئے۔ وہاں اُنہیں کچھ قتل و غارت کرنا پڑی۔ پھر اُنہوں نے محافظ
کو قابو میں کر کے پھاٹک کھول دیا اور بقیہ فوج بھی اندر پہنچ گئی۔ ابھی صبح ہونے
نہ پائی تھی کہ "قرطبہ" مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ وہاں کا گورنر اپنے چا
سپاہیوں اور اسکاٹ کے مطابق چار سو سپاہیوں کے ساتھ گرجا میں جا کر چھپ گیا۔

اس مضبوط گرجا کی کیفیت بھی کسی قلعہ سے کم نہ تھی۔ اُس کے چاروں طرف
خندق تھی۔ اُس کے قریب ہی پانی کا چشمہ تھا جو اندر پانی پہنچاتا تھا۔ وہاں جنس کی

کمی نہ تھی۔ دیواریں بے انتہا مضبوط تھیں اور اُن پر مورچے قائم تھے۔ اس کے اندر وہ
کسی بھی محاصرے کی سختی برداشت کر سکتے تھے اور مقابلہ بھی کر سکتے تھے۔ مغیث نے
بلاشرط اطاعت قبول کرنے پر اماں کا وعدہ کیا اور دروازے کھول دینے پر تحفظ کا یقین
دلایا۔ مگر اِدھر یہ بات ایک کان سے سنی گئی اور دوسرے کان سے اُڑا دی گئی۔ محاصرہ
پورے تین ماہ برقرار رہا۔ پھر وہ راستہ دریافت کر لیا گیا جو اندر پانی پہنچاتا تھا۔

اس طرح محصور پیاس سے تڑپنے لگے۔ جب پیاس کی شدت بڑھی اور بھوک نے
الگ تنگ کرنا شروع کر دیا، تو اُنہیں سوائے سرِ تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نظر نہ
آیا۔ پس گورنر گرفتار ہو کر قید ہوا۔ دوسرے سپاہی وغیرہ رہا کر دیئے گئے اور انعام و
اکرام کے مستحق قرار پائے۔ باغیوں کے ساتھ جب یہ سلوک تھا تو کمزوروں،
معصوموں کو رحم کے قابل کیوں نہ قرار دیا جاتا؟ بچوں اور بے کس و بے چاری عورتوں
کی عزتیں محفوظ رکھی گئیں۔



جس وقت زید بن کسادہ کو جنوب کی طرف روانہ کیا گیا تھا۔ اُس وقت کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ مسلمان بعد میں پہنچتے تھے مگر اُن کی دہشت، خوف اور لرزہ پہلے پہنچ جاتا تھا۔ چنانچہ پہلے باجہ فتح ہوا۔ اس کے بعد این۔ ٹی۔ کیورا اور پھر ایلویرا جو غرناطہ کے نواح میں تھا، فتح ہوئے۔ مگر اہلیانِ غرناطہ نے سرِ اطاعت خم نہ کیا۔ چنانچہ میدانِ جنگ آراستہ ہوا۔ طبلِ جنگ بج اُٹھا۔ ہتھیار ایک بار پھر ٹکرائے اور مسلمانوں نے ایک بار پھر فتح و کامرانی کے شادیانے بجائے۔ اس کے بعد مالقہ پر زور آزمائی ہوئی اور یہ بھی اسلامی مقبوضات میں شامل ہو گیا۔ فوج کی کمی کی وجہ سے ہر جگہ محافظ دستے نہ چھوڑے جا سکتے تھے۔ پس وہاں عرب حاکم مقرر کئے گئے۔ ان حاکموں کی مجلس مشورت میں بلا تخصیص یہودی اور عیسائی دونوں ہی شامل کئے گئے۔ اُس وقت غرناطہ میں یہودی ہی یہودی تھے۔ چنانچہ اُن کی مدد، انتظامی امور اور فوجی امور دونوں میں حاصل کی گئی۔

اب زید بن کسادہ گراں بہا تحفہ جات، بیش قیمت جواہرات اور لا تعداد کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ طارق بن زیاد سے ملنے کے لئے طلیطلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چلتے چلاتے اُنہوں نے جین JAEN کو بھی فتح کر لیا۔

□ ...... □

جب وادی بکّا کی جنگ کو آٹھ ماہ گزرے تو طارق بن زیاد اپنی فوجوں کے ساتھ دارالسلطنت اسپین یعنی طلیطلہ جا پہنچے۔ طلیطلہ کا شہر دریائے ٹیکس پر بہت بلندی پر آباد تھا۔ اس شہر یعنی دارلسلطنت کو قومِ گاتھ کے ہر بادشاہ نے ناقابلِ تسخیر بنانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے تھے۔ خاص کر اسپین کا بادشاہ ویمبا جو جنگی آلات اور دیگر امور میں بہت دخل رکھتا تھا، اُس نے دارالسلطنت کو مضبوط سے مضبوط تر

بنانے کی طرح طرح کی کوششیں اور انتظامات کئے تھے۔ خود دریائے ٹیکس، دارالسلطنت کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک بہت گہری جھیل تھی جو چٹان کھود کر نکالی گئی تھی۔ اس جھیل کا پانی دریائے ٹیکس میں بڑے شور کے ساتھ گرتا تھا۔ اس کی فصیل دوہری تھی اور پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چٹانیں کی چٹانیں اور پہاڑ کے پہاڑ فصیل میں جڑ دیئے گئے ہیں۔ جس طرف دریا کا زور زیادہ تھا اُس طرف فصیل کی اُونچائی بھی بلند سے بلند تر رکھی گئی تھی۔ پھر ایک گڑھا بھی تھا جو اس قدر گہرا تھا کہ اُس میں لمبی سے لمبی سیڑھی بھی لگائی جائے تو فصیل تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ شمال کی طرف جو راستہ جاتا تھا اُس پر لوہے کے خاردار تار بچھے ہوئے تھے جس پر سے گھوڑے اور انسان بغیر زخمی ہوئے نہیں گزر سکتے تھے۔

یہ گاتھ قوم کا پایۂ تخت کاہے کو تھا بلکہ ایک ایسا قلعہ تھا جس کی فتح کا خیال بھی محال تھا۔ جب موت سے بازی لگانے والے، خطروں کو خاطر میں نہ لانے والے، مشکلات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھنے والے سرپھرے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں طلیطلہ پہنچے تو اُس کی اُونچی اُونچی دیواریں، مضبوط فصیل اپنی مضبوطی اور بلندی کا اعلان کر رہی تھی۔ شہری بھاگ بھاگ کر شہر جلیقہ میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ کچھ استولایا میں پہنچ کر خود کو محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اہالیانِ کلیسا نے گرجاؤں کے خزانے تہہ خانوں میں دفن کر دیئے تھے اور خود کشتیوں کے ذریعہ روم بھاگ چکے تھے۔ پادریوں اور راہبوں کا ایک گروہ بامر مجبوری وہاں پڑا رہ گیا تھا یا پھر کچھ ایسے دہقان جو آفتِ ناگہانی سے بچنے کے لئے ہتھیاروں کی بجائے دُعاؤں کا سہارا لے رہے تھے...... مگر......

مگر ابھی اُن کی دُعائیں بلند بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ مسلمانوں کے بلند نیزے ہوا میں لہراتے نظر آنے لگے۔ اُن کی تلواروں کی تابندگی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرنے لگی۔ اُن کے پرچم دلوں پر ہیبت طاری کرنے لگے۔ اُن کے عمامے قلب و جگر کو تھرانے لگے۔ محافظ فوج کہاں تھی جو مدافعت کرتی۔ اسکاٹ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے قرب و جوار کی بستیوں میں آگ لگائی۔ لہلہاتے کھیتوں کو روند ڈالا۔ انسانوں کو قتل کر دیا۔ مکانوں اور گرجاؤں کو آگ لگا دی گئی۔

پھر اسکاٹ کے بقول مسلمانوں نے معمولی شرائط پیش کیں جو بلا پس و پیش قبول

کر لی گئیں۔ جن لوگوں نے شہر چھوڑنا چاہا اُنہیں جانے کی اجازت مل گئی۔ مگر اُن کی جائیدادوں اور مقبوضہ جات کو ضبط کرلیا گیا۔ جن لوگوں نے شہر میں رہنے کا ارادہ کیا اُنہیں معمولی ٹیکس کے عوض اجازت مل گئی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو رسومات کی ادائیگی کی پوری آزادی دی گئی۔

ڈاکٹر کونڈے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے مذہبی رسوم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی۔ ہاں، نئے گرجا اور خانقاہیں بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مسلمان ہونے والوں کو بے انتہا رعایتیں دی گئیں۔ کسی کا مذہب جبراً تبدیل نہیں کیا گیا۔ کسانوں سے اُن کی کھیتیاں نہیں چھینی گئیں نہ دُکانداروں کی دُکانیں بند ہوئیں۔ جب فاتحین کا یہ فیاضانہ رویہ تھا تو پھر قتل و غارت کیوں کی جاتی؟ بھاگنے والے اپنے ساتھ جو کچھ لے جا سکتے تھے، لے گئے۔

اس فتح میں مسلمانوں کے ہاتھ جو کچھ لگا اس کا نہ کوئی اندازہ ہے اور نہ کوئی شمار۔ اور یہ تمام مالِ غنیمت صرف گھروں، بنگلوں اور محلوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ جو گھر آباد تھے وہ گھر ویسے کے ویسے رہے۔ بربروں کے ہاتھ صدیوں کا جمع شدہ سونا، چاندی، ریشم، جواہرات، نیلم، پکھراج، زمرد، زبرجد اور یاقوت، زرنگار، مرصع تھان، پردے، کلیسا میں جمع کی ہوئی دولتوں کے انبار لگ گئے۔

اس سامان میں ایک بیش قیمت کپڑا ملا جس کے حاشیے پر سنہری کام تھا، جس میں نیلم اور زمرد ٹکے تھے۔ اس کے جواہرات توڑ لئے گئے اور سنہری حصہ کاٹ لیا گیا۔ ایک بڑا سونے کا پیالہ جو لبالب سچے موتیوں سے بھرا ہوا تھا، اس کے علاوہ بادشاہوں کے تاج دستیاب ہوئے۔ تاجوں پر بہترین کام بنا ہوا تھا اور قسم قسم کے پتھر ٹکے ہوئے تھے۔ سونے چاندی کی زنجیریں، کٹے ہوئے ہیرے، ترشے ہوئے نگینے، مرصع تلواریں، انتہائی قیمتی زرہ بکتر...... محلِ شاہی میں ایک پورا کمرہ دولت سے بھرا ہوا تھا جس کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اُسے گنا نہیں جا سکتا۔

دارالخلافہ پر قبضہ ہوتے ہی یہودیوں کو وقتی طور پر نگران بنایا گیا اور طارق بن زیاد خود الحجارہ کی طرف بڑھے۔ یہ پورا علاقہ پہاڑی تھا جس سے گزرنا آسان نہ تھا۔ ایک تنگ راستے سے فوج گزری جسے طارق کے نام پر ''فجِ طارق'' کہتے ہیں۔

طارق ''مائرہ'' پہنچے تو وہاں چند مقررین گرفتار ہوئے۔ اُن سے ایک میز، ایک رحل اور اُس پر رکھی ایک کتاب ملی جو مقدس گرجا کی ملکیت تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے منسوب کی جاتی تھی۔ یروشلم کی لوٹ میں یہ میز ٹیٹس TITUS کے ہاتھ لگی تھی۔ یہ خالص سونے سے بنائی گئی تھی اور اِردگرد یاقوت، نیلم، زمرد وغیرہ جڑے تھے۔ وہاں یہ رسم تھی جو بادشاہ تخت پر بیٹھتا وہ اس کی عظمت اور برکت کے لحاظ سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا تھا۔ اس میز کے چاروں پائے زبرجد کے تھے اور سر تا پا زمرد میں غرق تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب جواہرات کا ایک ٹکڑا ہیں۔ اس کی قیمت کا اندازہ پانچ لاکھ اشرفیوں سے بھی زیادہ تھا۔

حائرہ کے بعد طارق بن زیادہ مآبہ پہنچے، پھر وہاں سے حلیقیہ۔ ابھی وہ یہیں تک پہنچے تھے کہ اُنہیں خبر ملی کہ موسیٰ بن نصیر آ پہنچے ہیں۔ یہ سن کر وہ اپنے آقا اور اپنے وائسرائے کا استقبال کرنے کے لئے طلیطلہ لوٹ آئے اور یہیں وہ موسیٰ بن نصیر کا انتظار کرنے لگے۔

طلیطلہ پر قبضہ طارق بن زیاد کا آخری زمانہ کا واقعہ تھا۔ وہاں سے مال و دولت کی بے شمار مقدار ہاتھ لگی۔ اور جو اب تک گاتھ سلاطین کا پایۂ تخت تھا، وہ کلمہ پڑھنے والوں کا مسکن بن گیا۔

مغیث الرومی جو حدود قرطبہ میں تھے، وہ قرطبہ کی فتح کے بعد آرچی ڈونہ، پھر مرسیہ کی جانب رجوع ہوئے۔ یہ علاقہ بھی پہاڑی تھا۔ تھیوڈومیر جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، وہ یہاں کا گورنر تھا۔ اُس نے پہلے بھی اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا اور اب بھی جہاں تک ہو سکا مسلمانوں کے مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ مگر کہاں تک...... اُس کی فوج کے حوصلے تو پہلے ہی پست تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو اُس کے کچھ فوجی قتل ہوئے، کچھ فرار ہو گئے۔ وہ بھی اپنے ایک غلام کے ساتھ بھاگا اور اُنہوں نے اوری ہیولا ORI HUELA میں جا کے پناہ لی۔ وہاں سوائے چند بچوں اور عورتوں کے کوئی نہ تھا۔

تھیوڈومیر آدمی ذہین تھا۔ وہ یوں آسانی سے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک انوکھی چال چلی۔ اُس نے تمام عورتوں کو جنگلی لباس پہنا کر اور اُن کے بالوں کو سرخ رنگ کر، اُنہیں داڑھیوں کی شکل میں کر دیا۔ پھر اُن سب کو قطار بنا کر

فصیل کے اُوپر کھڑا کر دیا۔ یہ دُور سے مرد سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ مسلمان قلع
فصیل پر سپاہیوں اور محافظوں کی قطاریں دیکھ کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ قلعہ
اُوپر اور اندر دشمن کی بہت فوج ہے اور اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

دوسری طرف چالاک اور عیار تھیوڈومیر نے یہ کیا کہ شام ہوتے ہی اور تار
پھیلتے ہی وہ اپنے ایک غلام کے ساتھ سفید جھنڈا ہاتھ میں پکڑے قلعہ سے باہر آیا
جھنڈے اور غلام کو ساتھ لئے سیدھا مسلمانوں کے سپہ سالار کے خیمے پر پہنچ گیا۔

سپہ سالار کے خیمے کے پہریداروں نے اُسے روک لیا اور دریافت کیا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

تھیوڈومیر نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔

”تم دیکھتے نہیں ہمارے ہاتھ میں امن کا جھنڈا ہے۔ ہم حاکم شہر کی طرف سے
کا پیغام لے کر آئے ہیں۔“

ایک دربان نے کڑک کے پوچھا۔

”تم کیا شرائط لے کر آئے ہو......؟“

”ہم تمہیں نہیں بتا سکتے ——“ تھیوڈومیر نے جواب دیا۔ ”ہمیں اپنے سپہ سالا
کے سامنے پیش کرو۔ ہم اُنہی کو شرائط بتائیں گے۔“

”ٹھیک ہے ——“ دربان نے جواب دیا۔ ”مگر ہمیں کچھ تو بتاؤ! تاکہ ہم اپ
سردار کے سامنے تمہیں پیش کر سکیں۔“

تھیوڈومیر نے اکڑ کے کہا۔

”اچھا۔ ہم تمہیں کچھ شرطیں بتاتے ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ شہر کو اپنی مضبوطی پر نا
ہے اور حفاظت کی تمام ترکیبیں ہمارے استعمال میں ہیں۔ اس لئے کشت و خون
کوئی فائدہ نہیں۔“

”اور آگے بیان کرو!“ دربان کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا۔

جھنڈا لانے والوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ بولے۔

”باقی باتیں اور شرطیں ہم تمہارے سردار کو پیش کریں گے۔ ہمیں اُن کے پا
لے چلو۔“

چنانچہ صلح کا پیغام لانے والوں کو طارق بن زیاد کے حضور پیش کیا گیا۔

طارق بن زیاد کے دریافت کرنے پر وفد نے بتایا۔

”اے مسلم سردارِ اعلیٰ! حاکم شہر کا ارشاد ہے کہ شہر کو اپنی مضبوطی پر ناز ہے اور
حفاظت کی تمام ترکیبیں استعمال میں ہیں۔ مگر کشت و خون سے کوئی فائدہ ہوتے نہ
دیکھ کر حاکم شہر کا خیال ہے کہ اگر آبادی کو صحیح و سالم گزر جانے دیا جائے اور اُن کے
مال و اسباب سے تعرض نہ کیا جائے تو وہ کل صبح شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔“

یہ شرطیں قبول کر لی گئیں۔ جب مغیث نے معاہدے پر اپنی مُہر ثبت کر دی تو
معاہدہ پیغام لانے والوں کے حوالے کیا گیا کہ وہ حاکم شہر کے دستخط کرا لائے۔

اُسی وقت تھیوڈومیر نے معاہدہ لے کر خود اُس پر دستخط کئے اور اپنی اُنگلی سے
انگشتری اُتار کر مُہر ثبت کر دی اور کہا۔

”میں خود حاکم شہر ہوں۔“

اور تمام لوگ اُس کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

صبح کو جب شہر کے پھاٹک کھلے تو مسلمانوں نے دیکھا کہ اُن میں ایک بھی مرد یا
جوان نہیں تھا اور نہ کوئی فوجی تھا۔ تھیوڈومیر سے پوچھا گیا۔

”وہ فوج اور سپاہ کیا ہوئی؟“

تھیوڈومیر نے جواب دیا۔

”شہر کے اندر ایک بھی سپاہی یا جوان مرد نہ تھا۔ وہ سب یہی عورتیں تھیں جو اس
وقت اپنا مال و اسباب لئے شہر سے کوچ کر رہی ہیں۔“

مغیث اُس کی جرأت اور ہمت پر حیران رہ گئے۔ اُنہوں نے ایسے سمجھدار انسان
کو ہاتھ سے کھونا ٹھیک نہیں سمجھا اور مرسیہ کا پورا علاقہ تھیوڈومیر کی گورنری میں دے دیا
اور وہ آج بھی تھیوڈومیر یا تدمیر کے نام سے موسوم ہے۔



طارق بن زیاد مسلسل فتوحات حاصل کر رہے تھے اور اپنی کامیابی کی خبروں سے اپنے آقا اور استاد کو باخبر رکھ رہے تھے۔ موسیٰ بن نصیر ان فتوحات سے خوش تو ہوئے مگر اُنہیں اس بات پر غصہ بھی آتا کہ جب انہوں نے طارق کو مزید پیش قدمی سے روک دیا ہے تو وہ آگے ہی آگے کیوں قدم بڑھا رہے ہیں؟ فتح اسپین دراصل موسیٰ بن نصیر کا ایمان تھا اور وہ اسے اپنے اور صرف اپنے نام سے معنون کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے طارق کی اس حکم عدولی پر سزا دینے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔

پس موسیٰ بن نصیر 93 ہجری مطابق 712ء میں موسم گرما میں آبنائے جبرالٹر پار کے نواب جولین اور اٹھارہ ہزار سواروں کے ساتھ جزیرۃ الخضر کے علاقے میں لنگر انداز ہوئے۔ موسیٰ کے ساتھ عرب معززین، بعض صحابہ اور بعض صحابہ کی اولادیں اور افریقہ کے منتخب جانباز تھے۔ پہلے اُنہوں نے میڈونہ سوڈیقہ جہاں پہلے طارق بن زیاد کے قدم بھی پہنچ چکے تھے کو فتح کیا، پھر قرمونہ کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ علاقہ طارق کی روانگی کے بعد بغاوت کر کے خود مختار بن بیٹھا تھا۔ موسیٰ بن نصیر کی رہنمائی نواب جولین کر رہا تھا۔ قرمونہ نے پہلے کی طرح فوراً شکست تسلیم کر لی اور یہ شہر ایک بار پھر بغیر جنگ کے مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اب انہوں نے اشبیلیہ کا رُخ کیا۔

اشبیلیہ کا بہت خوبصورت اور دولت مند شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی فصیلیں بھی بہت مضبوط تھیں۔ یہاں کی شادابی دلوں کو بھاتی تھی۔ اشبیلیہ کی عظمت کی داستانیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ یہاں ایک ماہ تک جنگ ہوتی رہی مگر فتح حاصل نہ ہو سکی۔ پھر محاصرہ اور سخت کر دیا گیا اور ہر قسم کی خونریزی کو جائز قرار دیا گیا۔ آخر اہلیان اشبیلیہ کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ اگرچہ مسلمانوں کا بھی کافی نقصان ہوا مگر انہیں آخر کار فتح حاصل ہوئی۔ یہی شہر آگے چل کر کچھ دنوں کے لئے اسلامی مملکت کا

دارالسلطنت بھی رہا۔

پھر جون 713ء میں یہاں محافظ فوج چھوڑ کر ''مریڈا'' کی طرف اسلامی فوجیں روانہ ہوئیں۔ مریڈا اُس وقت اسپین کے عظیم شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی مضبوطی پر رومیوں اور قوطیوں دونوں نے بہت توجہ دی تھی۔ یہاں کی عمارتیں پُرشکوہ اور فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھیں اور یہاں کی عبادت گاہیں دولت سے پُر تھیں۔ رفاہِ عامہ کے لئے بہترین انتظامات تھے۔ شاہانِ روم نے یہاں ایسی عمارتیں بنوائی تھیں جو روم میں بھی نہ تھیں۔ دریائے دادیانہ پر بڑے بڑے پُل بنے تھے۔ پُل اُونچے اور محراب دار دروں پر قائم تھے۔ جن کے نیچے دریا کا پانی ٹھاٹھیں مارتا گزرتا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ پُل کی بنیادیں ریت کے اندر رکھی گئی تھیں جس کے دھنسنے سے کسی وقت بھی اس کے شکست ہونے کا اندیشہ تھا۔ مگر وہ اندیشہ صرف اندیشہ ہی رہا۔

یہاں کے باسی قرطبہ اور طلیطلہ کے رئیسوں سے کم نہ تھے، بلکہ دولت کی فراوانی میں کچھ زیادہ ہی تھے۔ اس شہر میں گرجے اور کلیسا بہت مضبوط اور خوبصورت بنائے گئے تھے۔ یہ شہر ایک طرح سے مذہبی مرکز تھا۔ یہاں کا بطریق طلیطلہ کے بطریق سے زیادہ شان و شوکت والا تھا۔ جب اُس کا جلوس نکلتا تو ایک ہزار سے زیادہ ملازم رنگ برنگ، زرق برق اور مرصع وردیاں پہنے جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور جلوس کی شان کو دوبالا کرتے تھے۔ ایسے جلوس اکثر نکلتے تھے کہ لوگوں کے دلوں پر بطریق کی عظمت کا رُعب پڑتا رہے۔

ان تمام ظاہری اور نمائشی چیزوں کے باوجود یہاں کے لوگ باہمت اور جرأت و شجاعت کے پیکر تھے۔ انہوں نے ان ڈھیلی ڈھالی قباؤں اور لمبی لمبی داڑھی والوں کو دیکھ کر نہ تو خوف کھایا اور نہ اُن میں کوئی وسوسہ پیدا ہوا۔ وہ بڑی مستعدی سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے پہلے شہر بند ہو کر مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ صبح کو وہ مسلح ہو کر میدان میں نکلتے، دن بھر بہادری اور شجاعت کے کارنامے دکھاتے اور سورج غروب ہوتے ہی وہ اپنے قلعہ میں گھس جاتے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک یونہی چلتا رہا۔ محاصرین تھکے جا رہے تھے اور سپاہیوں میں نا اُمیدی پھیل رہی تھی۔ مگر اُن کے سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے حوصلے ویسے ہی تر و تازہ تھے۔ پھر موسیٰ بن نصیر

نے شہر کی ناکہ بندی کر دی۔ نہ کسی کو شہر سے باہر آنے کی اجازت دی نہ اندر جا
کی۔ سامانِ رسد بھی اندر جانے سے روک دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ دشمن سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر بھوک و پیاس سے کیونکر مقابلہ
جائے۔ آخر تنگ آ کر صلح کی شرطیں پیش کی جانے لگیں۔ مگر شرائط پیش کرنے کا انداز
اس قدر بے تکا تھا کہ موسیٰ بن نصیر کو یہ ناگوار گزرا اور اُنہوں نے محاصرہ بدستور جاری
رکھا۔ آخر کار اہل مریڈا بری طرح مجبور ہو گئے اور ہر شرط پر صلح کرنے پر آمادہ نظر
آنے لگے۔ آخر شرائط طے پا گئیں۔ معاہدہ لکھا گیا۔ شہر مسلمانوں کے حوالے کر
گیا۔ یہاں سے فاتحین کے ہاتھوں بے پناہ دولت آئی۔ اس دولت میں ایک عظیم ہیرا
تھا جس کی چمک دمک نے نہ صرف لشکریوں کی بلکہ فاتح لشکر کے عظیم سردار موسیٰ بن
نصیر کے ولی عہد (بڑے بیٹے) عبدالعزیز بن موسیٰ کی آنکھیں کچھ اس طرح خیرہ کیں
کہ اُسے ہر طرف وہی ہیرا چمکتا دمکتا دکھائی دینے لگا۔ اور یہ ہیرا تھا اُندلس کے ڈوب
مرنے والے یا ڈبو دیئے جانے والے شاہ راڈرک کی معصوم اور کمسن بیوہ ملکہ ایے
جی۔ لونا جس نے فاتح مریڈا موسیٰ بن نصیر کے فرزند ارجمند کو پہلی ہی نظر میں شکار کر
لیا۔

یہاں پر شاہ راڈرک کی موت پر دو چار جملے کہنا غیر ضروری نہیں بلکہ ضروری نظر آ
جاتا ہے۔ تاریخیں اس سلسلے میں صرف یہاں تک رہنمائی کرتی ہیں کہ آخری جنگ
میں شاہ راڈرک خود فوجوں کی کمان کر رہا تھا اور پورے میدان میں شمشیر چمکاتا نظر آ
تھا۔ عیاش آدمی عام طور پر بزدل ہوتے ہیں مگر شاہ راڈرک کو کسی نے بزدل نہیں
لکھا۔ وہ خود فوج کی کمان کر رہا تھا مگر شکست کے بعد اُس کی تلاش ہوئی تو دریا کے
کنارے اُس کا گھوڑا اور جوتوں کا جوڑا دستیاب ہوا۔ عام خیال یہ ہے کہ راڈرک
شکست کے بعد شرم کے مارے دریا میں کود کر ڈوب مرا۔ مگر وہ بادشاہ تھا، اُس کی لاش
کو بہت تلاش کیا گیا مگر کہیں سے نہ ملی اور نہ کوئی سراغ ہی ملا۔

جب شہر مسلمانوں کے حوالے ہوا اور وہاں امن و امان ہو گیا تو اہالیانِ شہر کا ایک
وفد مسلم سپہ سالار موسیٰ بن نصیر سے ملاقات اور اظہارِ اطاعت کے لئے آیا۔ وفد کا
سربراہ تو مریڈا کا ایک شخص تھا مگر وفد کا تعارف کرانے اور دیگر گفتگو کے سلسلے میں

نواب جولین اس وفد کے ساتھ تھا۔ نواب جولین ہی دراصل اندلس پر حملے کا ذمہ دار
تھا۔ کیونکہ وہ فلورا کا باپ تھا جس کی عصمت پر سابق شاہ راڈرک نے حملہ کیا تھا جس
کے جواب میں نواب جولین اپنی فریاد لے کر مسلمان سردار موسیٰ بن نصیر کے پاس گیا
تھا اور اُندلس پر حملے کے آغاز سے اب تک وہ مسلم سردار ہی کے ساتھ ساتھ تھا۔ بلکہ
حقیقت میں مسلم لشکر کی رہبری کر رہا تھا۔

مسلمان سردار موسیٰ بن نصیر کی اس دعوت استقبالیہ میں حکومت مریڈا کے تمام حکام
کے علاوہ دیگر علاقوں سے آئے ہوئے لوگ بھی شریک کئے گئے تھے بلکہ وہ خود کوشش
کر کے استقبالیہ میں اس لئے آئے تھے کہ وہ مسلم حملہ آور سپہ سالار سے پہلے ہی
متعارف ہو جائیں تا کہ اُن کے علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے محفوظ
رہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ اس استقبالیہ میں مفتوحہ اور غیر مفتوحہ اُندلس کے
تمام بڑے بڑے سردار اور اہم شخصیات شامل تھیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

اندلس میں یہ ایک بہت بڑا استقبالیہ تھا اور مخالف اور موافق دونوں طرف کے
حکام کی یہ کوشش تھی کہ اُنہیں اس استقبالیہ میں شرکت کی دعوت دی جائے تا کہ مریڈا
کی تمام اہم شخصیات اپنے نئے آقا یا آقاؤں سے کم از کم متعارف تو ہو جائیں۔ مگر
اُس وقت لوگوں کو بہت نا اُمیدی ہوئی جب اُنہیں بتایا گیا کہ استقبالیہ میں مسلم سپہ
سالار موسیٰ بن نصیر شریک نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ بہت مصروف ہیں۔ موسیٰ بن نصیر کی یہ
مصروفیت محض ایک بہانہ تھی۔ وہ دراصل غیر مسلموں سے گہرے تعلقات پیدا نہیں کرنا
چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اجنبیوں سے میل جول، فوجیوں کے رعب داب
کو ختم کر دیتا ہے۔

اسی لئے موسیٰ بن نصیر نے استقبالیہ میں اپنی بجائے اپنے فرزند اکبر عبدالعزیز کو
بھیجا تھا۔ نوعمر اور آرزوؤں اور اُمنگوں سے بھرپور نوجوان عبدالعزیز بڑی خوبیوں کا
مالک سردار یا فوجی تھا۔ عبدالعزیز کو رزم اور بزم دونوں طرح کے اجتماعات سے دلچسپی
تھی۔ وہ فوجیوں کی طبیعت کے خلاف ہر شخص سے بہت جلد گھل مل جاتا تھا مگر اُس
کے مزاج کی سختی ہر موقع پر برقرار رہتی تھی اس لئے لوگ اُس کے رعب داب سے
ڈرتے تو تھے مگر اُس کے قریب جاتے گھبراتے نہیں تھے۔

مختصر یہ کہ مریڈا کے قلعہ میں استقبالیہ محفل یا مجلس سج گئی۔ مسلمانوں کے طو
محاصرے نے اہالیانِ مریڈا کو مضمحل اور افسردہ کر دیا تھا چنانچہ وہ اس محفل میں جوق
در جوق شریک ہوئے۔ مہینوں کے بعد اُنہیں یہ خوشی نصیب ہوئی تھی۔ اس عظیم شا
محل میں جو شخص سب سے زیادہ خوش تھا اور چہک رہا تھا وہ نواب جولین تھا۔ اُس نے
مہمانوں کا میزبانوں سے تعارف کا کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی اِدھر کبھی
اُدھر ہر جگہ چہکتا دکھائی دیتا تھا۔ شاہ اُندلس راڈرک نے اُس کی عزت اُتاری تھی اور
قدرت نے راڈرک کو دریا بُرد کر کے اُس سے بدلہ لے لیا تھا۔ اس لئے اب وہ اور
زیادہ خوش تھا۔

اس وقت محفل کی تمام کرسیاں اور صوفے بھر چکے تھے اور تل رکھنے کو جگہ نہ رہ گئی
تھی۔ ٹھیک اُسی وقت میر محفل یعنی موسیٰ بن نصیر کا ولی عہد عبدالعزیز محفل میں
ہوا۔ اُس کے ساتھ نواب جولین تھا جو ہر مہمان کا تعارف میر مجلس یعنی عبدالعزیز سے
کرا رہا تھا۔ محفل کھچا کھچ مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک طرف مرد حضرات اور
دوسری طرف خواتین زرق برق لباس میں ملبوس چہکارے بھرتی نظر آ رہی تھیں۔

نواب جولین نے میزبان کا تعارف پہلے مردوں سے کرایا۔ نواب ہر مہمان کے
سامنے چند لمحے ٹھہرتا، وہ مہمان کا پورا شجرۂ نسب بیان کرتا، پھر میزبان مسکرا کر مہمان
کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا، دونوں مہمانوں اور میزبانوں کے ہاتھ ایک
لمحے کے لئے ملتے، دونوں ہی مسکراتے، پھر ہاتھ الگ کر کے میزبان اور تعارف
کرانے والا نواب جولین آگے بڑھ جاتے۔ چونکہ مہمانوں سے دونوں بڑے ہال کھچا
کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ایک ہال میں مرد حضرات اور دوسرے میں خواتین بیٹھی تھیں
اس لئے اس تعارف میں کافی دیر لگی۔ صرف مردوں کے تعارف میں تقریباً ایک گھنٹہ
لگ گیا۔ اس کے بعد خواتین کا نمبر آیا۔

خواتین بڑی بے چینی سے میر محفل یعنی جواں عمر و جواں سال عبدالعزیز فرزند
سردار موسیٰ بن نصیر سے ہاتھ ملانے کے لئے بے قرار تھیں۔ جب مردوں کا تعارف ختم
ہوا تو نواب جولین، عبدالعزیز کو ساتھ لئے زنانہ محفل کی طرف گیا۔ نواب جولین ہر
خاتون کو ذاتی طور پر جانتا تھا اس لئے وہ ہر خاتون کی عبدالعزیز سے تفصیل بیان کرتا۔

پھر اگر خاتون مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتی تو عبدالعزیز اُس سے مصافحہ کرتے اور اگر
خاتون مصافحہ کرنے سے گریز کر کے صرف مسکراتی تو عبدالعزیز بھی مسکراتے ہوئے
آگے بڑھ جاتے۔

درجنوں بلکہ سینکڑوں خواتین سے تعارف کراتے کراتے جولین ضرور تھک گیا ہو
گا۔ مگر وہ ابھی جوان تھا اس لئے اُس نے تھکن اور بے دلی کا اظہار چہرے سے نہ
ہونے دیا اور پوری دلچسپی سے تعارف کرانے میں منہمک رہا۔ پھر وہ ایک خاتون کے
سامنے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر نواب جولین نے پہلے اُس خاتون کو ادب سے سلام
کیا، پھر جواں عمر عبدالعزیز سے اس طرح مخاطب ہوا۔

"اب میں نواب زادے عبدالعزیز کا تعارف محفل کی ایک ایسی خاتون سے کرا رہا
ہوں جن کی شخصیت، عزت اور حرمت و شہرت کو اس محفل کی کوئی اور ہستی نہیں پہنچتی۔"

فرزند موسیٰ بن نصیر یعنی عبدالعزیز نے پہلے نواب جولین کو حیران نظروں سے
دیکھا، پھر اُن کی نظریں اُس خاتون پر آ کر رُک گئیں جس کا اب اُن سے تعارف کرایا
جانا تھا۔ وہ ایک چندے آفتاب، چندے ماہتاب، شکل و صورت اور اکہرے بدن کی
ایک لڑکی سی تھی جسے خاتون کہنا مشکل تھا۔ کیونکہ وہ عمر میں بھی بہت ہلکی تھی، کم عمر اور
الہڑ تھی۔

عبدالعزیز نے قدرے دلچسپی سے سامنے بیٹھی لڑکی یا خاتون کو دیکھا، پھر نواب
جولین سے سوال کیا۔

"نواب! تمہارا اشارہ اس لڑکی کی طرف تو نہیں؟" اور عبدالعزیز نے سامنے والی
لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"لڑکی ـــــ؟" نواب جولین مسکرایا۔ "لڑکی تو نہیں بلکہ انہیں ایک معزز کمسن
خاتون کہا جا سکتا ہے۔" نواب جولین پھر مسکرایا۔ پھر اُس نے بات پوری کی۔ "یہ
لڑکی نہیں بلکہ اس محفل میں سب سے زیادہ معزز خاتون ہیں۔ مزید یہ کہ اس کم عمری
ہی میں اپنے اوپر بیوگی کا داغ لگا بیٹھی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا نواب ـــــ؟" عبدالعزیز نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ "ان کی
صورت سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ شادی شدہ ہیں۔ بہرحال تم کہتے ہو تو مانے لیتے

ہیں۔ اور کچھ کہنا ہے ان کے سلسلے میں؟"

"کچھ کہنا نہیں، بلکہ بہت کچھ کہنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے نواب جولین نے
ہستی کی طرف دیکھا جس کا وہ تعارف کرا رہا تھا۔ اتفاق سے عبدالعزیز کی نظ
اُدھر ہی تھیں۔

"میں سن رہا ہوں اور دلچسپی سے سن رہا ہوں۔" عبدالعزیز نے اپنی نظریں
طرح اُس پر جما دیں۔ "مجھے خوشی ہوگی اگر نواب جولین ان کے اور ان کی بیو
متعلق مجھے کچھ بتائیں گے۔"

"سنیئے میرے عزیز نوجوان دوست اور فاتح اُندلس کے ہونہار فرزند ارجمند۔"
نواب جولین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اے فاتح کے خوبرو بیٹے عبدالعزیز!
خاموش مگر خوبصورت اور دلفریب ہستی کا نام اے۔جی۔ لونا ہے۔ اور یہ سابق
اُندلس راڈرک کی آخری بیوی یعنی ملکہ اُندلس ہیں۔ سابق شاہ نے بادشاہت جا
اور دریا برد ہونے سے صرف ایک ماہ پہلے اس بدنصیب ہستی سے زبردستی رشتہ جوڑ
کی کوشش کی تھی۔ اُس ذلیل اور کمینے جسے لوگ بادشاہ اور میں کتا کہتا ہوں نے
معصوم کو اس کے گھر سے پکڑ بلوایا تھا اور اپنے محل میں ڈال لیا تھا۔ مگر قدرت شاید
کی زیادتیوں کو اب برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ شاہ راڈرک نے اس بچی کے ساتھ ش
عروسی یا اس کی عزت لوٹنے کی جو تاریخ مقرر کی تھی اس سے صرف ایک ہفتہ پہلے
دریا بُرد ہو گیا اور اس طرح لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا جیسے اُس کا وجود ہی
تھا۔ اُس وقت سے یہ کنواری بیوہ آج تک اپنی دوشیزگی کا بار اُٹھائے اُٹھائے پھ
ہے۔ کوئی اسے بیوہ کہتا ہے تو کوئی اسے کنواری بیوہ کے نام سے پکارتا ہے۔"

اور جب نواب جولین خاموش ہوا تو سامنے والی لڑکی وہاں سے اُٹھ کے دُور جا
دکھائی دی۔

"بڑی دردناک زندگی گزار رہی ہے یہ ان دنوں۔" نواب جولین نے جیسے ا
ہلکی ہچکی سی لی۔

"کیا اس بدنصیب سے میں پھر مل سکتا ہوں؟" عبدالعزیز نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیوں ——— ؟ اُس سے پھر کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ؟" نواب نے د

ے پوچھا۔

"مجھے وہ کچھ اچھی لگی ہے۔"

"ارے ———" جولین چونک کر بولا۔ "خیریت تو ہے، کیا پسند آ گئی وہ شہزادی؟"

عبدالعزیز نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ "ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔
شاید دوسری ملاقات میں کچھ فیصلہ کر سکوں۔"

"ملکہ جی لونا بہت کھلی اور بے باک گفتگو کرتی ہے۔" نواب جولین نے بتایا۔
"جہاں تک اُس سے ملاقات کا تعلق ہے تو یہ میں اُس سے پوچھ کے بتاؤں گا۔"

"کہاں رہتی ہے وہ؟"

"اُس کا کہیں گھر بار نہیں۔" نواب نے بتایا۔ "دُور کی کوئی عزیز یا سہیلی ہے، اُسی
کے ساتھ رہتی ہے۔ اور سوائے کسی ضروری کام کے گھر سے باہر کم ہی نکلتی ہے۔"

"نواب! تم بات کر کے دیکھو۔" عبدالعزیز نے کہا۔ "اگر وہ پسند کرے تو میں
تمہارے ساتھ ہی اُس سے ملنے چلوں۔"

دوسرے دن نواب جولین نے اُس سے بات کرنے کے بعد عبدالعزیز کو بتایا۔

"جی لونا کو خواہ مخواہ لوگوں سے ملنے کا شوق نہیں۔ مگر میرے زور دینے پر وہ
ملاقات کے لئے تیار ہو گئی۔"

"کب ملاقات ہو سکے گی؟" عبدالعزیز نے دلچسپی سے پوچھا۔

نواب جولین نے بتایا۔

"کل دوپہر کا کھانا ہم اور تم دونوں اُس کے ساتھ کھائیں گے۔ وہیں گپ شپ
ہوگی اس سے۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ اُس کا کوئی گھر نہیں اور وہ کسی سہیلی کے ساتھ رہتی
ہے۔" عبدالعزیز نے اُسے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ رہتی تو سہیلی کے ساتھ ہی ہے۔" نواب جولین نے وضاحت
کی۔ "مگر سہیلی نے اُسے ایک الگ بیٹھک دے رکھی ہے جہاں وہ اپنے عزیز و
اقارب اور جاننے والوں سے ملاقات کرتی ہے۔ ملکہ جی لونا تنہائی پسند ہونے کے
باوجود بہت خوش طبع ہے اور جوانوں کو پسند کرتی ہے۔"

عبدالعزیز چونک پڑا۔

''کیا کہا تم نے ــــــ وہ جوانوں کو پسند کرتی ہے؟''

''ہاں ــــــ!'' نواب نے جواب دیا۔''جی لونا کو بوڑھوں کی صحبت بالکل پسند نہیں۔ بوڑھے اُسے پرانی باتیں یاد دلا کر اس پر افسوس کرتے ہیں اور جی لونا کو زمانے کا یہ ماتم پسند نہیں۔ جہاں تک جوانوں کا تعلق ہے تو جوان اب اُس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے کیونکہ اُس کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ ختم ہو گئے ہیں اور وہ پرانی باتیں کرنے اور سننے کو پسند نہیں کرتی۔''

''کچھ عجیب طبیعت کی ہے یہ پرانی ملکہ ــــــ'' عبدالعزیز نے افسوس کے انداز میں کہا۔''خیر بات ہو گی تو اُس کی طبیعت کا صحیح پتہ چل سکے گا۔''



دوسرے دن حسب وعدہ اور ارادہ نواب جولین، موسیٰ بن نصیر کے نوجوان بیٹے عبدالعزیز کو ساتھ لے کر سابق ملکہ اُندلس جی لونا کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ ملکہ جی لونا بہت سلیقہ مند اور مہمان نواز تھی۔ اُس نے دونوں مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اُس نے صبح ہی سے قسم قسم کے پکوان پکوانے شروع کر دیئے تھے۔ ملکہ کی سہیلی اور اُس کی دو خادماؤں نے اُس کا ہاتھ بٹایا اور کھانے کے وقت سے بہت پہلے تمام لوازمات اور کھانے وغیرہ تیار ہو گئے۔

نواب جولین اور عبدالعزیز وقت مقررہ پر ملکہ کی قیام گاہ پر پہنچے۔ ملکہ جی لونا کی قیام گاہ صرف ڈیڑھ کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک کمرہ بیڈ رُوم اور ڈرائنگ رُوم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور دوسرا کمرہ جو صرف نام کا ہی کمرہ تھا، یہ ایک چھ فٹ اسکوائر کمرہ تھا، اسٹور کا کام دیتا تھا۔ اس میں ملکہ کا تمام سامان بھرا ہوا بلکہ ٹھونسا ہوا تھا۔ کئی بکسے تلے اُوپر چڑھے ہوئے تھے اور زمین پر پیر رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ مگر ملکہ جی لونا جو محلوں کی باسی تھی اس چھوٹی سی قیام گاہ پر بھی خوش تھی اور اپنی تقدیر پر راضی تھی۔

ملکہ جی لونا کے دونوں مہمان بھی یعنی نواب جولین اور عبدالعزیز دونوں ہی بلا کے باتونی تھے۔ ملکہ جی لونا نے مہمانوں کے لئے پتہ نہیں کس طرح تین چار ڈشیں تیار کر لی تھیں۔ پھر جب کھانا شروع ہوا تو باتوں کا ایک دفتر کھل گیا۔ نواب جولین اور عبدالعزیز تو خیر مرد تھے، خود ملکہ نے باتوں کا سلسلہ جو شروع کیا تو دوپہر ڈھل گئی اور ملکہ کی باتیں ختم ہونے کو نہ آئیں۔ نواب جولین تو شاید کچھ تھکا تھکا سا تھا اس لئے زیادہ نہیں بول رہا تھا۔ مگر نوجوان عبدالعزیز بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہا تھا۔ پھر جلد ہی نواب جولین نے محسوس کیا کہ نوعمر سردار عبدالعزیز ملکہ جی لونا میں بہت دلچسپی لے رہا ہے اور ملکہ جی لونا بھی عبدالعزیز کی باتوں میں ایسی مگن ہے کہ اس نے نواب جولین کو جیسے بالکل بھلا دیا ہے۔ نواب جولین نے جو ملکہ جی لونا اور عبدالعزیز کی ایسی

محویت اور گفتگو میں اس قدر دلچسپی دیکھی تو وہ چپکے سے اُٹھا اور ''ابھی واپس آئے'' بہانہ کر کے باہر نکل گیا۔ دراصل نواب جولین کا مقصد یہ تھا کہ ملکہ جی لونا کو کسی طرح لگا دیا جائے تاکہ وہ اپنی بیوگی کا غم بھول جائے اور از سر نو دوسری زندگی شروع کرے۔ اُس نے جو ملکہ اور عبدالعزیز کو اس قدر محویت اور دلچسپی سے گفتگو کرتے دیکھا تو انہیں گفتگو کا اور زیادہ موقع دینے کی خاطر وہاں سے بہانہ کر کے نکل آیا۔

اصل بات یہ تھی کہ ملکہ اور نوجوان عبدالعزیز اتنے انہماک اور دلچسپی سے گفتگو کر رہے تھے کہ نواب جولین نے انہیں اکیلا چھوڑ دینا ہی بہتر سمجھا۔ اُدھر ملکہ اور عبدالعزیز کی باتوں کا سلسلہ تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہ کھانے کی دعوت تھی اور ملکہ نے نواب اور عبدالعزیز کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مگر اب شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور رات ہونے کو آئی تھی مگر ملکہ اور عبدالعزیز کی باتیں ختم ہی ہونے کو نہ آ رہی تھیں۔

نواب جولین ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ ملکہ جی لونا اور موسیٰ بن نصیر کے نوعمر صاحبزادے عبدالعزیز ایک دوسرے میں اس قدر دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یہ بات عام ہو کر اُڑی اور ہوا کے دوش پر اُڑتی ہوئی آخر عبدالعزیز کے پدرِ محترم اور اسلامی لشکر کے اُندلس میں سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے کانوں میں پہنچی۔ اس سلسلے میں اصل شبہ نواب جولین پر کیا گیا کہ وہ دونوں کے رازدار تھے۔ موسیٰ بن نصیر کو جب صاحبزادے کی دلچسپی کا پتہ چلا تو پہلے اُنہوں نے کھنکار کر زمین پر تھوکا، پھر ذرا سنجیدہ ہو کر خود اپنے آپ سے کہا۔

''تو پھر اس میں برائی کیا ہے؟''

پھر موسیٰ بن نصیر نے ایک دن نواب جولین کو بلا کر پوچھا۔

''کاؤنٹ جولین! ذرا سوچ کر بتاؤ کہ آج کل تمہارے جگری دوست اور ہمارے بے لگام صاحبزادے کے دن رات کس طرح کٹتے ہیں؟''

نواب جولین جوانوں کے علاوہ بزرگوں کے بھی رازدار اور مشیر کار تھے۔ اُنہوں نے پہلے منہ بنایا، پھر اطمینان سے بولے۔

''عقلمند کہتے ہیں کہ جب لڑکا جوان ہو جائے تو اس کے ہاتھ میں ایک دوسرا ہاتھ

دے دیا جاتا ہے۔''

موسیٰ بن نصیر، نواب جولین کا اشارہ فوراً سمجھ گئے۔ مگر انجان بن کر بولے۔

''ٹھیک کہتے ہو نواب جولین! مگر دوسرا ہاتھ کہاں سے لایا جائے؟''

''دوسرا ہاتھ تو موجود ہے۔ مگر آپ خود ہی توجہ نہیں دیتے۔'' نواب جولین نے کھلنا شروع کر دیا۔ ''ہم دوستوں کا کام ایک دوسرے کو سمجھانا ہے۔ مگر ہم اُسے مجبور تو نہیں کر سکتے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' موسیٰ چڑ گئے۔ ''دوست کا کام دوسرے دوست کو سمجھانا ہے اور اچھے برے کا بتانا ہے۔''

''معاف کیجئے سردار بہادر ——!'' نواب جولین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اچھا برا بچے کو سمجھایا جاتا ہے۔ عبدالعزیز کی جوانی ان حدوں کو پار کر چکی ہے۔ اور اگر میں کہوں تو یہ غلط نہ ہو گا کہ میرے پیارے دوست نے دوسرا ہاتھ دیکھ بھی لیا ہے اور تھام بھی لیا ہے۔''

''ہونہہ ——'' اور موسیٰ جیسے اُچھل پڑے۔ ''تو کیا عبدالعزیز نے خود ہی لڑکی پسند بھی کر لی اور اُس سے بیاہ بھی کر لیا؟''

نواب جولین ہلکے سے ہنسا اور بولا۔

''میرے خیال میں میرا دوست اس قدر نادان نہیں اور نہ والدین کا اس قدر نافرمان ہے کہ وہ بغیر والدین کی مرضی کے اپنا گھر بسا لے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر آپ یوں ہی لیت و لال کرتے رہے تو پھر شاید اس کی بھی نوبت آ جائے۔''

موسیٰ کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ خوشامدانہ انداز میں بولے۔

''نواب جولین! مجھے تم پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم عبدالعزیز کو کوئی غلط قدم نہ اُٹھانے دو گے۔''

اور نواب جولین کو آخر کار کہنا پڑا۔

''سردار موسیٰ بن نصیر مطمئن رہیں۔ اگر انہوں نے اس ناچیز پر بھروسہ کیا ہے تو میں ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچنے دُوں گا۔''

چنانچہ اب ملکہ جی لونا اور موسیٰ بن نصیر کے نوعمر صاحبزادے عبدالعزیز کے عشق و

محبت کی داستان دُور اور قریب ہر جگہ پھیل گئی۔ ملکہ جی لونا اگرچہ شاہ راڈرک کی درجنوں ملکاؤں اور منظورِ نظر کنیزوں میں سے ایک تھی مگر اُس دور میں مال و دولت ہیرے جواہرات کی اس قدر کثرت تھی کہ اُمراء تو اُمراء، اوسط درجہ اور غریبوں کی خواتین بھی سونے کے زیورات استعمال کرتی تھیں۔ اور ان زیورات میں سچے بیش قیمت نگینے اور ہیرے جواہرات کی آمیزش ہوتی تھی۔

پھر ملکہ جی لونا تو اُندلس کے بدنصیب بادشاہ کی ملکہ تھی۔ اُسے بھی شاہی خزانے سے زیادہ نہیں مگر تھوڑا بہت حصہ تو ملا ہی تھا اور ایک تاریخی حوالے کے متعلق ''ملکہ لونا'' شاہ راڈرک کی چھ ماہ تک محبوب نظر رہی تھی۔ جبکہ شاہ ہر نئی محبوبہ یا ملکہ کو ایک سے زیادہ اپنے سر پر نہیں بٹھاتا تھا کیونکہ وہاں امیدوار ملکاؤں کی قطاریں لگی تھیں اور تقریباً ہر ہفتہ راڈرک کے شبستان میں ایک نئی محبوبہ، ملکہ اُندلس کے نام جلوہ گر ہوتی اور دوسرے ہی ہفتے وہ محل کے ہنگاموں میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

بہرصورت ملکہ ''جی لونا'' جسے خدا نے دنیاوی دولت کے علاوہ حسن کی لازوال دولت سے بھی نوازا تھا جب شاہی محل سے رخصت ہوئی اور اُسے مجبوراً دوسری ملکہ کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی تو اُس کے پاس ہیرے جواہرات کا ایک بڑا خزانہ جس میں سے بہت سا حصہ وہ چرا چھپا کر محل سے نکال لے گئی تھی۔ پس ملکہ جی لونا کا یہ اندوختہ اُس وقت کام آیا جب اُس کی اور موسیٰ بن نصیر کے ولی عہد اور بڑے بیٹے عبدالعزیز کی شادی طے پائی۔

یہ شادی ایک مسلمان شہزادے اور عیسائی شہزادی کی نہیں بلکہ دو ملکوں، دو تہذیبوں اور مذاہب کی شادی تھی۔ اس شادی کا تذکرہ اکثر تاریخوں سے بہت تفصیل سے ہے۔ لیکن ہم اُس تفصیل میں نہیں جاتے بلکہ اسے مختصراً بیان کرتے ہیں۔ نواب جولین نے ملکہ جی لونا کو بتا دیا تھا کہ اُس کے ہونے والے شوہر کا مطالبہ ہے اُس کا عقد (شادی) اسلامی انداز سے ہو۔ قاضی صاحب نکاح پڑھائیں۔ محفلیں جمیں دعوتیں ہوں اور ملک ملک کے کرتب دکھانے والے اور بازی گر اس محفل کی رونق بڑھائیں۔

چنانچہ ملکہ جی لونا نے یہ شرط تسلیم کرتے ہوئے نواب جولین کو پوری آزادی دی تھی کہ وہ دل کھول کر بلکہ پورا پورا دل کھول کے شادی کے اخراجات کرے اور شادی کی رونقیں بڑھائے۔ ملکہ جی لونا کو اس سلسلے میں اخراجات کے لئے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ اُس نے اپنے جواہرات میں سے ہیرے کا ایک جڑاؤ ہار نواب جولین کے حوالے کیا کہ وہ اسے فروخت کر کے شادی کے اخراجات پورے کرے۔

نواب جولین بذاتِ خود رئیس تھا اور آئے دن رؤسا کی شادی بیاہ میں شرکت کرتا تھا۔ اُس کی نظروں سے ایک سے ایک قیمتی زیور گزرا تھا۔ مگر جب وہ ملکہ لونا کے ہار کو فروخت کرنے کے لئے زیورات کے بازار میں پہنچا تو وہاں کے جوہری اُس ہار کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ ہر جوہری کی خواہش تھی کہ وہ اس قیمتی اور دیدہ زیب ہار کو خریدے۔ مگر جب اُس کی قیمت کا اندازہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ جواہر بازار کے چھوٹے تاجر تو اس کے صرف ایک ہیرے کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتے۔

پس یہ طے ہوا کہ اس جڑاؤ ہار کو توڑ کر اس کے ہیروں کو ایک ایک کر کے فروخت کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ملکہ جی لونا کا ایک نایاب ہار ٹکڑے ٹکڑے کر کے فروخت ہوا۔ اس ہار کی فروخت سے جو قیمت یا رقم حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملکہ جی لونا نے خود اپنے ہاتھ سے مہمانداری پر دل کھول کر خرچ کیا اور غریبوں اور محتاجوں کو بھی خوب خوب نوازا۔ مگر اُس کے صرف ایک ہار کی قیمت بھی اخراجات میں خرچ نہ ہو سکی اور کچھ رقم پس انداز ہوئی۔ اس سے اُس ہار کا اور ملکہ کی دولت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اُس کے قبضے میں تھی۔

امیرزادے عبدالعزیز کی بارات تین روز تک ملکہ جی لونا نے اپنی حویلی میں ٹھہرائی اور بھرپور اور دل کھول کے خرچ کیا۔ اس کے جواب میں موسیٰ بن نصیر نے ایسی شاندار دعوت ولیمہ دی کہ صبح سے جو دیگیں چڑھیں تو آدھی رات تک کھانا پکتا رہا۔ قسم قسم کے کھانے، دمشق کے کھانے الگ اور اُندلس کے کھانے الگ۔ یہ دو ملکوں، دو مذہبوں، دو تہذیبوں اور دو قسم کے عوام کا ایک دلفریب میلہ تھا۔ دو ملکوں کی باتیں، زبانیں، مسکراہٹیں اور قہقہے سنائی دیتے تھے۔ یہ فاتح اُندلس موسیٰ بن نصیر اور اُندلس کی سابق ملکہ جی لونا کی شادی نہ تھی بلکہ دو تہذیبوں اور دو تمدنوں کا ایک حسین میلہ تھا

جس کی یاد اور نظارے عوام برسوں تک نہ بھلا سکے۔

مریڈا والوں نے جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا وہ ایک افسانہ بن گیا پورے اُندلس میں مشہور ہو گیا اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے عیسائیوں کے خون نے بھی جوش مارا اور مریڈا والوں کی تقلید میں انہوں نے بھی مسلمانوں کی اطاعت سے منہ موڑا۔ چنانچہ ایک ساتھ اشبیلیہ، ملائمہ، غرناطہ اور جین (JAEN) میں بغاوت ہو گئی۔ موسیٰ بن نصیر نے سب سے پہلے اشبیلیہ کی طرف رُخ کیا کیونکہ وہاں لوگوں کو شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ تیس آدمیوں کو قتل کیا گیا۔ یہودی جو ہمیشہ سے غدار اور ناقابل اعتبار تھے، وہ مسلمانوں کی عنایات بھول کر عیسائیوں سے مل گئے اور سازشیں کرنے لگے۔

چنانچہ موسیٰ بن نصیر کا جواں عمر بیٹا بڑی تیزی سے وہاں جا پہنچا۔ اُس نے غداروں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ سازشیوں کو موت سے ہم آغوش کیا۔ اس سے یہ فتنہ جلد ہی ختم ہو گیا اور بغاوت فرو ہو گئی۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی قائم کی گئی، عربوں کو بسایا گیا اور ایک منظم فوج اشبیلیہ میں چھوڑی گئی۔ ضبط شدہ جائیدادیں تقسیم کر دی گئیں اور وہ سپاہیوں کی معاش کا ذریعہ بنیں۔

یہاں سے ہٹ کر عبدالعزیز نے دوسرے باغی علاقوں کو زیر کیا اور انہیں اُن کی خطاؤں کی سزا بھی دی۔ مرسیہ کے ایک حصہ پر مقبوضات قائم کر دیئے گئے اور تھیوڈو میر کی سفارش پر رعیت کو بہت سی مراعات دی گئیں۔ ان مہمات سے نمٹ کر موسیٰ بن نصیر ایک فاتح کی حیثیت سے طلیطلہ کی جانب اپنے آزمودہ کار جنرل طارق بن زیاد سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔

اُدھر طارق بن زیاد کو موسیٰ بن نصیر کی آمد کی خبر مل چکی تھی چنانچہ وہ خود بھی اپنے مربی اور آقا کے استقبال کے لئے طلیطلہ سے آگے بڑھے اور ایک قول کے مطابق تلویرا کے مقام پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ابن القوطیہ نے لکھا ہے کہ اُن دونوں کی ملاقات اسیتجا کے مکام پر ہوئی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کہاں ملے مگر جہاں بھی اور جب بھی ملے تو دونوں کے دل صاف نہ تھے۔ طارق بن زیاد نے حکم عدولی کی تھی اور حکم عدولی فوجی نظم و ضبط کے قیام کے سلسلے میں اس قدر زبردست گناہ تھا جس کی کوئی

بھی سزا دی جا سکتی تھی۔ موسیٰ کو طارق بن زیاد سے کئی شکایتیں تھیں۔ نافرمانی تو خیر طارق بن زیاد نے کی ہی تھی مگر موسیٰ اُس مال و دولت کے تذکرے بھی سن چکے تھے جو مختلف فتوحات میں طارق کے ہاتھ آ گئے تھے۔ موسیٰ، فوج میں طارق کی ہردلعزیزی سے بھی خوش نہ تھے کیونکہ سردار کی ہردلعزیزی بغاوت کا پیش خیمہ ہوتی ہے، پھر طارق بن زیاد کے مقبوضہ علاقوں میں بغاوتیں ہوئی تھیں اس وجہ سے بھی موسیٰ اُس کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔

آخر کو یہ دونوں ملے۔ طارق بن زیادہ شرمندہ، موسیٰ بن نصیر غیض و غضب میں بھرے ہوئے۔ طارق بن زیاد تمام آدابِ مراتب بجا لایا، گھوڑے سے اُتر کر تعظیم کی، سر جھکا دیا۔ موسیٰ بن نصیر نے پہلے یہی سوال کیا۔

"میری اجازت کے بغیر تمہیں میدانِ گاڈلیٹ سے آگے بڑھنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

اس کے ساتھ ہی کوڑے سے سرزنش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ طارق کو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ طارق جس کی بے پناہ خدمات کا سارا زمانہ اعتراف کرتا ہے، جس نے ایک مختصر فوج کے ساتھ لاکھوں سے ٹکر لی اور فتح پائی، جس نے کفر و الحاد کی سرزمین میں ایمان اور توحید کا چراغ روشن کیا، جس نے ناقوس اور گھنٹوں کی صداؤں پر اذان کی گونج کو فوقیت دی، جس نے اپنی فوج کے ایک فرد کو بھی ناراض نہیں کیا، جس نے حالات کے تقاضے اور دوسروں کے مشورے سے یہ قدم اُٹھایا تھا، اُس کے لئے یہ سزا بہت سخت تھی۔ اُس وقت لوگ جانتے تھے کہ قید کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس لئے ایک ایلچی فوری طور پر طارق کی طرف سے دربارِ خلافت میں بھیجا گیا جسے رشوت دے کر آمادہ کیا گیا تھا اور سرعت اور جلد سے جلد دربارِ خلافت پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طارق بن زیاد کی بے پناہ خدمات کے پیش نظر اُس کی رہائی کا پروانہ جاری ہوا۔ دونوں سردار طلیطلہ پہنچے، وہاں دونوں کے دل صاف ہوئے۔ طارق بن زیاد نے نذرانہ پیش کیا اور سارے تحائف ڈھیر کر دیئے اور خمس کا مال بھی لا کر سجا دیا گیا۔

یہ تمام حالات اور چیزیں دیکھ کر موسیٰ بن نصیر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

خصوصاً وہ میز جس کو حضرت سلیمان علیہ اسلام کی ملکیت بتایا جاتا تھا، گو کہ اب اس
کے صرف تین پیر باقی رہ گئے تھے، چوتھا غائب تھا، اُسے دیکھ کر عقل و خرد حیران رہ
گئی۔ مالِ خمس امیر المومنین کے لئے الگ کر کے رکھ دیا گیا۔ باقی کے حصے بٹ
ہوئے اور اب آئندہ فتوحات کے لئے صلاح و مشورے ہونے لگے۔

عبدالعزیز پہلے ہی باقی علاقوں کو زیرِ نگیں کر کے مرسیہ پھر نیلہ بند کی طرف بڑھ
چکے تھے اور انہیں اس عرصہ میں اپنے مقبوضات میں شامل بھی کر چکے تھے۔

ادھر طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کی فوجیں یکجا ہو کر ارغون کی طرف کوچ
کرنے لگیں۔ راستہ بہت خراب تھا۔ جگہ جگہ ندی نالے تھے اور میدان و جنگل جہاں
گرد بھی اُڑتی تو طوفان معلوم ہوتی۔ غرض یہ کہ بہت دُشوار گزار راستوں کو طے کر کے
یہ لوگ صوبہ ارغوان کے دارالسلطنت سرقسط پہنچے۔ منزلیں طے کرنے کے لئے ہر سوار
کو ایک تانبہ کا برتن دیا گیا جس سے کھانے اور پینے دونوں کا کام لینا تھا۔ ایک
چمڑے کی چھاگل پانی اور ایک تھیلا کھانے پینے کی چیزیں رکھنے کے لئے دیا گیا۔
پیادوں کے پاس اُن کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ تمام سامان بار
بردار خچروں پر لدا ہوا تھا۔ فوجی ضرورت کی ہر چیز ساتھ تھی مگر کروفر نہ تھا جو اس قدر
دولت اور مال و زر حاصل ہونے کے بعد ہونا چاہئے تھا۔

کھیتی جلانا منع تھی۔ غیر فوجی سے تعرض منع تھا۔ آگ لگانا یا بستیاں جلانا بھی خلاف
قاعدہ تھا۔ مذہبی جذبات کے احساس رکھنے کی خاص ہدایات تھیں۔ عورتوں پر تشدد
بچوں پر ظلم بدترین گناہ تھے۔ جو لوگ جنگ پر آمادہ ہوں اُن سے بلا شبہ رعایت نہ کی
جائے، جو لوگ مصالحت پر آمادہ ہوں اُن سے نرمی برتنے کا حکم تھا۔ مگر اہالیانِ ارغون
پورے صوبے کو محفوظ اور ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ شرارت پر آمادہ رہے اور
جنگ و جدل کی ہی تیاری کرتے رہے۔ پس جنگیں ہوئیں، ایک سرے سے دوسرے
سرے تک، نہ حفاظتی تراکیب کام آئیں اور نہ بہادری اور دلیری...... زمینیں ضبط کر لی
گئیں۔ جائیدادیں چھین لی گئیں اور ان سب پر افریقیوں کو بسایا گیا اور تمام شرارت
پسندوں کو اُن کے ماتحت کر دیا گیا۔ شہریوں پر ٹیکس لگایا گیا۔ یہاں کے گورنر حسین بن
عبداللہ نے ایک مسجد تعمیر کی جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔

ان سب سے فرصت پا کر قلونہ اور ڈیلنشیں پر چڑھائی کی گئی۔ انہوں نے معمولی
مدافعت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ یہاں بھی کھیتیوں کو تباہ نہیں کیا گیا، نہ بستیوں کو
جلایا گیا بلکہ بربر بسائے گئے جنہوں نے یہاں کی عورتوں سے نکاح کئے اور گھر
گرہستی جما کر بیٹھ گئے۔

اب دونوں سپہ سالاروں نے اپنا رُخ مغرب کی جانب موڑا اور انتہائی دُشوار گزار
اور خاردار علاقوں سے گزر کر پہلے جلیقہ پہنچے اور پھر آلسٹریا۔ یہی دونوں صوبے ایسے
تھے جو اب بھی عیسائی حکمرانوں کا دم بھرتے تھے اور ابھی تک ان ہی کے زیرِ اثر تھے۔
کوئی بادشاہ تو باقی نہیں رہ گیا تھا مگر جہاں جہاں امیروں کی حکمرانی تھی وہ اپنے اپنے
علاقوں کے حاکم بن بیٹھے تھے۔ راستے اس قدر دُشوار گزار تھے کہ میلوں تک ویرانی ہی
ویرانی تھی۔ کسی آدمی یا آدم زاد کا پتہ نہ لگتا تھا۔ کہیں پہاڑ، کہیں لق و دق چٹیل
میدان۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں مگر دُور دُور تک سناٹا ہی پڑا رہتا تھا۔ مگر یہ
مسلمان تھے جو ان راستوں کی تکلیف اور پریشانیوں سے ذرا بھی نہ گھبرائے اور نہ
انہوں نے ہمت ہاری۔ بلکہ منزلوں پر منزلیں طے کرتے اور ان ویران علاقوں کو فتح
کرتے رہے۔ اس طرح یہاں بھی ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔

وہاں مسلمانوں نے اپنی آبادیاں قائم کیں اور گورنر مقرر کئے۔ محافظ دستے بھی
تعینات کئے گئے۔ انہوں نے رعیت سے خراج بھی لیا اور انہیں اطاعت کا سبق بھی
پڑھایا۔ یہ علاقے اُندلس کی آخری حد تھی۔ اگر کچھ نظر آتا تھا تو وہ کوہ پائرس کی فلک
بوس چوٹیاں تھیں۔ ان میں کہیں کہیں تنگ گھاٹیاں اور درّے تھے۔ ورنہ ہر طرف پہاڑ
ہی پہاڑ تھے۔

مگر...... مگر یہ وہی جگہ تھی جہاں کھڑے ہو کر موسیٰ بن نصیر نے پورے یورپ کو فتح
کرنے کا عظیم الشان خاکہ تیار کیا تھا۔ موسیٰ اب تک اُندلس کو روندتے چلے آئے
تھے۔ مگر اب اُن کے قدم ملک فرانس میں داخل ہونے کی راہ تلاش کر رہے تھے۔ اس
بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ موسیٰ بن نصیر معہ اپنے لشکر کے
ملک فرانس میں داخل ہوئے اور انہوں نے کچھ فتوحات حاصل کیں۔ مگر اس بات پر
سب کا اتفاق ہے کہ اس علاقے میں موسیٰ بن نصیر کو خلیفہ کا وہ پروانہ موصول ہوا جس

میں اُنہیں واپسی کا حکم دیا گیا تھا۔

پس اس پروانے سے موسیٰ بن نصیر کے یورپ کی فتح کے خواب چکنا چور ہو
طارق بن زیاد اس وقت ''استورگا'' میں تھے اور موسیٰ بن نصیر لیوگیو میں۔ جہاں
برق رفتار قاصد اُن کے حضور پہنچا اور وہ حکم نامہ اُن کے سامنے رکھا جس میں ا
واپسی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ پروانہ لانے والا قاصد ''ابو نصر'' تھا جس نے د
سرداروں کو زبانی یہ بھی بتایا کہ خلیفہ نے انہیں آگے بڑھنے سے ایک دم روکا ہے
فوری واپس آنے کا حکم دیا ہے۔

ان حالات میں دونوں سرداروں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ
تعمیل حکم کریں اور بارگاہِ خلافت میں حاضری دیں۔ چنانچہ حکم حاکم مرگ مفاجات
مصداق سرداروں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت موسیٰ بن نصیر کی زبان سے
ساختہ نکلا۔

''بیٹے طارق! اب واپس چلنے ہی میں مصلحت اور سلامتی ہے۔''

پس فوری طور پر اشبیلیہ کو اسلامی دارالسلطنت قرار دیا گیا۔ حکومت کی باگ
نئے نئے دُلہا یعنی موسیٰ بن نصیر کے بیٹے عبدالعزیز کے حوالے کی گئی جسے موسیٰ بن
نے زمانے، حالات اور واقعات کی اُونچ نیچ سے اچھی طرح آگاہ کیا۔ پھر دونوں
اُندلس، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد 95 ہجری کے آخر میں آبنائے جبرالٹر
کے ''قیرواں'' پہنچے۔ پھر وہاں سے دارالخلافہ دمشق کی طرف روانگی کی تیاریاں ک
لگے۔



تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی دمشق واپسی نے ان دونوں مسلم سرداروں اور فاتحین کو بہت نقصان پہنچایا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی واپسی کا اصل اور عظیم نقصان خود مسلم قوم کو پہنچا۔ ان دونوں کی واپسی دراصل ایک گہری سازش کا نتیجہ تھی۔ جس وقت اُنہیں واپسی کا حکم ملا اُس وقت موسیٰ بن نصیر کے ذہن اور فوجی دماغ میں خدا جانے کتنی اہم اور مفید اسکیمیں تھیں۔ موسیٰ بن نصیر کے قدم فرانس کو روند ڈالنے کے لئے آگے بڑھ چکے تھے اور شاید فرانس کی تسخیر کے بعد یورپ کی کوئی طاقت مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ کرتی۔

بعض اوقات رشک وحسد کی رنجشیں کسی فرد کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتیں جتنا نقصان اس سے پوری قوم کو پہنچتا ہے۔ کاش مسلم خلیفہ ولید بن عبدالملک کے کان بھرنے والے اوران باہمت اور باحوصلہ سپہ سالاروں کے خلاف زہر اُگلنے والے یہ سوچ لیتے کہ اگر غرور اور فتح مندی سے سرشار ہو کر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد باغی ہو بھی گئے اور انہوں نے آزاد حکومتیں بنا بھی لیں تو وہ آخر مسلمانوں ہی کی حکومتیں ہوں گی۔ اور وہ بہر صورت یہود ونصاریٰ سے لاکھ درجے بہتر ہوں گی۔

مگر چغل خوروں اور مفاد پرستوں نے اس کا خیال ہی نہ کیا اور فوراً خلیفہ ولید کے کان میں پھونکا۔

''عالیجاہ! موسیٰ بن نصیر اور اُس کا چیلا طارق بن زیاد فتح کے نشہ میں چور ہیں اور وہ عزت مآب خلیفہ کا تو ذرّہ برابر خیال نہیں کرتے۔ اگر ان کو فوری لگام نہ دی گئی تو غیر ممالک میں جانے والے لشکر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے۔''

''یہ کتنا بڑا زہر تھا جو خلیفۂ وقت کے کانوں میں انڈیلا جا رہا تھا۔

پھر جب ایک دُور اندیش امیر نے خلیفہ کو سمجھایا۔

"عزت مآب خلیفہ محترم! ان دونوں سپہ سالاروں نے نہ صرف غیر ممالک پر فتوحات حاصل کی ہیں بلکہ مذہب اسلام اور مسلمانوں کا نام بھی روشن کیا ہے۔ انہوں نے سرزمین یورپ کے باسیوں کو بتایا ہے کہ عیسائیت کے مقابلے میں مسلمانوں نے ہمیشہ عظمت اور اقتدار حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لئے مسلم سپہ سالاروں کو معزول کرنے یا واپس بلانے کی بجائے اُنہیں اس بات کی پوری آزادی دی جائے کہ وہاں کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، پھونک پھونک کر قدم بڑھائیں، فتوحات حاصل کریں اور اسلام کا نام روشن کریں۔"

یہ شاہوں اور بادشاہتوں کا زمانہ تھا۔ اُس زمانہ میں کوئی قاعدہ قانون نہیں تھا۔ قاعدہ تھا تو شاہ کا اور قانون تھا تو بادشاہت کا۔ یعنی چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی۔ شاہی زمانے میں حکومت کی باگ ڈور، بادشاہ کی بجائے اُن کے منہ چڑھے درباریوں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ اور درباری بھی ایسے کہ بادشاہ کے سامنے ایک دوسرے کے جانی دشمن اور دربار کے باہر ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، بلکہ ایک ہی آنگن میں درباریوں کے بستر لگتے اور دونوں پٹی سے پٹی ملا کر سوتے تھے۔

یہ خلافت بنو اُمیہ کا زمانہ تھا اور خلیفہ عبدالملک کا نازک اور تنگ مزاج بیٹا ولید بن عبدالملک کی خلافت یا بادشاہت کا زمانہ تھا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک، تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی کئی بیماریوں کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ بیماریاں اُسے ایامِ شہزادگی میں خوشامدیوں نے لگا دی تھیں۔ شہزادے عام طور پر بے لگام ہوتے ہیں۔ عیاشی اور شراب نوشی کا عام رواج تھا۔ محل میں بھری ہوئی کنیزوں نے شہزادوں کی ذاتی زندگی کو داغدار بنا دیا تھا یا خود شہزادوں نے غلط کاموں میں پڑ کے اپنی صحتیں برباد کر لی تھیں۔

ولید بن عبدالملک، خلیفہ کی بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے خلافت کا حقدار تھا۔ چنانچہ عبدالملک کے انتقال پر خلافت، دستور کے مطابق اُس کے بڑے بیٹے ولید بن عبدالملک کے ہاتھ آ گئی۔ ولید پہلے ہی دن سے بیمار تھا۔ خلیفہ ہونے کے بعد اُسے چاہئے تھا کہ خود کو سنبھالتا مگر اس پر اس کا اُلٹا اثر ہوا اور اُس نے خود کو بے راہ روی کے راستے پر ڈال دیا۔ دولت کی کمی نہ تھی۔ مسلمان سردار دُور دراز کے ملکوں میں فتوحات حاصل کرتے اور بے شمار مالِ غنیمت صدر مقام یعنی دمشق بھیجا جاتا۔ اُسے دیکھ کر خلیفہ بجائے خدا کا شکر ادا کرنے کے خود کو اور آزاد اور خود مختار سمجھنے لگتے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے۔ اُن کے کان مشورے سنتے مگر یہ تمام مشورے خوشامدیوں کے ہوتے اور اس سے حکومت کو فائدہ پہنچنے کی بجائے اُلٹا نقصان پہنچتا۔

موجودہ خلیفہ ولید کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام "سلیمان" تھا۔ وہ خلیفہ ولید بن عبدالملک سے کہیں زیادہ خودغرض اور جاہ پسند تھا۔ شہزادہ ہونے اور شاہی محل میں رہنے کی وجہ سے اُس کے اخراجات پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لیکن وہ اس قدر لالچی تھا کہ تمام دنیا کی دولت کے حصول کی تمنا ہر وقت اُسے ستاتی رہتی تھی۔ اُس نے ولید کی تخت نشینی (خلافت) کے وقت بھی در پردہ بہت اُودھم مچایا تھا اور ولید کی بجائے خود خلیفہ بننے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس وقت داؤ نہ چل سکا تھا اور اُسے مجبوراً خاموش ہونا پڑا تھا۔

ولید بن عبدالملک نے خلیفہ بنتے ہی خود کو غلط کاریوں اور بدکاریوں کا شکار بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے اُسے زیادہ سے زیادہ دولت کی ضرورت تھی۔ ولید بن عبدالملک کے گرد ہر وقت غلط لوگوں کا مجمع رہتا جو خلیفہ کی خوشنودی کے لئے اُسے غلط مشورے دیتے رہتے تھے۔ حالانکہ خلیفہ کے درباریوں میں اہل حکمت اور سمجھدار لوگ ہونے چاہئیں، مگر ولید شروع ہی سے غلط ہاتھوں میں پڑ گیا تھا اور خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔

آیئے اب ہم ایک بار پھر اسلامی فتوحات کی طرف چلتے ہیں۔ طارق بن زیاد کی اُندلس میں آمد ہی دراصل اس ملک میں اسلامی حکومت کی ابتداء تھی۔ جب طارق بن زیاد کو فتح حاصل ہوئی تو اُس کی اطلاع موسیٰ بن نصیر کو دی اور وہ خود مزید فتوحات حاصل کرنے میں منہمک ہو گیا۔ موسیٰ نے اُندلس کے جنوبی صوبہ "اندلیسہ" کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہ قرطبہ کی طرف بڑھا۔ قرطبہ ایک عظیم فوجی چھاؤنی تھی اور اس کا قلعہ اس قدر مضبوط تھا کہ آسانی سے فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن طارق نے نہایت جوانمردی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا محاصرہ کیا۔ عیسائیوں نے قلعہ کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دی۔ محاصرہ طول کھینچ گیا تو طارق نے وہاں اپنا نائب چھوڑا اور خود طلیطلہ کی جانب روانہ ہوا اور اُس نے طلیطلہ کو بغیر کسی دُشواری

کے فتح کرلیا۔

اس اثناء میں طارق کے نائب نے قرطبہ کو بھی فتح کر لیا۔ طارق نے اپ
کے ساتھ شمالی علاقوں کی طرف پیش قدمی کی اور کئی علاقوں کو آناً فاناً اپنے قبضے
لے آیا۔ اب صرف اُندلس کے چند مشرقی اور مغربی علاقے فتح ہونے باقی ر
تھے۔ طارق ابھی ان علاقوں کو فتح کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ اُس کے استاد ا
موسیٰ بن نصیر خود اُندلس میں اپنی فوج لے کر وارد ہوئے۔

موسیٰ بن نصیر نے اس بات پر اظہارِ ناراضگی کیا کہ طارق نے اُسے اطلاع د
بغیر مزید پیش قدمی کیوں کی؟ لیکن جب نواب جولین نے اس بات کا یقین دلا
طارق اگر مزید فتوحات حاصل نہ کرتا تو، اُس کی پچھلی فتوحات پر بھی پانی پھر جاتا۔
طرح موسیٰ بن نصیر کی ناراضگی دُور ہو گئی۔ یہاں سے وہ مغربی علاقے کی طرف
اور تمام علاقے فتح کرتا ہوا طلیطلہ میں داخل ہو گیا اور طارق سے ملاقات کی۔

موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اُس کا لڑکا عبدالعزیز بھی اُندلس آیا تھا۔ اُس نے
فتوحاتِ اُندلس میں ہاتھ بٹایا تھا اور جنوب مشرقی علاقے کے کئی شہر فتح کئے۔ اس
بعد طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر ''جبل البرتات'' سے ہوتے ہوئے جنوبی ف
کے علاقے میں داخل ہوئے اور کئی مقامات کو فتح کر کے اسلامی سلطنت کی حدود
اضافہ کیا۔ ان سپہ سالاروں کا ارادہ تھا کہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھیں اور یورپ
مزید علاقوں کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کریں۔ لیکن ابھی وہ اس ارا
پر عمل کرنے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ خلیفہ وقت ولید کا پیغام اُنہیں ملا جس
ذریعے چند مصلحتوں کے پیشِ نظر انہیں دمشق طلب کر لیا گیا۔ ولید کی طلبی پر دونوں
سالاروں کو مجبوراً دمشق روانہ ہونا پڑا اور فتوحات کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

موسیٰ بن نصیر نے چلتے وقت اُندلس کے تمام مقبوضات اپنے بیٹے عبدالعزیز
سپرد کر دیئے اور اس طرح اُندلس میں دورِ امارت کی ابتداء ہوئی۔

اب موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے اختلافات اور پھر دونوں کے ملاپ کے
بارے میں ایک دوسرے مؤرخ علامہ دوزی کا بیان سنیئے جنہیں اُس دور کی سند
ہے۔ وہ اس سلسلے میں اس طرح رقم طراز ہیں:۔

''طارق بن زیاد جس کے کان موسیٰ بن نصیر کی آمد کی خبر سے آشنا تھے اور وہ خود
اپنے اس مربی اور آقا کے استقبال کے لئے طلیطلہ سے آگے بڑھا اور بقول ڈاکٹر
اسکاٹ تلویرا کے مقام پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مگر ابن القوطیہ کی تحریر کے مطابق وہ
مقام ''اسیتجا'' تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کہاں ہے، مگر جب ملے تو دونوں کے دل
صاف نہ تھے۔ طارق نے حکم عدولی کی تھی اور ''حکم عدولی'' فوجی نظم و ضبط کے قیام
کے سلسلے میں اس قدر زبردست گناہ ہے کہ جس کی ہر سزا ممکن ہے۔ موسیٰ کو کئی باتیں
ناگوار گزری تھیں۔ نافرمانی تو خیر طارق نے کی ہی تھی مگر وہ اس مال و دولت کے
تذکرے بھی سن چکے تھے جو مختلف فتوحات میں اس سپہ سالار کے ہاتھ لگی تھی۔ موسیٰ،
طارق بن زیاد کی فوج میں ہر دلعزیزی سے بھی خوش نہ تھے کہ یہ ہمیشہ کسی نہ کسی
بغاوت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جگہ جگہ بغاوت ہو جانے کی وجہ سے بھی وہ طارق بن
زیاد کے انتظامات سے قطعی مطمئن نہ تھے۔

آخر کو یہ دونوں ملے۔ طارق شرمندہ، موسیٰ بن نصیر غیض و غضب میں بھرے
ہوئے تھے۔ طارق جملہ آدابِ مراتب بجا لایا۔ گھوڑے سے نیچے اُترا۔ تعظیم کی۔ سر
جھکا دیا۔ موسیٰ نے جیسا کہ علامہ دوزی نے لکھا ہے، پہلے یہی سوال کیا۔
''بغیر میری اجازت تمہیں گاڈلیٹ سے آگے بڑھنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' اور پھر
طارق کو کوڑے سے سرزنش کی۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ پابجولاں بھی کر دیا۔ طارق
جس کی خدمات کا سارا زمانہ اعتراف کرتا ہے، جس نے چند نفوس کے ساتھ لاکھوں
سے ٹکر لی اور فتح پائی، جس نے کفر و الحاد کی سرزمین میں ایمان اور توحید کا چراغ روشن
کیا، جس نے ناقوس اور گھنٹوں کی صداؤں پر اذانوں کی گونج کو فوقیت دی، جس نے
اپنے لشکر کے ایک سپاہی کو بھی ناراض نہ کیا، جس نے حالات کے تقاضے اور دوسروں
کے مشوروں سے یہ قدم اُٹھایا تھا، یہ سزا اُس کے لئے بہت سخت تھی۔

اُس وقت لوگ جانتے تھے کہ قید کرنے کے کیا معنی۔ اس لئے فوراً ایک ایلچی جو
دمشق کی راہ جانتا تھا اور اس سے پہلے بھی موسیٰ بن نصیر کی طرف سے دربارِ خلافت
میں بھیجا گیا تھا، اُسے رشوت دے کر دارالخلافہ دمشق جانے پر آمادہ کیا گیا۔ سرعت و
تعمیل کی تاکید کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طارق کی گراں قدر خدمات کو مدنظر رکھتے

ہوئے اس کی رہائی کا پروانہ جاری ہوا۔
دونوں سردار طلیطلہ پہنچے، وہاں دلوں کے میل صاف ہوئے۔ طارق نے
پیش کیا۔ سارے تحائف سامنے ڈھیر کر دیئے اور خمس کا مال بھی لا کر سجا دیا۔ موسیٰ
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، خصوصاً وہ میز دیکھ کر جسے حضرت سلیمانؑ کی ملکیت
جاتا ہے۔ گو اب اس کے صرف تین پائے باقی رہ گئے تھے، چوتھا غائب تھا، عقل
حیران ہو کر رہ گئی۔ موسیٰ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مالِ خمس امیر المومنین
لئے الگ رکھ لیا گیا، باقی کے حصے بخرے ہوئے اور اب آئندہ فتوحات کے
باہمی صلاح و مشورے ہونے لگے۔
عبدالعزیز پہلے ہی باقی علاقوں کو زیرنگیں کر کے مرسیہ اور پھر عبیلہ (بند) کی طرف
بڑھ چکے تھے اور انہیں اپنے مقبوضات میں شامل بھی کر چکے تھے۔
ادھر طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کی فوجیں مل کر ارغون کی طرف کوچ کر
لگیں۔ راستہ بہت خراب تھا، ندیاں بھی تھیں اور نالے بھی۔ میدان، جنگل جن
گرد کے طوفان اُٹھتے تھے۔ غرض بہت ہی دُشوار گزار راستوں کو طے کر کے یہ
صوبہ ارغون کے دارالسلطنت سرقسط جا پہنچے۔ راہ کی منزلیں طے کرنے کے لئے ہر
سوار کو ایک تانبے کا برتن دیا گیا جس سے کھانے اور پینے دونوں کام لئے جا
ایک چمڑے کی چھاگل پانی سے پُر، ایک تھیلا کھانے پینے کی چیزیں رکھنے کے لئے
گیا۔ بیچارے پیادوں کے پاس صرف اُن کے ہتھیار تھے۔ سامان تمام کا
باربردار خچروں پر لدا ہوا تھا۔
فوجی ضرورت کی ہر چیز اُن کے ساتھ تھی مگر کروفر نہ تھا جو ان دولت کے
لوازمات اور حشمت و طاقت کے باعث ہوا کرتا ہے۔ اُنہیں کھیتیاں جلانا منع
انہیں غیر فوجیوں سے تعرض منع تھا۔ آگ لگانا، بستیاں جلانا خلاف قاعدہ تھا۔
جذبات کا احساس رکھنے کی خاص ہدایت تھی۔ عورتوں سے تشدد، بچوں پر ظلم سخت
گناہ تھے۔ جو لوگ جنگ کے لئے آمادہ ہوں ان سے بلاشبہ کوئی رعایت نہ
جائے۔ مگر جو مصالحت کے لئے کوشاں ہوں اُن سے ہر نرمی برتی جائے۔
مگر دوسری طرف اہل ارغون اپنے پورے صوبے کو انتہائی محفوظ، ناقابل تسخیر

ناقابل عبور سمجھتے ہوئے شرارت ہی پر آمادہ رہے اور ہتھیار ڈالنے اور صلح کی جانب
بڑھنے کی بجائے ہتھیار ٹکرانے اور جنگ و جدل کرنے پر ہی تلے رہے۔ چنانچہ جنگیں
ہوئیں، ایک سرے سے دوسرے سرے تک، نہ حفاظتی تراکیب کام آئیں نہ نمائشی
بہادری اور دلیری۔ زمینیں ضبط کر لی گئیں، جائیدادیں چھین لی گئیں اور اُن سب پر
افریقیوں کو آباد کیا گیا اور تمام شرارت پسند عناصر کو ان کے ماتحت کر دیا گیا۔ شہریوں
پر ٹیکس لگایا گیا جو معمولی تھا مگر پہلی مرتبہ لگا تھا۔
وہاں کے گورنر حسین بن عبداللہ نے ایک مسجد تعمیر کی جس کے آثار آج بھی موجود
ہیں۔ ان سب سے فرصت پا کر قلونہ اور بلنسیہ (VALENCIA) پر چڑھائی کی گئی۔
انہوں نے معمولی مدافعت کے بعد ہتھیار ڈال دیےء۔ یہاں بھی کھیتیوں کو تباہ نہیں کیا
گیا، نہ بستیوں کو جلایا گیا۔ بلکہ وہاں بربر آباد کئے گئے جنہوں نے وہاں کی عورتوں
سے نکاح کئے اور گھر گرہستی جما کر بیٹھ گئے۔
اب ان دونوں سرداروں (طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر) نے اپنا رُخ مغرب
کی جانب موڑا اور انتہائی دُشوار گزار اور خاردار علاقوں سے گزر کر پہلے جلیقیہ پہنچے اور
پھر الیسترس (ALIESTRIAS) یہی دو صوبے ایسے تھے جو اب تک عیسائی
حکمرانوں کا دم بھرتے تھے اور اب تک انہی کے زیر اثر تھے۔ عیسائی مذہب کا اب بھی
یہاں عروج تھا اور پادریوں کا بڑا اثر تھا۔ کوئی بادشاہ تو باقی نہیں رہ گیا تھا مگر جہاں
جہاں کوئی امیر تھا وہی حاکم بن بیٹھا تھا۔ راہیں اتنی سخت تھیں کہ میلوں کسی آبادی کا پتہ
نہ تھا۔ یہ مسلمانوں ہی کے دل و جگر تھے جو ان خطرناک راستوں اور علاقوں سے بھی
نہ گھبرائے نہ ہمتیں ہاریں بلکہ منزلیں طے کرتے رہے اور ان علاقوں کو فتح کرتے
رہے اور انجام کار یہاں بھی ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کی آبادیاں
قائم کیں، اپنے گورنر مقرر کئے، محافظ فوج کے دستے چھوڑے، رعایا سے خراج بھی
وصول کیا، اطاعت کا سبق بھی سکھایا۔ مگر یہ علاقے اُندلس کی آخری حد تھے۔ اس کے
بعد اگر کچھ نظر آتا تھا تو کوہ پائرینس کی فلک بوس چوٹیاں جن میں اِکا دُکا درّے اور
تنگ گھاٹیاں تھیں ورنہ ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ۔
اور...... یہیں کھڑے ہو کر موسیٰ بن نصیر نے پورے یورپ کی فتح کا ایک عظیم

الشان خاکہ تیار کیا تھا۔ پورے اُندلس کو موسیٰ بن نصیر روندتے چلے آئے تھے اور
اپنے قدموں تلے حکومت فرانس کو بھی کچلنا چاہتے تھے جو اپنے رُعب، دبدبے
شان و شوکت میں اُندلس سے کم حیثیت اور اہمیت نہ رکھتی تھی۔

مؤرخین اختلاف رکھتے ہیں اس نظریئے سے کہ موسیٰ واقعی فرانس میں داخل ہو
بھی کہ نہیں اور اُنہوں نے کچھ علاقے فتح بھی کیئے کہ نہیں۔ یہیں موسیٰ بن نصیر
طارق بن زیاد کو خلیفۃ المسلمین کا پروانۂ واپسی ملا اور اس کی تعمیل میں وہ خوا
ادھورے ہی رہے اور ان کے تانے بانے بکھر کر رہ گئے۔ طارق بن زیاد اس وق
"استورگا" میں تھے اور موسیٰ بن نصیر "لیوگیو" میں تھے جب کہ ایک برق رفتار نامہ
"ابونصر" اُن کے پاس اس حکم کے ساتھ پہنچا کہ مزید پیش قدمی کی کوئی گنجائش نہیں
دونوں سردار بارگاہِ خلافت میں حاضری دیں۔

حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ دونوں سردار کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اُن کے منہ پر جی
تالے لگ گئے۔



طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کے ساتھ براعظم افریقہ سے جو فوجی آئے تھے اُن
کا مقصد اسپین میں لوٹ مار کرنا نہیں بلکہ وہ وہاں برائیوں کا ازالہ کرنے آئے تھے،
نیکیوں اور خوبیوں کی بنیادیں ڈالنے آئے تھے۔ وہ بدکاری اور زناکاری کا خاتمہ کر کے
نیک طینتی اور شرافت کا پرچم لہرانے آئے تھے۔ وہ اپنے ہمراہ وہ سب کچھ لے کر
آئے تھے جس کے لئے اہل اُندلس صدیوں سے ترس رہے تھے۔

اُندلس ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہاں یکے بعد دیگرے
مختلف قومیں اپنی قوت اور جبروت کا مظاہرہ کرتی رہیں اور اس سرزمین کو روندتی اور
کچلتی رہیں۔ اگر ہم عیسائی مؤرخین کے حوالے بھی نظر میں رکھیں جن میں علامہ
ڈوزی، ڈاکٹر کونڈے، اسکاٹ، لین پول وغیرہ مقبول ہیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوگا کہ نہ
اہل ٹونیشیا، نہ رومنوں، نہ یونانیوں، نہ گوتھوں نے اُندلس کو وہ سب کچھ دیا جو ان کے
خیال کے مطابق غیر مہذب، بد اخلاق، وحشی، ڈراؤنی صورت اور بھدے لباس پہننے
والے مسلمانوں نے دیا۔ جبکہ اس وقت طاقت اور قوت، جبر و تشدد ہر چیز پر حاوی تھا۔

لوگ قانون سے ڈرنا تو کجا اُس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ احکامات کی خلاف
ورزی کرنے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ خود بادشاہوں کے احکام اُن کے محل میں بھی
نہ مانے جاتے تھے۔ لوگ نظم و ضبط سے جلتے تھے، ہر طرف سازشیں تھیں، نمک
حرامیاں اور بے ایمانیاں تھیں، بدکاریاں اور شہوت رانیاں تھیں۔ ہر بات میں نام و
نمود کا خیال تھا۔ ظاہری زیبائش، نمائش مقصد حیات تھا۔ دربار شاہی مفت خوروں،
غلط لوگوں، مسخروں، بازی گروں اور خوشامد خوروں سے پُر تھا۔ یہی حال ہر امیر اور
رئیس کے گھر کا تھا۔ بعض اُمراء اور رؤسا، شہنشاہوں سے بھی زیادہ ٹھاٹ باٹ سے
رہتے تھے۔ ان کا تمام تر رجحان عیش و عشرت کی طرف تھا اور ہر طرف عورتوں کا ذکر

ہوتا تھا۔

ہر طرف حسن کا چرچا تھا۔ جہاں دیکھو ساغر و مینا کی کھنک تھی۔ جس طرف نگاہ دلربا ساقی کے گھنگھروؤں کی چھنک تھی۔ نہ کسی کو قومی غیرت کا پاس تھا اور نہ کسی قدر و منزلت کا لحاظ، نہ مردانگی پر فخر نہ جوہر انسانی پر افتخار، نہ سپاہیانہ طرز حیات، بہادری و دلیری، نہ کوئی مرکزی حکومت، نہ کوئی برسرِ اقتدار طاقت۔ دیکھو مذہب کا دور دورہ تھا۔ پادریوں کی بات بھی چلتی تھی۔ سینٹ صوفیا پوپ روم، بس انہی کا حکم تھا اور خود ان کا یہ حال تھا کہ تزک و احتشام اور شان و شوکت دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ گرجے محل سراؤں سے کر تے تھے۔ کلیسا، حرم سراؤں کو مات کرتے تھے۔ یہاں راہبائیں تھیں جو فحاشی بدکاری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ یہاں نازک اندام اور خوش شکل لڑکے غلمان کو بھی شرمندہ کرتے تھے۔ اُن سے ہر قسم کا اختلاط جائز تھا۔ شراب اور خوبصورت اور خوش انداز لڑکیوں سے اختلاط مذہبی شرائط کے تحت قابل قبول تھا۔ ڈاکٹر اسرار کہتے ہیں بہر نوع، بہر طور مسیح علیہ السلام کے دین کی حسن و خوبی اور نرمی تشریف جا چکی تھی اور اس کی جگہ دورِ جہالت اور منہ کالا کرنے والا قانون رائج تھا۔

کہنے کو تو عدالتیں بھی تھیں، دفاتر بھی، فوجی نظم و نسق بھی مگر عمل صرف انہی قوانین پر ہوتا جو بادشاہ، اُمراء یا اہلیانِ کلیسا کے حق میں مفید ہوتے تھے اور جن کا شکار منظم طور پر غریب رعایا ہوتی تھی۔ پادریوں کو، اسقف کو یا دیگر اہل کلیسا کو عدالتیں طلب کر سکتی تھیں مگر اُن کا بگاڑ کچھ نہ سکتی تھیں۔ امراء اور رؤسا پر تادیبی کارروائیاں تو سکتی تھیں مگر ان پر عمل احاطۂ عدالت میں بھی نہ تھا۔ برخلاف اس کے رعایا کے ہر پر قانون لاگو تھا، ہر دفعہ اُن پر حاوی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر عوام کو کوڑے لگائے جاتے، اُنہیں داغا جاتا، جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا، کڑی سے کڑی محنت اور مشقت جاتی اور بعض اوقات تو دل ہلا دینے والی سزائیں دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ ہر شخص پر فوجی خدمت لازمی تھی۔ بجز مذہبی اصحاب کے۔ سزا کے بچنے کے لوگوں نے سر منڈوا کر پادریوں جیسا لباس پہننا شروع کر دیا تھا اور وہ ہر خدمت سے بری ہو گئے تھے۔

گوتھک شاہوں نے اس لا قانونیت کو روکنے اور کلیسا کا اس قدر اقتدار بڑھنے کی روک تھام کے لئے بہت سے قوانین وضع کئے۔ کئی بار کونسل کے اجلاس طلب ہوئے اور 479ء میں قانون کی ایک بہت بڑی کتاب ''کتاب الفقھا'' بھی شائع کی۔ جس میں عدالتوں کی برتری ثابت کی گئی۔ بادشاہ کو وقت کی سب سے بڑی طاقت منوایا گیا۔ کلیسا کی ایک الگ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ مگر نتیجے میں وہی ڈھاک کے تین پات۔ اور جب چھٹی صدی عیسوی میں گوتھک شہنشاہ نے مذہب عیسوی اور رومن کیتھولک قبول کر لیا تو پھر ہر طرف چرچ ہی چرچ کا بول بالا ہو گیا۔

یہ سب کچھ تو خیر تھا ہی، مگر عوام کی حالت بہت بدتر تھی۔ اُن کی معاشی بدحالی، بے روزگاری، بے چارگی انسانیت پر نوحہ کناں تھی۔ عوام پر رؤسا اور حکام جس قسم کے مظالم چاہیں روا رکھ سکتے تھے۔ اُن کی جائیدادوں کو ضبط کر سکتے تھے، اُن کے گھر بار کو آگ لگوا سکتے تھے، اُن کے بیوی بچوں کو کولہو میں پلوا سکتے تھے۔ اُن کی بہو بیٹیوں کو زبردستی حرص و ہوس کی آسودگی کا آلہ بنا سکتے تھے۔ اُن کو جلا وطن کر سکتے تھے۔ اُن کے بیٹے بیٹیاں اور اُن کے بھی بیٹے بیٹیاں محض غلام اور کنیزیں رہتیں۔ آقاؤں کو اُن کی جان تک لینے کا حق تھا۔ اگر کوئی غلام کسی سے ناجائز تعلق پیدا کر لیتا تو اُسے زندہ جلا دیا جاتا۔ جو شخص کلیسا، حاکم اور بادشاہ وقت کی خدمت کرتا اُس کو بھی بحیثیت غلام فروخت کر دیا جاتا۔ عورتوں کی شرمگاہوں کو داغا جاتا، جو شخص کسی کا قرض ادا نہ کر پاتا اُسے قرض خواہ کا غلام بنا دیا جاتا۔

اس دور میں کسانوں سے کام تو لیا جاتا اُجرت نہ دی جاتی تھی۔ وہ کھیتی باڑی تو کرتے تھے مگر فصل بکنے پر رقم پر اُن کا کوئی اختیار نہ ہوتا تھا۔ درمیانے طبقے پر ٹیکسوں کی بھرمار اور آمدنی کے ذرائع تنگ ہونے کی وجہ سے زندگی عسرت اور تنگ دستی میں گزرتی۔ غریبوں پر ہر قسم کی پابندیاں عائد تھیں، وہ اپنی اولاد (لڑکی، لڑکا دونوں) کی شادی بھی بغیر اجازت نہ کر سکتے تھے۔ اگر کسی غریب کی کوئی لڑکی اتفاق سے خوبصورت ہوتی تو اُس کے لئے امیروں اور رئیسوں میں جنگ کا بازار گرم ہو جاتا۔ اس تمام ہنگامے میں لڑکی کا باپ محض ایک تماشائی ہوتا۔ وہ ان کو اس بربریت اور ذلت سے روک نہیں سکتا تھا۔ اُن کی یہ بدحالی اور خستہ حالی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ان میں عسرت اور غربت کا بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

مشہور ہے کہ یہودی جہاں بھی رہیں، وہ ایسی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں جس سے اُن کی اور یہودی قوم کی فلاح و بہبود ہو۔ مگر مسلم سپہ سالار موسیٰ بن نصیر نے حالات کو اس طرح قابو کیا تھا کہ وہ جہاں ہوتے، یہودیوں کی وہاں قطعی دال نہ گلتی۔ وہاں اُس دور میں یہودیوں کے ایسے فرقے تھے جو بدحال ہو رہے تھے۔ یہ صرف موسیٰ بن نصیر کی حکمت عملی تھی، اُس نے اس طرح کے قانون اور احکامات وضع کئے تھے جس سے یہودیوں کا دیوالیہ نکل گیا تھا۔

پہلے یہودیوں کا اس قدر اقتدار تھا کہ کیا بچے، کیا جوان، کیا بوڑھے اور کیا عورتیں سب کو دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ فصلیں تیار ہوتیں تو یہودی جگہ جگہ برکت کی دُعا دیتے نظر آتے، اس کے بعد ہی فصلیں کاٹی جاتیں۔ جب کوئی مکان یا کارخانہ تعمیر ہوتا تو یہودی اُن میں اذانیں دیا کرتے۔ مگر مذہب عیسوی کے ٹھیکیداروں کی طرف سے جلد ہی ایسے قوانین پاس ہوئے جن کے تحت یہودیوں سے دُعائیں لینا اور دُعائیں کرانا جرم قرار دے دیا گیا اور سزائیں مقرر کی گئیں۔ دُعائیں دینے والے اور دُعا کرانے والے دونوں ہی کو شہر بدر کر دیا جاتا۔

موسیٰ بن نصیر، یہودیوں کے اس قدر خلاف تھے کہ اُنہوں نے اپنے ایک حکم کے تحت یہودیوں کے ساتھ کھانا کھانا یا کھلانا دونوں ہی باتوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ یہاں تک کہ یہودیوں سے بے اعتنائی کو مذہبی خوش عقیدگی میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یہودیوں میں اگرچہ تجارت اور حرفت کی قابلیت تھی مگر وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اُٹھا سکتے تھے۔ کسی کسی دور میں اُن کی حالت ذرا سنبھل جاتی، ورنہ عام طور پر وہ خستہ حال اور پریشان و لاچار ہی نظر آتے تھے۔ اُن کی خوشحالی اور اقتدار کو ختم کرنے کے لئے مسلم دور میں اہالیانِ کلیسا روز نت نئی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔

یہودیوں کے سلسلے میں شاہ اُندلس راڈرک کے زمانہ میں مثلاً 709ء میں بے انتہا دخل اندازی کی گئی تھی۔ اُنہیں زبردستی عیسائی بنا لیا جاتا تھا، اُن کی بیویوں اور بیٹیوں کو سرِ عام رُسوا کر کے نیلام کرنے کا دستور تھا۔ اور جو عیسائی بننے پر آمادہ نہ ہوتے اُنہیں غلام بنا لیا جاتا۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر اُن کی توہین کی جاتی۔ اکثر اوقات اُن کی

جائیداد کی کل آمدنی ضبط کر لی جاتی۔ پھر بھی یہ قوم ایسی سخت جان تھی کہ جہاں موقع ملتا اور ذرا نجات ملتی وہیں پھلنے پھولنے لگتی۔

پھر جب مسلمانوں کا زمانہ آیا اور یہودیوں کو موسیٰ بن نصیر جیسا حکمران ملا تو اُن کی چاندی ہو گئی۔ مسلمان اپنے ساتھ محبت، اخوت، مروت، مساوات، رحمدلی، خوشحالی، بہتر اصول اور عمدہ نظام لائے تھے۔ پھر یہودی اُنہیں کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ مسلمان آندھی اور طوفان کی طرح اُندلس میں داخل ہوئے تھے۔ اُس وقت یہودیوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ مسلمان اتنی عظیم فتوحات حاصل کریں گے کہ دیکھتے ہی دیکھتے حملہ آور سے حکمران بن جائیں گے۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی کیا ہوتا ہے جس کے دوران اُنہوں نے ملک کے چپے چپے پر اسلام کا علم نصب کر دیا۔ اس کے گوشے گوشے پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ ایک تنگ سی آبنائے (جبرالٹر) سے لے کر کوہ پائرینس تک مسلمانوں ہی کا بول بالا تھا۔ بحر شام سے لے کر بحر محیط تک انہی کا طوطی بول رہا تھا۔

مسلمان جس تیزی سے بڑھے، اُنہوں نے جس تیزی سے غلبہ حاصل کیا اُس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ پلک جھپکاتے اُنہوں نے زنگ خوردہ، تنگ نظر اور تشدد آمیز قوانین کو تہس نہس کر دیا اور اس کی جگہ وہ قانون نافذ کیا جس میں آقا اور غلام برابر تھے۔ جس میں امیر و غریب یکساں رہنے والے تھے، جس میں حاکم اور محکوم ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھے۔ بادشاہ اور رعایا ایک ہی تسبیح کے دانے تھے۔ جس میں زمیندار اور کسان ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ جہاں بھائی چارہ تھا، محبت تھی، یگانگت تھی۔ جہاں نسلی اور جبلی امتیاز ختم ہو کر رہ گیا تھا، جہاں امیری اور غریبی کا فرق مٹ گیا تھا، جہاں یہود و نصاریٰ کا لقب ختم ہو کر رہ گیا تھا، جہاں مذہب و ملت کی تفریق گم ہو کر رہ گئی تھی، جہاں مستحقین کو وہ سب کچھ بخشا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ جہاں وٹیزا کی اولاد اور اُس کے بھائی اوپاس (OPHAS) کو وہ سب کچھ دیا گیا جس کے اُن سے وعدے کئے گئے تھے، جہاں یہودیوں کو وہ ساری جائیدادیں دلائی گئیں جو غصب کر لی گئی تھیں، جہاں مزارعین کو پوری منفعت حاصل کرنے کا حق دیا گیا، جہاں ٹیکس صرف تین روپے سالانہ فی کس مقرر کیا گیا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔

یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا؟ یہ ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ متوسط طبقے کے ساتھ

خاص مراعات برتی گئیں۔ کیونکہ ملک کی فلاح و بہبود انہی لوگوں سے وابستہ ہو
تھی۔ اُن پر سے تمام سختیاں اور پابندیاں ہٹالی گئیں۔ اُن کو اُن کے کاموں میں سر
کی طرف سے ہر مدد کا وعدہ کیا گیا، اُن کی صنعت و حرفت کو شاہانہ سرپرستی بخشی گ
اُن پر جو بے جا ٹیکس عائد تھے وہ معاف کر دیئے گئے، اُنہیں حکومت کا خاص اَنگ
اور رُکن سمجھا گیا۔

اُندلس جو ساری دنیا سے الگ تھلگ گمراہیوں اور بدکاریوں کا مرکز تھا وہ خوش
اخلاقیوں اور نیک چلن والوں کا مرکز بن گیا۔ خانقاہیں، وہ خانقاہیں نہ رہیں جو پہلے
تھیں بلکہ اُن کی اصلاح کی گئیں۔ بدکار اور فاحشہ عورتوں کو وہاں سے نکالا گیا۔ حرص
ہوس کے سامان کو مٹا ڈالا گیا، پادریوں کے اخلاق کو سنوارا گیا، اُمراء اور رؤسا کے
کردار کو سنبھالا گیا، ظاہری اسباب نام و نمود ضبط کر لئے گئے۔ نمائشی چیزوں کو چھین لیا
گیا اور راہبوں اور راہباؤں کو نیک چلنی اور صالح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔
غلاموں کو دُکھ دینے یا ظلم کرنے پر سزائیں مقرر کی گئیں، اُن کے حقوق قائم کئے گئے
اُن پر مظالم روا نہ رکھے گئے۔ استبداد اور ظلم منع کر دیا گیا، تشدد ختم کر دیا گیا۔ اب اُن
کو بلاوجہ سزائیں نہ دی جا سکتی تھیں۔ عورتوں کو بھیڑ بکری کی طرح سمجھنے اور استعمال
کرنے سے جبراً روک دیا گیا، اُن کی فلاح کے لئے قانون کا اجرا ہوا۔ اُن کی بہبود کی
خاطر لوگوں کو اپنے دیرینہ طرزِ عمل بدلنے پر مجبور کیا گیا، اُن کے ساتھ ناروا سلوک
رکھنا، اُن کو محض تفریح یا سامانِ تعیش سمجھنا آئینی طور پر غلط تھا۔ اُن سے کھلے بازار
جبراً بداخلاقی کا مرتکب ہونا کڑی سے کڑی سزا کا مستوجب تھا۔

یہ مسلمانوں ہی کا دم قدم تھا اور یہ سب موسیٰ بن نصیر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ
اُندلس کے لوگوں میں ازسرنو جذبات حب الوطنی پیدا ہوئے۔ ملک کے ساتھ وفاداری
کا جذبہ اُبھرا۔ جانثاری کا جذبہ عود کر آیا۔ قوم اور ذات کی قیود سے علیحدہ ملک کی
حفاظت اپنا ایمان سمجھنے لگے۔ ملت یا مذہب کے بغیر ملک کی ترقی اور بہبود اپنا فریضہ
گردانے لگے۔ نفسانفسی اور صرف اپنا خیال مٹ کر رہ گیا اور دوسروں کی خیر و فلاح
اولین فریضہ قرار دی جانے لگی۔ ذاتی اقتدار کی جگہ ملی اقتدار نے لے لی۔ افراد کے
تسلط کے بجائے قوم کا تسلط چھا گیا۔ فرقہ بندی کا نشان نہ رہا، گروہ بندی کا نام نہ

رہا۔ قدیم تہذیب تمدن کی بنیادیں اس طرح بھک سے اُڑ گئیں جیسے اُن کے نیچے
سرنگ لگی اور اُن پر بارود بچھا دی گئی ہو۔ ادھر ایک دیا سلائی جلائی اُدھر ہر چیز بھک
سے اُڑ گئی۔ یہی اصول تھے، یہی خوبیاں تھیں کہ مسلمانوں کو یہودیوں نے بھی ہاتھوں
ہاتھ لیا، عیسائیوں نے بھی، مری ہوئی رعایا نے بھی، دل جلے حاکموں نے بھی۔
مسلمانوں کی آمد ایک فالِ نیک اور ایک سعادت عظمیٰ تھی۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ مسلمان، اُندلس میں ایک اجنبی کی طرح داخل ہوئے تھے
جن کی کوئی بات وہاں کے لوگوں سے مطابقت نہ رکھتی تھی، جن کا کوئی انداز، مفتوحین
سے مماثلت نہ رکھتا تھا۔ مگر مسلمان اُندلس میں اس طرح چھائے کہ عیسائیوں کو
مسلمانوں کے بارے میں اپنے خیالات بدلنا پڑے۔ شروع میں تو ایسا ہوا کہ عیسائی
اور یہودی، مسلمانوں کے مذہب اور تمدن سے نا آشنا تھے اور انہیں بیگانہ اور غیر سمجھتے
تھے۔ مگر اس مختصر میل سے وہ مسلم تہذیب، تمدن اور اخلاق کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ
بے تحاشہ اسلام قبول کرنے لگے۔ اب انہوں نے اپنی سازشوں اور چالوں کی بجائے
تخت و تاج کے حصول کا طریقہ ہی بدل دیا۔ ان کے امیر اب نامزد ہوتے تھے جو
بہرصورت عظیم الشان اہلیت کے مالک ہوتے تھے۔ رعیت جو پہلے کبھی محفوظ اور کبھی
غیر محفوظ رہی تھی اور جنہیں ہمیشہ غیر ملکیوں اور قزاقوں کے حملوں کا خدشہ رہتا تھا،
مسلمانوں کی آمد نے انہیں اس خوف و دہشت سے نجات دلا دی تھی اور اب وہ خود کو
محفوظ اور امن و امان میں سمجھنے لگے تھے۔

اُندلس کے عیسائی، یہودی اب مسلمان قوم کو جھولیاں بھر بھر کے دُعائیں دیتے
تھے۔ موسیٰ بن نصیر کو تو اُنہوں نے ایک دیوتا کا درجہ دے دیا تھا اور وہ مسلمانوں کو اپنا
وارث اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ مقامی تعصبات جو ترقی میں ہمیشہ رخنہ بنے رہتے تھے وہ مٹا
دیئے گئے تھے، اس کی بجائے ملک کی ترقی اور خوش حالی میں ہر ملت و مذہب کے
افراد کو شامل کیا گیا تھا۔ سزاؤں کا وہ دل دہلا دینے والا طریقہ ختم کر دیا گیا تھا، اور
اب سزائیں جرم کے مطابق دی جاتی تھیں جن میں بہیمیت کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا۔
چوراچکوں اور ڈاکوؤں کی بیخ کنی کر دی گئی تھی اور رعیت کو اُن کے عذاب سے نجات
مل گئی تھی۔

اس کے علاوہ غریب اور محنت کش کسانوں کی محنت اب رائیگاں نہیں جاتی تھی بلکہ
اُنہیں اُن کی محنت کا حسب قانون معاوضہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ جب محفل میں موسیٰ
بن نصیر کا نام آتا تو لوگ با ادب ہو جاتے تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ سارا انقلاب
اسلام کا لایا ہوا تھا۔ اور اسلام کو لانے والے موسیٰ بن نصیر اور اُن کے خاندان کے
افراد تھے جنہوں نے اس جنگل میں منگل کا منظر پیش کر دیا تھا۔ کاشتکاروں میں بیج،
کھاد اور بیل وغیرہ مفت بہم پہنچائے جاتے تھے، غربت کو خدا کا سب سے بڑا عذاب
سمجھا جاتا تھا۔ جو نادار، یتیم اور لاوارث تھے اُنہیں خزانۂ شاہی سے عطیات
انعامات ملتے تھے۔ مالِ غنیمت اور زکوٰۃ میں اُن کا حصہ ہوتا تھا اور ہر ایک سے
انصاف کی کوشش کی جاتی تھی۔ اب ملک کی حفاظت ہر فرد و بشر پر واجب تھی۔
اندرونی حفاظت صرف مسلمانوں کے ذمہ تھی۔

پھر جب یہاں آبادیاں قائم ہونا شروع ہوئیں تو یہاں کے قدیم باشندوں کے
ساتھ مصالحت کے ذریعہ رشتے جوڑے، اُن کو اپنے برتر اخلاق اور بہتر عمل سے اس
حد تک مرعوب اور متاثر کیا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں ہی کو واحد نجات دہندہ سمجھنے
لگے۔ اب اُنہیں مسلمانوں کی موجودگی گراں نہ گزرتی بلکہ ایک نعمت نظر آنے لگی۔

اب معمولی سے معمولی آدمی خود کو محفوظ سمجھتا اور عدل و انصاف کا طلبگار ہوتا۔ اب
کٹر سے کٹر مذہبی انسان بھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ اُن کو اپنے مذہبی فرائض بجالانے
میں کوئی دقت ہو گی۔ ہر شخص جس پر کوئی زیادتی ہوتی، وہ بلا روک ٹوک انصاف کے
لئے حاکم وقت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا۔

اہلیانِ کلیسا کو بھی اپنے گمراہ کن اصول بدل کر نیک اصول اختیار کرنا پڑے اور
رومن کیتھولک کہنے کو تو اب بھی مسلمانوں کو قزاق اور خائن کہتے تھے، مگر دل ہی دل
میں اُن کی حرکات وسکنات اور خوش خلقیوں کے معترف تھے۔ وہ اپنی بدکاریوں پر
لعنت و ملامت کرتے تھے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اُن کو بھی اپنے اطوار بدلنا پڑے اور
محسوس ہونے لگا کہ وہ الزامات جو وہ مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور اُکسانے کے
لئے لگایا کرتے تھے وہ محض بے بنیاد اور عناد پھیلانے کے لئے تھے۔ وہ اگر اپنے
طریقوں کو نہ بھی بدلنا چاہتے تو اُن کی من مانی نہ چل سکتی تھی۔ راہبات اب عیش

عشرت اور کج اخلاقیوں سے عاجز آ کر واقعی ایک شرافت اور عزت کی زندگی گزارنا
چاہتی تھیں۔

پھر ہوا یوں کہ راہبات نے کلیسا چھوڑ کر اسلام کے دامن میں پناہ لینا شروع کی۔
یہ ایک ضرب کاری تھی اُن کے طریقوں پر۔ قربان گاہوں پر قربانیاں نہ دی جا سکتی
تھیں۔ اب مذہبی رسوم میں دنیا داری اور نمائش شامل نہ ہو سکتی تھی۔ اب ہر طرف
نیکیوں کا دور دورہ تھا، اچھائیوں کا چرچا۔ مگر فاتحین تنگ نظر نہ تھے، اُنہوں نے یہاں
بھی اچھے قوانین کا احترام کیا۔ یہاں کے مناسب دستوروں کو بدلا نہیں، اُنہوں نے
یہاں کے اصولوں کو خواہ مخواہ گزند نہ پہنچائی بلکہ غیر مسلموں پر اسلام کے وہی قانون
لاگو کئے جو اُن کے مذہب اور عقائد سے ٹکر نہ کھائیں اور اُن کے اصولوں کے خلاف
نہ جائیں۔ اُن کے طریقوں کے منافی نہ ہوں۔

پس رعایا خوش ہو گئی۔ یہودی مرفہ الحال، غلام آزاد اور قوانین با حیا اور با حجاب۔
متوسط طبقہ مطمئن اور مسرور، دہقان شاداں اور فرماں، تلخیاں ختم، گمراہیاں ختم،
بداخلاقیاں ختم، بدیاں ختم اور بدتمیزیاں ختم۔

مگر بات یہیں تک پہنچ کے ختم نہ ہوئی۔ جہاں لاقانونیت اور بے ضابطہ پن کا دور
دورہ ہو وہاں قانون اور ضابطہ کا نفاذ آسان کام نہیں مگر ان کلمہ گو مسلمانوں کے دلوں
میں، انّ محمد رسول اللہ کہنے والوں کے خیالوں میں جو جذبہ کارفرما تھا اس میں ایک
آہنی عزم تھا، ایک جذبۂ عمل تھا، ایک اخلاق تھا۔ وہ سرزمین اُندلس پر آئے ہی تھے
اللہ کا نام اور اُس کے قانون کا بول بالا کرنے کے لئے۔ پھر بھلا وہ ایسے طریقے کیونکر
اختیار کر سکتے تھے جس کی وجہ سے قرآنی احکام اور شرعی اصولوں پر ضرب پڑتی؟

پس تمام مفتوحہ زمین کی پیمائش کی گئی۔ وہ جاگیردار، زمیندار اور نواب جو زمینوں کو
چھوڑ کر بھاگ گئے تھے یا لڑائی میں مارے گئے تھے، اُن کی زمین مسلمانوں میں تقسیم
کی گئی۔ مختلف مقامات پر، مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگ بسائے گئے۔ آباد
کاری کے لئے ہر وسیلہ اور ہر سہولت بہم پہنچائی گئی۔ کہیں یمنی ہے تو کہیں حجازی، کہیں
شامی تو کہیں ایرانی، کہیں افریقی تو کہیں مصری۔ اس طرح بھانت بھانت کے لوگ
ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئے۔

بیرونی حملوں سے حفاظت کے لئے تمام قلعوں کی پھر سے مرمت ہوئی۔ نئے نئے
قائم ہوئیں، نئے اور مضبوط قلعے تیار ہوئے، سرحدوں پر چوکیاں قائم ہوئیں، بڑ
فوجی چوکیاں قائم ہوئیں۔ دُور دراز علاقوں میں خبر رساں ایجنسیاں قائم ہوئیں۔
مقامات پر فوجی چھاؤنیاں بنائی گئیں جو کسی بھی حملے کی بروقت مدافعت کر سکتی تھیں
اس طرح ایک سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُندلس کی سرحد، سرحد نہیں
لوہے اور سیسے کی دیواریں ہیں جن پر ہر چوٹ بیکار اور ہر ضرب ناکارہ ہے۔

مگر بات صرف یہیں تک پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی، لطف تو تب ہے کہ اسلام
دشمن اور مسلمانوں کے مخالف، خود ان کی تعریف کریں اور ان کی حکومت کے
ہوں۔ علامہ ڈوزی نے ہمیشہ چوٹ کی مسلمانوں اور اسپین پر۔ اُن کے حق کو غاص
کا حق سمجھا اور جب بھی موقع ملا تو دل کے پھپھولے پھوڑے۔ وہ بھی اس حقیقت
سے انکار نہ کر سکے کہ یہ اسپین کی فتح کتنی ہی برائیوں کی بیخ کنی اور کتنے ہی ا
اصولوں کی ابتداء تھی۔ اُن کے نزدیک بھی اسپین کی فتح اہل اسپین پر بجز ابتدائی
کے کوئی خاص مصیبت نہیں لائی بلکہ اس حد تک بھی متاثر نہیں ہوئی جتنا کہ "ٹیوٹا
کے حملے کے وقت ہوئی تھی۔ شروع شروع میں کچھ قتل و غارت گری ضرور ہوئی جو
ہر جنگ میں ناگزیر ہوتی ہے، اس کے بعد عربوں نے بہت جلد حالات پر قابو پا
اور جور و ستم، ظلم و بربریت، استبداد اور بے ضابطگی کا ازالہ کر کے امن و آشتی کا ما
پیدا کر دیا۔

عربوں کا آغاز سے لے کر انجام تک دورِ حکومت قابل برداشت ہی نہیں بلکہ
تھا۔ ہر مزاج کے لئے اور ہر دل کے واسطے عربوں نے مفتوحین کے قوانین پر ہا
نہیں ڈالا بلکہ اُن کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ اُن کے ججوں اور منصفوں کو بھی اسی طر
بحال رکھا جو کسی اور فاتح کے ہاتھوں ممکن نہ تھا، تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف و
جائیدادیں اور علاقے مسلمانوں نے آپس میں تقسیم کئے جن کو اُنہوں نے بزورِ شمشیر
فتح کیا تھا کیونکہ ان کے مالکان کا اب کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان زمینوں
پرانے کاشتکاروں کو بھی بحال رکھا بلکہ اُن کے حقوق میں اضافہ کر دیا گیا۔ مالگذار
کوئی بار کاشتکاروں پر نہ تھا۔ کاشتکاروں کو بونے جوتنے کی مشقت کے عوض تہا

فصل میں ایک چوتھا حصہ مل جاتا تھا۔ ڈوزی کے نزدیک بھی یہ ایک اچھا ہی طریقہ
تھا۔

فاتح اسپین موسیٰ بن نصیر، یورپ کے نہیں بلکہ افریقہ کے باشندے تھے۔ وہ عیسائی
بھی نہیں تھے بلکہ مسلمان تھے۔ اُن کی کوئی بات اسپین والوں سے مطابقت نہیں رکھتی
تھی، اُن کا کوئی انداز مفتوحین سے مماثلت نہ رکھتا تھا۔ مگر یہ دیندار مسلمان اسپین میں
کچھ اس طرح چھائے کہ ملکیوں کو غیر ملکیوں کے متعلق اپنے نظریات بدلنا پڑے، اپنے
عقائد مختلف کرنا پڑے۔ یا تو وہ لوگ مسلمانوں کو تہذیب و تمدن سے بالکل بیگانہ اور
ناآشنا سمجھتے تھے یا پھر وہ ان غیر ملکیوں کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ بے تحاشہ مذہب
اسلام قبول کرنے لگے۔ انہوں نے سازشوں اور چالبازیوں کو حصولِ تخت و تاج کا
ذریعہ بنانا ختم کر دیا۔ اُن کے امیر اب نامزد ہوتے تھے جو بہر طور اور بہر صورت یگانۂ
روزگار اور عظیم الشان اہلیت کے مالک ہوتے تھے۔ رعایا جو کبھی محفوظ اور کبھی غیر محفوظ
رہتی تھی اور جنہیں ہمیشہ بیرونی حملوں یا قزاقوں کے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا، اُس
کے کرب اور خوف سے وہ نجات پا گئے تھے اور اپنے آپ کو محفوظ اور امن و امان میں
سمجھنے لگے تھے۔ قومی تعصبات جو قومی ترقی میں ہمیشہ رخنہ بنے رہتے تھے، مٹا دیئے
گئے اور اُن کی جگہ ملک کی ترقی اور خوشحالی میں ہر مذہب اور ملت کے فرد کو شریک کار
کیا گیا۔ سزاؤں کا وہ پچھلا دل ہلا دینے والا طریقہ ختم کر دیا گیا اور اب سزائیں جرم
کی مطابقت سے دی جانے لگیں جن میں بہیمیت کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا۔ چوروں اور
ڈاکوؤں کی بیخ کنی کی گئی اور رعایا کو اُن کے شر سے محفوظ کیا گیا۔ کاشتکاروں اور
کسانوں کی محنت اب رائیگاں نہ جاتی تھی۔ بیج، کھاد اور بیل وغیرہ مفت فراہم کئے
جانے لگے۔ غربت کو خدا کا سب سے بڑا عذاب سمجھا جانے لگا۔

یہ سب کچھ اپنے آپ تو نہیں ہوا۔ پہلے اس ملک اسپین میں خاک اُڑتی تھی۔ ہر
جگہ ناداروں، یتیموں اور لاوارثوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ مگر موسیٰ بن نصیر نے یہاں قدم
رکھا تو جیسے یہاں کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس مردِ جری اور اس کے فوجیوں نے مقامی
لوگوں کو سمجھایا کہ اپنے ملک کی حفاظت ہر فرد اور قوم پر واجب ہے۔ مگر اندرونی
حفاظت صرف مسلمانوں کے ذمے ہے۔ جب اُنہوں نے یہاں آبادیاں قائم کرنا

شروع کیں، یہاں کے قدیم باشندوں سے مصالحت کے ذریعے رشتے جوڑ اُنہیں اپنے بہترین اخلاق سے اس حد تک متاثر کیا کہ اُن کو اب مسلمانو موجودگی گراں گزرنا تو درکنار ایک نعمت یزداں نظر آئی۔ اسپین والوں کے لئے بن نصیر اور اُس کے فوجی ایک نعمت یزداں نظر آنے لگے۔ اب ادنیٰ سے ادنیٰ آدی کو محفوظ سمجھتا اور اپنے دینی فرائض ادا کرنے میں کوئی دقت نہ محسوس کرتا۔ جس شخص ذرا بھی ظلم ہوتا وہ فوراً حاکم وقت کا دروازہ ہر وقت کھٹکھٹا سکتا تھا۔ اس طرح مسلمانو کی آمد سے اہالیانِ کلیسا کو بھی اپنے گمراہ کن اصول چھوڑ کر اپنے مذہب میں نئے اصول داخل کرنا پڑے۔

رومن کیتھولک، مسلمانوں اور موسیٰ بن نصیر کے ساتھیوں کو اب بھی قزاق غاصب کہتے تھے مگر دل ہی دل میں اُن کی حرکات اور سکنات کے معترف تھے اور اپنے لوگوں کی بدکاریوں پر لعنت و ملامت کرتے تھے۔ پھر اُنہوں نے علی الاعلان کہنا شروع کر دیا کہ مسلمان اور افریقہ سے آنے والے یہ لشکری سپاہی اس دنیا کے نہیں بلکہ آسمانی فرشتے ہیں جو اُندلس والوں کی تقدیر بدلنے آئے ہیں۔ رفتہ رفتہ اُن بھی اپنے طور اطوار بدلنا پڑے اور یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ جو غلط الزام مسلمانوں لگاتے تھے وہ محض بے بنیاد اور صرف عناد پھیلانے کی غرض سے تھے۔

عیسائی مذہب کی راہبات نے بھی مسلمانوں کا اخلاق دیکھ کر اپنا طریقہ اور زندگی ڈھنگ بھی بدل لیا۔ اُن کی وہ زبانیں جو نو واردوں (مسلمانوں) کو بد دُعائیں دیتی تھکتی تھیں اُن سے اب موسیٰ بن نصیر اور اُس کے لشکریوں کے لئے دُعائیں اور صرف دُعائیں نکلتی تھیں۔ اب وہ عیش و عشرت اور کج اخلاقیوں سے عاجز آ کر واقعی شرافت اور عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے کلیسا چھوڑ کر موسیٰ بن نصیر اور اُس کے دلاور جوانوں کے مذہب میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ عیسائیت پر ایک ضرب کاری تھی۔

اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ فاتحین یعنی موسیٰ بن نصیر، طارق زیاد بلکہ تمام مسلم فاتحین تنگ نظر نہ تھے۔ اُنہوں نے یہاں کے بھی اچھے اصولوں احترام کیا۔ یہاں کے دستوروں کو تبدیل نہیں کیا بلکہ غیر مسلموں پر اسلام کے

قانون لاگو ہوئے جو اُن کے عقائد سے ٹکر نہ کھائیں اور اُن کے اصولوں کے خلاف نہ جائیں۔ اُن کے طریقوں کے منافی نہ ہوں۔

یوں رعایا خوش ہو گئی، ہر طرف موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور اُن کے لشکروں کی دھوم مچ گئی۔ اُنہوں نے ان نو واردوں کو سر پر بٹھایا اور اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ غلام آزاد ہوئے، عورتیں با حیا اور با حجاب، متوسط طبقہ مطمئن اور مسرور، کسان اور دہقان شاداں، تلخیاں ختم، گمراہیاں ختم اور بدتمیزیاں ختم ہو گئیں۔

مگر مسلمانوں کی آمد سے بات یہاں تک ہی پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ جہاں لا قانونیت اور بے ضابطہ پن کا دور دورہ ہو وہاں قانون اور ضابطہ کا نفاذ آسان کام نہیں۔ مگر ان کلمہ گویوں کے دلوں میں جو جذبہ کارفرما تھا اس میں ایک آہنی عزم تھا۔ ایک جذبۂ عمل تھا، ایک اخلاق تھا، وہ سرزمین اسپین (اُندلس) پر آئے ہی اس لئے تھے کہ وہاں اللہ کے نام کا بول بالا ہو، چنانچہ وہ ہو کر رہا۔

ڈوزی کہتا ہے کہ جب مریڈا فتح ہوا تو شرائط صلح میں یہ شامل تھا کہ جو باشندے شہر چھوڑ کر نہیں جائیں گے اُن کا مال و متاع کچھ بھی ضبط نہیں ہو گا۔ پس وہاں کا کوئی شخص شہر چھوڑ کر نہیں گیا اور کسی کی کوئی چیز بھی ضبط نہیں کی گئی۔ اس طرح مرسیہ کا صوبہ تھیوڈومیر کو بخش دیا گیا اور اُس کا نام ہی تھیوڈومیر یا تدمیر رکھ دیا گیا۔ اس میں بعض اچھے اچھے شہر شامل تھے جیسے ٹورفا، مولا، ادری بیولا، القنت۔

یہ سارے کے سارے علاقے سرسبز بھی تھے اور شاداب بھی۔ یہاں کا ایک ذرّہ بھی مسلمانوں نے نہیں لیا۔ اور جو معاہدہ تھیوڈومیر اور موسیٰ بن نصیر کے صاحبزادے عبدالعزیز کے درمیان ہوا وہ آج تک تاریخ میں محفوظ ہے۔ اس معاہدے کی شرائط کی مکمل پابندی کی گئی۔ اس پورے علاقے سے خراج میں جو کچھ حاصل ہو جاتا اُسی پر اکتفا کیا جاتا۔ دوسری جگہوں پر بھی زمینوں اور علاقوں سے خراج میں جو کچھ وصول ہو جاتا وہی ٹھیک سمجھا جاتا۔ بیشتر علاقے اور زمینیں مقامی لوگوں کے پاس ہی باقی رہے اور اُنہیں اس کے فروخت، بیع وغیرہ کی بھی اجازت دی گئی تھی جو اس سے پہلے کسی حکومت نے بھی نہ دی تھی۔ عوام پر صرف بارہ درہم سالانہ جو تقریباً تین روپے ہوتے تھے، ٹیکس لگتا تھا جو کہ نہ لگنے کے برابر تھا۔ خواص پر 48 درہم سالانہ ٹیکس گویا چار

روپے ماہانہ۔ خود ہی غور کیجئے کہ رئیسوں کے لئے یہ رقم کچھ درجہ نہ رکھتی تھی۔ متوسط طبقے پر یہ ٹیکس 14 درہم تھا جو اُن کو چنداں گراں نہ گزرتا تھا۔ عورتیں، بچے، راہب پادری، لولے، لنگڑے، اندھے، اپاہج، معذور، بیمار، غلام، بھیک مانگنے والے اس ٹیکس سے قطعی بری تھے۔

کاشت کے لائق زمینوں پر خراج عائد کیا جاتا جو مال گزاری کی شکل میں ہوتا تھا اور زمین اور فصل کے لحاظ سے لگایا جاتا تھا اور کسی بھی شکل میں آمدنی کا بیس فیصد سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں تعصب نام کو بھی نہ تھا بلکہ رواداری اور وسیع النظری کے وہ مظاہرے کرتے تھے۔ کسی کو کبھی زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں رائج تھا۔ مگر جو مسلمان ہو جاتا تھا وہ ان کے تمام مراعات کا حقدار اور مستحق ہوتا تھا۔ غلام قبول اسلام کے بعد ملازم نہ رہتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ شرفاء تک لڑکیاں بیاہنے سے دریغ نہ کرتے تھے کیونکہ اُن کی وہی سماجی حالت اور حیثیت ہو جاتی تھی جو کسی شریف عرب کی ہوتی تھی۔ یہ مسلمانوں کی رواداری اور اخلاص کا نتیجہ تھا کہ لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہوئے اور جو نہ ہوئے اُنہوں نے بجز ایک دو کے کسی نے کوئی فتنہ فساد برپا نہیں کیا بلکہ کلیسا اور اہالیانِ کلیسا پر جو مسلمانوں نے عنایات کیں اس پر وہ تعجب سے اُنگلی دانتوں تلے دبا لیتے تھے اور شکر ادا کرتے تھے۔

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے ہاتھوں اسپین کیا فتح ہوا کہ باشندگانِ اسپین کو مسلمانوں کی شکل میں ایک نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو گئی۔ انہوں نے پوری معاشرتی زندگی ہی سدھار کر رکھ دی۔ اُنہوں نے پرانی برائیوں اور بد قماشیوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا، بڑے لوگ اپنی طاقت کے زور پر جو جور و ستم روا رکھتے تھے، ان غریبوں کی حالت پر دو آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا، مگر اب نوابین اور جاگیرداروں کا اگر نام و نشان باقی بھی تھا تو اُن کی رعونت کا کوئی نشان نہ تھا اور کہیں اگر اس کا مظاہرہ ہوتا تو ایسی سخت سزا ملتی کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی کسی غریب اور لاچار پر ظلم کرنے کو منع کر جاتا۔ پہلے مذہب کا اقتدار دلوں پر نہ تھا، زبان یا جسموں پر تھا۔ مگر اب مذہب کی خوبیاں رُوح تک میں سرایت کر گئی تھیں۔ اسلام کو لوگ دنیاوی رعایتیں حاصل

کرنے کے لئے قبول نہ کرتے تھے بلکہ اس کی خصوصیات ان کے کردار میں رچ بس گئی تھیں۔ کیا امیر کیا غریب جو متاثر ہوتا وہ

”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه“

کہتا اور نیک خصلتوں میں شامل ہو جاتا۔ جب یہ سلسلہ فزوں تر ہوا تو عیسائی پادریوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور مارے ڈر کے اُنہوں نے پورے طور پر نہیں، جزوی طور پر اصلاح کر ڈالی جو ہر چند کہ زیادہ عرصے قائم نہ رہی مگر اس وقت کی فتوحات کے اثرات میں شمار کی جائے گی۔ اور اگر فتوحات پر یونہی نظر ڈالتے رہے تو محاسن با اثرات کا سلسلہ یونہی طویل سے طویل تر ہوتا جائے گا اور کتاب کے سینکڑوں صفحات صرف اس کے لئے درکار ہوں گے۔ مختصر یہ کہ اسپین میں موسیٰ بن نصیر کے ساتھ مسلمان کیا آئے، ایک ضابطہ آیا، قانون آیا، مستحکم معاشی نظام آیا، معاشرتی اصول آئے، ملکی انتظامات آئے، مذہبی محاسن آئے، سیاسی خوبیاں آئیں۔ غرض یہ کہ انسانی بود و باش میں ایک مکمل انقلاب آیا جس کا سپاس گزار صرف اسپین ہی نہیں بلکہ یورپ کو ہونا چاہیئے اور اُنہیں موسیٰ بن نصیر کو اپنا محسن اور مربی سمجھنا چاہیئے۔

○□○

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے ساتھ جو فوج آئی تھی اُس میں بربر اور افریقہ کے مقامی باشندے زیادہ تھے جو اسپین میں آباد ہونے یا مستقل قیام کے ارادے سے نہیں آئے تھے بلکہ جوشِ جہاد اور جنگ و جدل کی جبلت اُنہیں ایک سرحد پار کر کے دوسری سرحد میں لے آئی تھی۔ بعد میں جو لوگ آ آ کے شامل ہوتے رہے، اُن میں بھی قبطی اور بربر زیادہ تھے جو محض مال و متاع اور مالِ غنیمت حاصل کرنے چلے آئے تھے۔ مگر جب موسیٰ بن نصیر اُندلس کے ساحل پر اُترے تو اُن کے ساتھ شرفاء حجاز بھی تھے، رؤسا شام بھی، ثقہ ایران بھی، صحابہ کرام بھی، اولادِ صحابہ بھی۔ یہ اب وہاں مستقل آبادیاں قائم کرنے اور بسنے کے خیال سے آئے تھے۔ اُن کو مالِ غنیمت حاصل کرنے کا جذبہ قطعاً اتنی دُور کی مسافت طے کر کے وہاں تک لانے پر آمادہ نہیں کر پایا تھا۔ بلکہ موسیٰ بن نصیر اور اُن کے لشکری تو اس کفرستان (اُندلس) میں دینِ اسلام اور ایمان کی مشعل روشن کرنے آئے تھے۔ چنگ و ناقوس کی جگہ اذانوں کی گونج سنانے آئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ فتح اسپین کے بعد سیاسی حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اگر اس (اُندلس) پر مستقل قبضہ رکھنا ہے تو مقامی باشندوں پر مکمل اعتماد نہ کرتے ہوئے، محض محافظ دستوں پر اعتبار کرتے ہوئے مسلمانوں کی آبادیوں کو بھی قائم کیا جائے۔ ورنہ یہ محافظ دستے کبھی بھی اُکتا کر اور چھوڑ کر بھاگ بھی سکتے تھے یا دشمنوں کے باغیانہ جذبات کا ہدف بن سکتے تھے۔ اہالیانِ اسپین کا یہ حال تھا کہ ادھر طارق نے پیٹھ پھیری، اُدھر مالقہ، غرناطہ، الیبوراس میں بغاوت ہوگئی۔ اُدھر موسیٰ بن نصیر کو کچھ دن "ماردہ" کی فتح میں لگے اور اشبیلیہ، اینٹی کیورا، غرناطہ، مرسیہ پھر اطاعت سے باہر ہو گئے۔ ایسے لوگوں اور ایسی قوم پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا تھا؟ اگر مسلمانوں کو وہاں نہ بسایا

جاتا اور اُن کا قیام وہاں عمل میں نہ آتا تو اس قدر جنگ و جدل، اتنی خونریزی، اتنی جانفشانی اور سرفروشی تمام کی تمام ضائع ہو جاتی اور اتنا بڑا علاقہ جو نہ معلوم کن کن مصیبتوں سے فتح کیا گیا تھا، بلاوجہ ہاتھ سے نکل جاتا اور مسلمان یونہی کفِ افسوس ملتے رہ جاتے۔

اسپین کی فتح پہلی صدی کے آخر میں ہوئی تھی۔ موسیٰ بن نصیر کی واپسی 95ء میں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات پائے اسّی سال سے اُوپر گزر چکے تھے۔ اُس وقت اصحابِ رسول میں سے کسی کا ہونا خالی از تعجب نہیں۔ بہت سے تو عہد عبدالملک میں محاصرہ مدینہ کے دوران اپنے خدا اور حبیب خدا سے جا ملے تھے۔ بہت سے طبعی عمر کو پہنچ کر جاں بحق ہو چکے تھے۔ جو دو چار باقی رہ بھی گئے تھے وہ مدینہ کی گلیوں اور مکہ کی حدود میں باقی زندگی گزارنا غنیمت شمار کرتے تھے۔ مگر یہ اسپین کی انتہائی خوش بختی تھی کہ وہاں صحابہؓ کے قدم میمنت لزوم بھی پہنچے اور حضرات تابعین نے بھی اُندلس کو اپنی آمد سے نوازا۔

چنانچہ جو لوگ سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے ساتھ آئے تھے اُن میں سب سے زیادہ عظیم الرتبت ہستی حضرت منیذرؓ کی تھی۔ یہ بزرگ خدمت رسولؐ بھی کر چکے تھے اور بیعت رسولؐ سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ اللہ اللہ...... قدر و منزلت اُندلس (اسپین، ہسپانیہ) کی جہاں اُن کے قدم پہنچے اور عظمت کو چار چاند لگائے۔

موسیٰ بن نصیر کے ساتھ آنے والوں میں تابعین کے تقریباً ایک درجن کے قریب بزرگانِ دین تھے جن میں سے بعض کا حال ہمیں کتابوں میں ملتا ہے۔ ان معروف تابعین میں سب سے پہلا نام جناب حنش الصعانی کا ہے۔ آپ کا اصل نام حسین تھا۔ یہ جناب عبداللہ کے فرزند تھے اور ان کا لقب حنش تھا اور کنیت ابوعلی تھی۔ ملک شام کے شہر صنعا کے رہنے والے تھے۔ آپ جناب موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اُندلس آئے تھے۔ انہوں نے سرقسط میں مقام کیا۔ اپنے ہاتھوں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو جامع مسجد کہلائی۔ بعد وفات اسی مسجد میں مغربی کونے میں باب الیہود کے قریب دفن ہوئے۔ کبھی اُن کا مزار، زیارت گاہ عام تھا اور مخلوق کا اژدہام لگا رہتا تھا۔

(2) ابوعبداللہ بن رباح اللخی :۔ یہ دیکھنے میں معذور تھے۔ اسپین آئے تو وہیں رہ

پڑے۔ ان کی اولاد آگے چل کر خوب پھلی پھولی۔

(3) ابو عبدالرحمٰن بن یزید المعاقری الجبلی والانصاری:۔ انہوں نے قرطبہ کو م
بنایا۔ خدمت خلق بھی کی اور خدمت دین بھی۔ لوگ ان سے بہت مانوس تھے اور ا
مسائل دریافت کرنے آیا کرتے تھے۔ جب اُن کا قرطبہ میں انتقال ہوا تو معتقد
زار و قطار روتے تھے۔ ان کے مزار نے بھی لوگوں کو ہمیشہ اپنی جانب مبذول رکھا۔

(4) حبان ابن ابی جبلہ:۔ ان کی کنیت ابو نصر تھی۔ یہ غالباً موسیٰ بن نصیر ہی کے
ساتھ یا ان کے بعد فرانس تک جا پہنچے تھے اور اس ملک کی سرحد پر ایک مقام قرقشو
نام کا ہے جہاں اُنہوں نے وفات پائی اور دفن ہوئے۔

(5) مغیرہ بن ابی بردہ:۔ یہ بھی پہنچے ہوئے بزرگوں میں سے تھے۔ اکثر جنگو
میں حصہ لیا تھا۔ اپنے قبیلے کے سالار ہوتے تھے۔

(6) نشیط بن کنانہ العذری:۔ ان کا شمار بھی باعزت ہستیوں میں تھا اور قبیلے ک
سرداری کا فخر بھی اُن کو حاصل تھا۔

(7) حیاۃ ابن رجاء التمیمی:۔ بزرگوں میں شامل تھے۔ بابرکات میں سے تھے۔

(8) عبداللہ بن شماستہ الفہری:۔ قبیلہ فہر میں سے تھے۔ حجازی تھے۔ اُندلس ایسا بھا
کہ باقی زندگی یہیں گزار دی۔

(9) عیاض بن عقبہ الفہری:۔ یہ قبیلہ فہر میں سے تھے۔ عقبہ نے جو شہرت حاصل
کی وہ پوشیدہ نہیں۔ عیاض انہی کے صاحبزادے تھے اور بزرگ ہستیوں میں تھے۔

(10) عبدالجبار بن ابو مسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف زہری:۔ یہ پورا خاندان ق
واجب التعظیم تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف تو عشرہ مبشرہ میں تھے اور نارِ دوزخ اُن پر حرا
تھی۔ اُن کے مرتبے کے مطابق اُن کو عزت اور تکریم حاصل ہوئی۔

عرب

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے ساتھ آنے والے جو اُندلس میں سب سے
زیادہ قیام پذیر ہوئے وہ عربی النسل تھے۔ عربی ان دونوں فاتحوں کے ساتھ آئے او
اُندلس کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ 98 ہجری کے ماہِ عید الاضحیٰ (جولائی 17

عیسوی) میں جب الحر بن عبدالرحمٰن تقفی اُندلس کے امیر ہو کر آئے تو اُن کے ساتھ
بھی تقریباً چار سو افراد جو شرفائے عرب میں سے تھے ہمراہ آئے اور پھر اُندلس ہی کو
وطن سمجھ بیٹھے۔

100 ہجری مطابق 719ء میں جب اسمح بن مالک خولانی والی اسپین ہوئے تو اُن
کے ساتھ بھی ملک شام سے کئی عربی خاندان کے نفوس آ کر بس گئے۔

123ھ مطابق 742ء جب افریقہ میں بربریوں نے بغاوت کی تو اُموی محصور فوج
کے سردار بلج بن بشر قیصری شاہی دستوں کے ہمراہ اُندلس چلے آئے اور معہ اُن
سپاہیوں کے یہیں اقامت گزیں ہو گئے۔

پھر 125ھ مطابق 743ء میں جب ابوالخطار حسام بن ضرار الکلبی والی بن کر آئے
تو اُن کے ساتھ مصر، حمص، فلسطین اور اُردن، دمشق کے لوگ بھی لشکر میں شامل ہو
گئے۔ اُن کو زمینیں بھی دی گئیں اور جاگیریں بھی۔ اور وہ بھی یہیں مستقلاً آباد ہو گئے۔
مصریوں نے اکشنوبہ اور باجہ کے علاقے پسند کئے اور پھیلتے پھیلتے مرسیہ اور تدمیر تک
پہنچ گئے۔ حمص والے سیلہ اور اشبیلیہ میں مقیم ہوئے۔ اُردن کے لوگ ریہ اور مالقہ
میں، دمشق والے البیرہ اور غرناطہ میں اور قنریف والے جین (JEAN) کے شہری
بنے۔

عدنانی

عدنانیوں کے بہت سے قبیلے اُندلس میں آ کر آباد ہوئے۔ ان میں بنی ہاشم، بنی
امیہ، بنی مخزوم، بنی فہر، بنی کنانہ، بنی ہذیل بنی تمیم، بنی فیل، نمیلدن، بنی ثقیف، بنی
ربیعہ، بنی زیاد، گویا سب ہی مشہور اور معروف قبیلے کے باشندے اُندلس میں مدغم ہو کر
رہ گئے۔

بنی ہاشم عرب میں بھی اور ماسوائے عرب بھی بہت ہی مقبول اور محترم حضرات
میں شمار کئے جاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی قبیلے سے تھے۔ اُن کے
قبیلے کے افراد نے جب بنو اُمیہ کی حکومت دم توڑ رہی تھی تو سات برس تک قرطبہ میں
حکومت کی تھی۔ علاقہ مالقہ میں بائیس سال تک حکومت کرتے رہے۔ ایک سال

اُنہوں نے جزیرۃ الخضراء میں بھی حکومت کی۔

بنی اُمیہ کے دورِ حکومت میں اُندلس فتح ہوا۔ پہلے اس قبیلے کے لوگوں کی طرف سے بنو اُمیہ مقرر ہوئے، پھر عبدالرحمٰن الداخل کے بعد تو یہ مستقل شاہانِ اسپین رہے اور ہشام کے عہد حکومت تک اس قبیلے کا بول بالا رہا۔

بنی مخزوم نے کسی ایک جگہ پڑاؤ نہ ڈالا اور پورے اُندلس میں تتر بتر ہو گئے۔ اس قبیلہ کا اندھا شاعر المخزومی بڑی زبردست ادبی شخصیتوں میں تھا۔ سلطان اشبیلیہ معتمد کے وزیر اس خاندان کے لوگ رہے۔ اور اس طرح یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ تعداد اطراف اشبیلیہ میں آباد تھی۔

بنی فہر نے کچھ مدت تک اسپین میں کافی اقتدار قائم رکھا۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے عبدالملک بن قطن 731ء سے لے کر 744ء تک والی اُندلس رہے۔ اُن کی اولاد میں ابو القاسم علاقہ البوت کے حاکم تھے جو 1002ء سے 1021ء تک حکومت کرتے رہے۔ اُن کی ہی اولاد میں سے بنی الجد تھے جن میں بڑے بڑے عالم و فاضل گزرے ہیں۔ اسی قبیلے کے عبدالرحمٰن الفہری نے تقریباً آزادانہ حکومت کی اور پھر عبدالرحمٰن الداخل کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اس قبیلے کے لوگ صاحب دولت رہے اور جہاں جہاں تھے عزت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔

بنو کنانہ اطراف و جوانب طلیطلہ میں آباد تھے۔ اُن میں بھی بعض بڑے آدمی ہوئے ہیں جن میں رقشی کنانی کافی مشہور ہیں۔ قاضی ابو الولید، وزیر ابو جعفر اور ابوالحسن، مشہور سیاح اور عالم اسی کنبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اموی حکام اُن کی عزت کرتے تھے اور قابل تکریم گردانے جاتے تھے۔

بنی ہذیل حدود تدمیر میں خصوصاً اوری یبولہ جا کر آباد ہوئے اور وہیں شہرت اور عزت پائی۔

بنی تیم جو مرۃ بن آد بن ناجہ بن الیاس بن نصر کی اولاد سے ہیں اُندلس میں آ کر افراط سے آباد ہوئے۔ اس قبیلے کے بعض لوگوں نے شہرت بھی پائی۔ مثلاً ابو طاہر جو مقامات اللزدینہ کے مصنف تھے۔

بنی حیلاس اس قبیلے کی ایک شاخ تھے اور مختصر تعداد میں تھے۔

بنو قیس عیلان میں بکثرت آباد تھے۔ ان میں بعض بنو سلیمی کہلاتے تھے جو سلیم بن عکرمہ بن حفصہ بن قیس عیلان کی اولاد سے عبدالملک بن حبیب سلمی حضرت امام مالک کے شاگرد اسی قبیلے سے متعلق تھے۔ قاضی ابو حفص بن عمر جو کبھی قرطبہ کے قاضی القضات تھے وہ بھی اسی قبیلے سے متعلق تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ بھی اسپین میں کافی نامور تھا۔ اس قبیلے کی ایک شاخ بنو خرم بھی تھی جس میں ابو محمد بن خرم الحافظ الظاہری بہت بڑے محدث گزرے ہیں۔ اگرچہ وہ ایرانی النسل تھے۔

بنو ہوازن اشبیلیہ کے قرب و جوار میں بسے ہوئے تھے اور بلیتہ سے تین میل کے فاصلے پر بھی آباد تھے۔ اُندلس اور بڑے بڑے شہروں میں بھی اُن کی بستیاں تھیں۔

بنی جوری یہ زیادہ تر غرناطہ میں آباد تھے۔ اس قبیلے کی اور بھی شاخیں تھیں مثلاً کلابی، کلاب بن ربعیہ کی اولاد اور قنیسری قیشر بن کعب بن ربعیہ کی اولاد۔

بنو ثقیف بھی یہاں آباد تھے۔ حجاج اس قبیلہ کا گورنر کوفہ اور بصرہ تھا۔ یہ لوگ الجر بن عبدالرحمٰن الثقفی کے ساتھ آئے تھے مگر اُندلس میں اِدھر اُدھر بٹ گئے۔

بنو ربعیہ اور ان سے متعلق شاخیں بنو اسد علاقہ البیرہ میں قرب غرناطہ آباد ہوئے۔ وادی آش میں بھی ان کی بستیاں تھیں۔

بنو بکر بن وائل یہ لوگ ادینہ HUELVA اور اور سلطیش کے علاقوں میں بس کر رہ گئے۔ ان میں ابو عبید بکری مشہور مورخ اور جغرافیہ داں تھے۔

بنو اباد یہ اشبیلیہ اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے اور اس طرح عدنانیوں کی مختلف شاخیں اور مختلف قبیلے کل اُندلس پر چھا گئے اور اکثر نے مرتبہ اور شہرت حاصل کی۔

قحطانی

قحطان اور اُس کی اولاد زیادہ تر یمن میں آباد تھی۔ اس لئے وہ یمانیہ بھی کہلاتے ہیں۔ اس قبیلے کی بھی متعدد شاخیں تھیں جن میں قابل ذکر......

بنو خزرج، بنوارس، بنو ازد، غافق، ہدان، مذبح، طے، مراور غس، مرہ، عاملہ،

خولائی، معافر، ظم، جزام، کندہ، نجیب، حمیر، خثعم، ذی رعین، ذی اصبح، یحصب، ہواز
قضاعہ، کلب، حضرموت اور سلامان وغیرہ تھے۔

قحطان جو کیلان کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو کیلانی بھی کہتے
اُندلس میں کثرت سے آباد تھے۔ اسی طرح بنی ازد بھی خاصی تعداد میں بسے ہو
تھے۔ ان میں سے بعض شہرت یافتہ بھی تھے۔ محمد بن ابسیری مشہور شاعر تھے۔ احم
احمد ازدی پایۂ کے مورخ تھے۔ ازد کی اولاد غسان نامی چشمے کی مناسبت سے جہا
وہ پہلے آباد تھے غسانی بھی کہے جاتے تھے۔ یہ لوگ غرناطہ اور مالقہ سے قریب ایک
صالحہ میں آباد تھے۔

بنو خزرج اور اوس، مدینہ منورہ کے وہ دو قبیلے ہیں جنہوں نے پیغمبرؐ اسلام کو ر
سے پہلے مدینہ میں پناہ دی تھی اور انہیں وہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ ان
کے بہت سے افراد آئے اور آکر اُندلس میں آباد ہوئے۔ حتیٰ کہ بقول ابن سعید
میں تو انصاری ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

یہ لوگ عام طور پر اطراف طلیطلہ میں بستیاں قائم کئے ہوئے تھے۔ خزرج
قبیلے کے بزرگ صحابہ سعد بن عبادہ جو آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد انصاریوں کی جا
سے خلافت کے لئے منتخب کرائے گئے تھے، اُن کی اولاد میں سے بنو الاحمر
غرناطہ پر عرصہ تک حکومت کرتے رہے اور 1232ء سے 1492ء تک اسی خاندان
عمل دخل تھا۔

قبیلہ اُوس کی شاخ غافق تھی جو جیئن میں آباد تھی اور اُن کی اولاد میں عبدالر
الغافقی تھے جو دو مرتبہ امیر اُندلس رہے۔ انہوں نے بڑے بڑے معرکے سرانج
دیئے۔ آخر وہیں جنگ پوئیٹرز میں 114ھ میں شہید ہوئے۔ عبداللہ بن ابی الص
بھی اسی قبیلے کے شاعر تھے۔

ہمدان کی نسبت سے بعض کیلانی اپنے آپ کو ہمدانی کہتے تھے۔ غرناطہ سے سا
میل کے فاصلے پر اُن کی آبادی تھی۔ بنو الضحیٰ بھی اُن کی ایک شاخ تھے۔

بنو مذحج یمن کے رہنے والے تھے جو شاید وہاں کے اس سرخ پہاڑ کا نام
بھی روایت ہے کہ زید بھی کہلان کا بیٹا اُدو تھا اور اس کا بیٹا ''طے'' جس

''طے'' ہے۔ طے کی بیوی کا نام مذحج تھا۔ اسی نسبت سے یہ قبیلہ بنو طے کہلایا۔ مرسیہ
کے جنوب میں ان کی بستیاں تھیں۔

اسی طرح مراد بن مالک کی اولاد بنو مراد کہلائی۔ انہوں نے اُندلس میں قرطبہ سے
اشبیلیہ کے راستے پر ایک قلعہ بھی اپنے نام سے تعمیر کیا جس کو مراد (MARENTE)
کہتے ہیں۔ یہ دوسری جگہوں پر بھی آباد تھے۔

بنو سعید لمفس بن مالک کی اولاد میں سے تھے۔ غرناطہ کے قریب اپنے نام سے
ایک قلعہ بنو سعید تعمیر کیا۔ ''کتاب المغرب'' بھی اسی قبیلے کے کسی فرد کی تصنیف تھی۔

خولانی: اشبیلیہ اور جزیرہ الخضرا کے درمیان قلعہ خولان ہے جو انہی خولانیوں کا
بنایا ہوا تھا اور یہ اسی میں بسے ہوئے تھے۔ غرناطہ کے معزز فرد عہد اسلام تک اس قبیلے
سے واسطہ رکھتے تھے۔

خاندان لخمی نے اُندلس میں کافی عزت پائی۔ سلاطین اشبیلیہ بنی عباد انہی کی
اولاد تھے اور بنو الباجی اور بنو واخد بھی انہی میں سے تھے جن کا شمار اشبیلیہ کے پُرشکوہ
اشخاص میں ہوتا تھا۔

بنو خرام سرقسط میں بسے اور وہیں حاکم مقرر ہوئے۔ اُن کے بہت سے افراد
رباح (CALATRAVA) میں آباد تھے۔

بنو حیرہ جو الیمنی بھی کہلاتے تھے، اُندلس میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ ابو
عبداللہ بن الخیاط اندھا شاعر اسی قبیلہ کا فرد تھا۔

اصجی جو اصبح یا ذی صبح سے مشتق تھا، یہ کہلان کی اولاد میں سے تھے اور ان میں
امام مالک بن اُنس بہت ہی مشہور عالم گزرے ہیں۔ یہ لوگ قرطبہ اور اس کے گرد و
نواح میں آباد تھے۔

یحصبی: یہ قلعہ بنی سعید کے نزدیک آباد تھے اسی لئے یہ قلعہ یحصب بھی کہلاتا
ہے۔

بنو قتاء: یہ مالک بن حمیر سے منسوب تھے۔ اسی قبیلہ کے فرد ابوالخطار حاکم اُندلس
تھے۔ علیہ بن تحیم امیر اُندلس بھی اسی سے متعلق تھے۔

بنو خثین: بنو تنوخ اور بنو جہتیہ قرطبہ کے اطراف میں آباد تھے۔ خاندان اشبیلیہ

کے اندر ان کا شمار ثقایان اشبیلیہ میں ہوتا تھا۔

بنوکلب: یہ جزیرہ الخضراء میں آباد تھے۔

بنوحضرموت: یہ قرمونہ اور اشبیلیہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ اس کے علا
بنوقحطان کے اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے قبیلے اور اُن کی شاخیں مختلف شہروں
اقامت گزیں تھیں۔

بربر اور افریقی

بربر سب سے پہلے اسپین میں داخل ہوئے۔ یہ افریقہ کے وحشی اور جنگجو قبائل
سے تھے اور عقبہ میں نافع فہری کے افریقہ فتح کر لینے کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔
اندرون افریقہ سے اسپین پہنچے۔

نواتہ، ہوارہ، ادرغہ، الجیریا، مغرب الاوسط، مغرب الاقصیٰ اور ساحلی علاقوں
چل کر پہلے یہ طارق کے ساتھ اور پھر اس کے بعد مستقل حدود اسپین میں داخل ہو
رہے۔ انہوں نے شمالی اُندلس میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ چنانچہ براگا، برتھا
شمالی اسپین، استورگا، لیول، سبورا، شقوبیہ وغیرہ جنوبی علاقوں میں جا کر آباد ہوئے۔
جب عیسائی ریاستوں نے وہاں زور پکڑا تو مجبوراً اُن کو وہاں سے ہٹنا پڑا اور پھر
وسطی علاقوں میں توریہ، ماردہ بطلیوس، مدلین وغیرہ جگہوں میں پھیل گئے۔ اس کے
علاوہ بھی وہ اور حصوں میں بھی جانبازی اور وفاداری سے حکومت کی خدمت کرتے
رہے۔ بعد میں جب شیرازہ بکھرا تو یہ قرمونہ، رند، غز، للبلطہ اور جناجہ وغیرہ میں خود
مختار ہو گئے۔

یوسف بن تاشفین بھی بربر تھا۔ وہ حکومت مرابطین کا بانی بھی تھا۔ اسپین کی ر
سہی عزت اُسی نے سنبھالی۔

اسلامی حکومت کی ابتداء

آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ افریقہ کے مغربی حصوں کے فاتح عقبہ بن نافع تھے
وہ جب افریقہ کو فتح کرتے کرتے اس کے آخری گوشے تک پہنچے تو انہوں نے آ

سمندر دیکھ کر کہا۔

"اے خدا! اگر یہ سمندر راستے میں حائل نہ ہوتا تو میں تیرے پاک دین اسلام کو
اور آگے لے جاتا۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا۔ لیکن گھوڑے کے ذریعے سمندر
کون پار کر سکتا ہے؟ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ واپس ساحل پر آ گئے۔ افریقہ
کے یہی حاکم تھے۔ انہوں نے قیروان کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا تھا۔

ان کے بعد افریقہ کے حاکم موسیٰ بن نصیر مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے افریقہ میں
امن و امان قائم کیا۔ بربر قوم جو کئی بار بغاوت کر چکی تھی، اُن کے سرداروں کو زیر کر
کے اُن میں اسلام پھیلانے کے لئے لائق اور قابل مبلّغ مقرر کئے جنہوں نے اس قوم
میں گھر گھر اسلام کا پیغام پہنچایا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ پوری قوم اسلام کے دامن
میں آ گئی۔

موسیٰ بن نصیر نے شمالی افریقہ کے ساحلوں کی حالت درست کی۔ بحر روم کے کئی
مشہور جزیرے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کئے۔ پھر موسیٰ بن نصیر نے مسلم
خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت لے کر اپنے مشہور سپہ سالار طارق بن زیاد کی سپہ
سالاری میں سات ہزار فوج روانہ کی۔ پھر اُن کی مدد کے لئے پانچ ہزار مزید فوج
بھیجی۔

اُندلس کے عیسائی بادشاہ راڈرک نے یہ خبر سن کر بہت بڑی فوج تیار کی۔ طارق
اسلامی فوج لے کر روانہ ہوئے۔ سامنے اُندلس (اسپین) تھا جہاں اُنہیں خدا کا آخری
پیغام اور اسلامی زندگی کا نمونہ پہنچانا تھا۔ طارق نے ملک کی حالت جانچی، پھر اپنی
فوج پر نظر ڈالی۔ اس طرح اُنہوں نے حملے کی تیاری کی۔ طارق نے حملے سے پہلے
ایک پُر جوش تقریر کی اور اپنی تمام کشتیاں ایک ایک کر کے خاکستر کر دیں تاکہ فوج کے
دل میں واپسی کا خیال پیدا ہی نہ ہو سکے۔

کسی فوجی نے طارق نے پوچھا۔

"یہ کیا نادانی ہے؟ لڑائی کے ہمیشہ دو رُخ ہوتے ہیں۔ ہم اپنے وطن سے دُور
پردیس میں ہیں۔ شکست ہوئی تو کیسے لوٹیں گے؟"

طارق نے اپنی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیس پردیس کیا، ہر ملک ہمارا ملک ہے۔ اس لئے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔"

اُندلس کا بادشاہ راڈرک، طارق کے مقابلے پر ایک لاکھ فوج لایا جبکہ طارق کی فوجوں کی تعداد صرف بارہ ہزار تھی۔ لیکن طارق کی فوج کے سامنے دنیا کی بھلائی کا نقشہ تھا، اُس کا کام دنیا کو اسلام پہنچانا تھا۔ جبکہ راڈرک کے سپاہیوں کے دل ایک نہ تھے۔ اُن کے سامنے کوئی ایک مقصد نہ تھا۔ اُن کے سامنے خود غرضی اور ذاتی فائدے تھے۔ چنانچہ طارق بن زیاد نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور راڈرک میدانِ جنگ میں مارا گیا اور قول کے مطابق دریا میں ڈوب کر مر گیا۔

یہ بات بہت مشہور ہے کہ اُندلس پر حملے کے وقت طارق بن زیاد نے خواب میں دیکھا کہ رسولؐ خدا اور تمام صحابہؓ کرام تلواریں باندھے آپ کے ساتھ کھڑے ہیں اور حضورؐ فرما رہے ہیں۔

"طارق! اپنے کام کی طرف بڑھو!"

طارق کے اس خواب سے طارق اور اُس کے لشکر کی ہمتیں بڑھ گئیں اور اُنہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں پورے اُندلس کو فتح کر ڈالا۔

طارق کی کامیابیوں کی خبر سن کر موسیٰ بن نصیر بھی اپنی فوج کے ساتھ اُندلس پہنچ گئے۔ پھر دونوں نے مل کر اُندلس کے انتظامات درست کئے۔

اُندلس کے شہر قرطبہ کو پایہ تخت بنایا گیا اور موسیٰ بن نصیر نے اپنے بیٹے کو اُندلس کا حکمران مقرر کیا۔ اس طرح موسیٰ بن نصیر کے ذہین اور بہادر بیٹے عبدالعزیز، اُندلس کے پہلے امیر اور حکمران مقرر ہوئے۔ موسیٰ بن نصیر چاہتے تھے کہ وہ پورے یورپ کو فتح کرتے ہوئے قسطنطنیہ پہنچیں، پھر وہاں سے قیرواں واپس آئیں۔ لیکن مسلمان خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اُنہیں اس کی اجازت نہ دی، اس لئے کہ خلیفہ کو راستے کی مشکلات نظر آتی تھیں۔ پس موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد، اُندلس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد افریقہ واپس آ گئے۔

اُسی وقت دونوں سپہ سالاروں کو خلیفہ کی طرف سے دارالخلافہ دمشق پہنچنے کا حکم ملا۔ موسیٰ بن نصیر نے اُندلس کی تمام مفتوحہ حکومت اپنے بیٹے جواں عمر اور جواں سال

عبدالعزیز کے سپرد کر دی۔ اس طرح اُندلس میں دورِ امارت کی ابتداء ہوئی۔

اُندلس ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا۔ سارے ملک کا انتظام، پوری مملکت کی از سر نو تنظیم ایسا معمولی کام نہ تھا کہ جسے آسانی سے سرانجام دیا جا سکے۔ یہ صرف ذہین عبدالعزیز کا سلیقہ، اُن کی صلاحیت اور اُن کا جری حوصلہ تھا کہ اُنہوں نے سیاسی اور معاشرتی نظام کو اس خوبصورتی سے مستحکم کیا کہ مسلمانوں کے پنجے ملک اُندلس میں گڑ گئے۔

گوتھ سلطنت کے پرخچے اُڑ چکے تھے، عیسائی حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور اب انہی منہدم اور بوسیدہ بنیادوں پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنی تھی جو مضبوط بھی ہو، پائیدار بھی۔ اور واقعی ایک ایسی عمارت قائم کی گئی جو کئی صدیوں تک زمانہ کے ہر تھپیڑے کو سہتی اور ہر حملے کو برداشت کرتی رہی اور ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اسپین کے اب بھی بہت سے ایسے شہر تھے جن پر قبضہ براہ راست نہ تھا بلکہ وہ مختلف گورنروں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ ان میں بعض گورنرز اور بعض اہلیانِ شہر یہ سمجھتے ہوئے کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ جیسے جنرل تو واپس جا چکے ہیں اور اُن کے ساتھ بہت سی فوج اور سپاہ بھی گئی ہے، اس لئے وہ اطاعت سے منہ موڑ کر فرمانبرداری کی حدود سے نکل گئے۔

چنانچہ جہاندیدہ اور ذہین عبدالعزیز نے فوراً اُن کی سرکوبی کی اور اُن کی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر سخت سزا دے کر پھر اُنہیں اپنے دامن میں پناہ دی۔ تھیوڈومیر عیسائی ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کا حلیف اور دوست رہا تھا۔ اُس سے جو معاہدے کئے گئے تھے، اُن کی تجدید کی گئی اور بہت سی مراعات بھی عطا کی گئیں۔ اُدھر شمال و مغرب کی طرف کئی فوجیں روانہ کی گئیں کہ دُور دراز کے علاقوں میں مسلمانوں کی ہیبت کا سکہ بٹھا دیں۔ یہ فوجیں دُور دُور تک نکل گئیں۔ قدئی سی ٹیبیا کے اکثر مقامات فتح ہو گئے۔ پھر خلیج کیکے سے ملحق بعض علاقوں پر قبضہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمان فوجیں اراک تک پہنچ گئیں اور سارے علاقے کو دہشت زدہ کر دیا۔

یہ سب سرحدی علاقے تھے۔ ان کی حفاظت لازمی تھی، ورنہ کسی وقت بھی عیسائی اکٹھے ہو کر اسپین کے میدانوں پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ فرانسیسی فوج کا خطرہ تو ہر دم رہتا تھا۔ اس لئے وہاں کے قلعوں میں تجربہ کار اور قابل اعتبار عہدیدار اور گورنر مقرر کئے

گئے جن کی ماتحتی میں کافی تعداد میں حفاظتی فوجیں رکھی گئیں۔ بہت سی چھوٹی چھ چوکیاں قائم کی گئیں جہاں مختصر فوج رکھی گئی تھی، جس کے سپرد صرف نگہداشت حفاظت کا کام تھا۔ اگر کوئی بڑی فوج حملہ کرے تو امیر تک اس کی خبر پہنچا د گورنر کو باخبر کر دیں۔

عبدالعزیز نے نظامِ جمہوریت کو قائم رکھنے کے لئے اور زریں اصول پر عمل کر کے لئے ایک "مشاورتی کونسل" قائم کی جس میں اہلِ ہوش، ذی شعور اور بیدار لوگ شامل کئے گئے۔ شخصی حکومت کی بجائے مشاورتی حکومت کو ترجیح دی گئی۔ ا کونسل کے ممبران نے خزانے کی آمدنی کے ذرائع وضع کئے۔ اخراجات کے اصول کئے، رعایا پر چھوٹے چھوٹے ٹیکس لگائے، محصول مقرر کیا، جرائم کی روک تھام کی خا عدالتیں قائم کیں۔ لڑائی جھگڑوں کے انسداد کے لئے فوجداری عدالتیں بنائی گئیں مقدمات نمٹانے اور فیصلہ کرنے کے اختیارات اُنہی کے سپرد کئے گئے۔

شریعت اور قانون سے واقف لوگوں کو بحیثیت جج اور منصف مقرر کیا جو ہر مقد کی روداد پوری طرح سنتے، شہادتوں پر توجہ دیتے اور اپنے علم اور واقفیت کی بنا فیصلہ کرتے۔ ان فیصلوں کی اپیل علاقہ گورنر یا امیر اُندلس کے یہاں ہو سکتی تھی۔

غیر مسلموں پر شریعت کی پابندیاں لازم قرار نہ دیں، یہودیوں اور عیسائیوں اُنہی کے مذہب کے لوگوں کو حاکم اور منصف مقرر کیا گیا۔ اُنہی کے اصول کے ت مقدمے کی شنوائی اور فیصلے ہوتے تھے۔ البتہ اگر فریقین میں سے ایک مسلمان دوسرا غیر مسلم ہوتا تو اُن کے مقدمات اور بیانات قاضی اور مسلمان حاکموں کے سنے جاتے۔ ویسے دوسرے مذہب والوں کو مکمل مذہبی اور معاشرتی آزادی حا تھی۔ اُن کے اوپر مسلمانوں کا احترام تو لازم تھا مگر اُن کے اصولوں پر چلنا البتہ جو ٹیکس عائد ہوتا اُسے ادا کرنا پڑتا۔ ورنہ دیوانی عدالتوں میں اُن کی کھنچائی حتیٰ الامکان ظلم اور تشدد سے گریز کیا جاتا اور سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کو کی جاتی۔ کوئی اپنے پڑوسی کو نہیں ستا سکتا تھا۔ حکم تھا کہ ان کے ساتھ محبت آؤ۔ اُن کے اس رویئے نے بلاشبہ مسلمانوں کے دل میں اُن کی طرف سے اور غلط فہمی پیدا کر دی۔

زمینوں کی بہتری پر عبدالعزیز نے خاص توجہ دی۔ ملک کی خوشحالی کا تعلق اچھی فصلوں، اچھی کاشت اور بہتر زراعت سے ہے، اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ تمام کسانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اُسی طرح ان زمینوں کو کاشت کریں جیسے پہلے کرتے تھے۔ اُن کے حقوق پہلے سے دوچند اور سہ چند کر دیئے گئے، کیونکہ اُس وقت ساری کی ساری محنت کاشتکاروں کی ہوتی تھی اور تیار شدہ فصل لارڈ کونٹ کی ملکیت ہوتی تھی۔ اس کا تھوڑا سا حصہ کاشتکار کو دیا جاتا تھا، اُن کے حصے کی مقدار بڑھا دی گئی کہ وہ زیادہ توجہ اور محنت سے کام کریں اور بہتر سے بہتر فصل تیار کریں۔ کسی حاکم کو اُن کا حصہ چھیننے کی اجازت نہ تھی۔ اُن سے مفت کام نہیں لیا جا سکتا تھا، نہ اُن کے جانور، ملکیت ضبط یا قرق کی جا سکتی تھی۔

یہ سب کچھ رعایا کو خوشحال کرنے کی غرض سے تھا۔ اُن کی خوشی سے حکومت کی خوشی وابستہ تھی۔ کسانوں ہی پر کیا منحصر عبدالعزیز نے اپنی پوری رعایا کے ساتھ ایک اچھے مربی اور رحم دل باپ کا سلوک کیا۔ غلاموں کو، نوکروں کو، عام طبقے کے شہریوں کو اس قسم کی آزادی حاصل تھی کہ اس سے پہلے نہ کسی نے کبھی دیکھی اور نہ سنی تھی۔ اُن کی تن آسانی کے تمام سامان فراہم کئے گئے۔ اُن کے شہروں کا انتظام کیا گیا، اُن کی معاش کے لئے ذرائع مہیا کئے گئے، اُن کو ہر قسم کی اطمینان قلبی اور دلجمعی پہنچائی گئی کہ وہ اپنے ان حاکموں سے ناراض نہ ہو جائیں۔

جو عیسائی سردار اپنی زمینیں اور جائیدادیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے وہ اگرچہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئی تھیں مگر اُن پر ہل چلانے والوں کو بے دخل نہیں کیا گیا۔ اُن کو اپنے کاموں سے ہٹایا نہیں گیا بلکہ اُسی طرح جوتتے بوتے رہے اور زیادہ حصہ کے حقدار ٹھہرائے گئے۔ اُن کے رہن سہن میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، اُن پر کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ اس حسن سلوک نے اُن کے دل موہ لئے، اُن کو بندۂ بے دام بنا دیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آئے گا، اُن کی حالت یوں چشم زدن میں سدھر جائے گی۔ اس طرح وہ بجبر و اکراہ نہیں بلکہ رضا و رغبت اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔

عبدالعزیز کی رحم دلی اور نرم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جب اُنہیں خبر ملی کہ

بعض علاقوں میں پانی کی کمیابی کی وجہ سے قحط سالی کی صورت نمایاں ہے تو اُنہوں
نے کسانوں میں تقاویاں بانٹیں، اُن کو بیج، بیل اور دوسری سہولتیں مہیا کیں۔ صنعت
کاروں اور دیگر تاجروں کو بھی حتیٰ الامکان مدد پہنچائی مگر ملک کی حالت کو خراب نہ
ہونے دیا۔ اور یوں اپنے انتظام کا مظاہرہ کیا۔ کئی جگہ ٹیکس معاف کر دیا۔ یوں بھی
ٹیکس لگتا تھا وہ بارہ درہم سالانہ یعنی تین روپیہ فی کس کے حساب سے لگتا تھا جو
تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ امیروں کو البتہ بارہ سے چالیس درہم سالانہ دینا پڑتا تھا
جو کسی طرح اُن کو بار نہ گزرتا تھا۔ عبدالعزیز نے رعایا کی بہبود اور آسائش کی خاطر
حفظانِ صحت کی تمام تراکیب کیں۔ تعلیم گاہیں بنوائیں، سرائے اور مسافر خانے
بنوائے، محتاجوں کے لئے خاص محتاج خانے تعمیر کرائے۔ تعجب اس بات کا نہیں کہ
سب کچھ اُنہوں نے کروایا، بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ یہ سب ایک سال کی قلیل
مدت میں ہوگیا۔

مورخین نے اُن پر عیش و عشرت سے زندگی گزارنے کا الزام لگایا ہے۔ اُن کے
خیال میں محل میں حسین ترین عیسائی کنواری لڑکیاں کنیزوں کی حیثیت سے رہتی تھیں۔
یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ ہر فاتح کے یہاں مفتوح کی اولادیں یا تو غلام بنائی جاتیں
یا پرورش کی خاطر رکھ لی جاتیں۔ عبدالعزیز کے محل میں تو اُن کے لئے تمام سامانِ
آسائش مہیا تھے۔ خصوصاً جبکہ وہ لاوارث اور بے سہارا ہو چکی تھیں۔

اُندلس کے بادشاہ راڈرک کی عیسائی بیوہ ای جی لونا سے عبدالعزیز نے شادی کر
لی تھی اور وہ اُس کو حد سے زیادہ چاہتے تھے، اُن کا احترام کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اُنہیں
اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت بھی دے دی تھی اور کوئی رُکاوٹ اُن کی ادائیگی
میں نہ ڈالتے تھے۔ ملکہ جی لونا اپنے عشوۂ غمزہ اور شوخی ادا کی بدولت بہت جلد
عبدالعزیز کے مزاج پر حاوی ہوگئی تھیں۔ عیسائیوں پر خاص مراعات ہو رہی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ امیر عبدالعزیز ایک مدبر، دانا، باشعور، ذی حوصلہ اور ذی
مرتبہ امیر تھے جو جہانداری اور جہاں بانی کے تمام اصولوں سے بخوبی واقف تھے
اُنہوں نے ایک سال کی مدت میں وہ کر دکھایا جو دوسرے برسہا برس میں نہ کر سکے
تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مورخین نے امیر عبدالعزیز کے بارے میں لکھا ہے:

بہت کچھ شیر شاہ سوری سے مماثلت رکھتے تھے جس نے ہمایوں سے سلطنت چھیننے کے
بعد چار سال کے اندر ہندوستان کی حالت ہی بدل دی تھی۔

ان خوبیوں کے باوصف امیر عبدالعزیز میں ایک سب سے بڑا عیب تھا کہ وہ اپنی
بیگم ملکہ جی لونا پر اس قدر فدا تھے کہ اُس کی آنکھ کے اشارے کے بغیر وہ اپنے منہ میں
نوالہ تک نہ ڈالتے تھے۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ امیر عبدالعزیز کی کوششوں سے
ایک طرف تو ترقی کے دروازے کھل رہے تھے مگر دوسری جانب اُن کی ملکہ اندر ہی
اندر ان کھلتے ہوئے دروازوں پر رفتہ رفتہ پہرے بٹھا رہی تھیں۔ اُنہوں نے اپنی
کوششوں سے عیسائیوں کو اتنے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرا دیا جن کا وہ تصور بھی
نہ کر سکتے تھے۔

مسلمان، خصوصیت سے برسر اقتدار طبقہ اس کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا
تھا۔ پھر ملکہ ای جی لونا نے اپنے اقتدار میں ایک بات کا اور اضافہ کیا اور وہ تھا زنانہ
دربار۔ ملکہ ای جی لونا نے شاہی دربار کے مقابلے میں زنانہ دربار کی بنا ڈالی۔ جس
وقت باہر مردانے میں شاہی دربار لگتا، اُسی وقت اندر خانہ ملکہ ای جی لونا کی عظیم وسیع
خوابگاہ میں زنانہ دربار لگنے لگا۔

اس زنانہ دربار کی سربراہ ملکہ ای جی لونا ہوتی اور وہاں ایسی درخواستیں پیش کی
جاتیں جنہیں مردانہ دربار میں امیر عبدالعزیز نامنظور کر دیتے تھے۔ ان مسترد شدہ
درخواستوں پر ملکہ ای جی لونا اور اُس کی خود ساختہ ''مشورہ کمیٹی'' ازسرِنو غور کرتی اور اپنا
مشورہ پیش کرتی تھی۔ اگر یہ کمیٹی کسی درخواست کو معقول اور قابلِ قبول سمجھتی تو وہ ملکہ
کے سامنے پیش کی جاتی اور ملکہ ای جی لونا اس مسترد شدہ درخواست کو اپنی کوشش سے
امیر عبدالعزیز سے منظور کرا لیتی تھی۔

چنانچہ اس دوہری یا دوغلی دربارداری سے حکومت کے احکامات متاثر ہونے لگے
جسے بااقتدار امیروں اور وزیروں نے سخت ناپسند کیا۔ ابھی یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ
ایک نئے فتنے نے سر اُٹھایا۔ یہ فتنہ ملکہ ای جی لونا کے ایک حکم سے پیدا ہوا تھا۔ ملکہ
جی لونا نے اپنے حکم سے ایک قانون بنا لیا کہ اُس کے زنانے دربار میں پیش ہونے
والی ہر خاتون خواہ اُس کا سرکار دربار میں کتنا ہی اُونچا مرتبہ ہو وہ اس دربار میں داخل

ہو کر سلام پیش کرنے کی بجائے ملکہ جی لونا کو احتراماً ''سجدہ'' پیش کرے گی۔ یعنی دربار میں آنے والی ہر خاتون پر دربار میں داخلہ پر ملکہ کو سجدہ کرنا فرض قرار دے دیا گیا اور یہ رواج زنانہ دربار کا ایک قانون بن گیا۔

ملکہ کے زنانہ دربار میں عام طور سے وہ ضرورت مند خواتین حاضری دیتی تھیں جن کی درخواستیں مردانہ دربار (یعنی شاہی دربار) میں نامنظور ہو جاتی تھیں۔ وہ بیچاری تو ملکہ کے دربار میں داخل ہوتے ہی ''سجدہ'' میں گر پڑتی تھیں اور رو رو اور چیخ چیخ کر دہائیاں دینے لگتی تھیں اور جب تک اُن کی درخواست منظور نہ ہوتی وہ اسی طرح چیخ و پکار مچاتی رہتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی نامنظور درخواست زنانے دربار میں پیش کی جاتی تو اُس پر مشورہ کمیٹی از سرِ نو غور کرتی۔ اگر کمیٹی کے خیال میں درخواست ''قابلِ قبول'' ہوتی تو وہ ملکہ ای جی لونا سے سفارش کرتی کہ اس کی فوری طور پر عبدالعزیز سے منظوری حاصل کی جائے۔

پس ملکہ ای جی لونا، سفارشی کمیٹی کے فیصلے کے مطابق اُس نامنظور درخواست کو لے کر فوراً امیر عبدالعزیز کے احکامات حاصل کرنے کے لئے بھاگتی اور وہ جہاں بھی ہوتے وہاں پہنچ کر اس کی منظوری حاصل کر لیتی تھی۔ اس طرح ملکہ ای جی لونا کے رتبے، مرتبے اور شان و شوکت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا جسے دربار کے امیر، وزیر پسند نہ کرتے تھے۔

اسی پر بس نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک دن دربار میں ایک شاہی حکم پڑھ کر سنایا گیا جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا:۔

''رعایا اور اراکین سلطنت جب امیر کے سامنے حاضر ہوں تو امیر کی عزت بجا لانے کی خاطر وہ اُس کے سامنے سجدہ کریں۔''

اُس وقت امیر عبدالعزیز دربار میں موجود نہ تھے۔ درباریوں نے یہ حکم سنا تو اُن کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ پورا دربار سوائے ایک دو اشخاص کے مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مذہب اسلام میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا سجدہ جائز نہیں اس لئے پورے دربار میں شور مچ گیا اور ہر طرف سے ''نامنظور ——— نامنظور'' کی صدائیں بلند ہونا

شروع ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ اُسی وقت امیر عبدالعزیز کو تلاش کر کے اُن کے سامنے وہ حکم نامہ رکھا گیا۔ امیر عبدالعزیز نے جو درباریوں کی بگڑی ہوئی تیوریاں دیکھیں تو فوراً مکر گیا۔ اُس نے صاف الفاظ میں اعلان کیا۔

''میں نے یہ حکم جاری نہیں کیا۔ یہ حکم نامہ غلط ہے۔''

مسلمان کیسا ہی آوارہ، لچا اور لفنگا ہو مگر وہ مذہب کے نام پر فوراً بھڑک اُٹھتا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ امیر عبدالعزیز نے اس کی فوری تردید کر دی ورنہ خدا معلوم کیا قیامت برپا ہو جاتی۔ عبدالعزیز کے انکار سے معاملہ اس وقت تو دب گیا۔ مگر دربار میں کھلے عام دو جماعتیں بن گئیں۔ ایک جماعت نے ملکہ ای جی لونا کا دامن پکڑا تو دوسری جماعت خدائی فوجدار بن کے ملکہ جی لونا اور اُس کے حواریوں کے مقابلے پر خم ٹھونک کے کھڑی ہو گئی۔

اس سلسلے میں ملکہ اور عزیز یعنی میاں بیوی میں خواہ مخواہ کا ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ملکہ جی لونا کی وجہ سے اُمراء کی ایک بڑی تعداد امیر عبدالعزیز کے خلاف ہو گئی۔ چنانچہ اس گروہ نے در پردہ مسلم خلیفہ کے پاس پیغامات بھیجنا شروع کئے کہ اُندلس میں خلیفہ کا نائب امیر عبدالعزیز، اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کی بجائے عیسائیت کو فروغ دے رہا ہے۔ پس اسی طرح کی خبروں سے دربارِ خلافت میں بھی کئی پارٹیاں بن گئیں۔

یہاں پر اس بات کا اظہار انتہائی ضروری ہے کہ اگرچہ یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ملکہ جی لونا نے اپنے شوہر امیر عبدالعزیز کو اس بات پر مجبور کیا تھا کہ اُس کے دربار میں آنے والوں پر یہ بات لازم بنائی جائے کہ وہ امیر عبدالعزیز کے احترام میں دربار میں داخل ہو کر اُسے سجدہ پیش کیا کریں۔ اس طرح ملکہ جی لونا اس الزام سے تو بچ گئیں کہ انہوں نے مسلم دربار میں امیر وقت کو سجدہ کرنے کا رواج ڈالنے کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر کتابوں سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ اگرچہ عبدالعزیز ملکہ کے اس مطالبہ پر تو راضی نہ ہوئے مگر انہوں نے اپنے محل میں پہنچنے کے لئے ایک دروازہ ایسا ضرور بنوا دیا جو دوسرے دروازوں کی نسبت ذرا چھوٹا تھا اور اس دروازے سے گزرتے وقت، گزرنے والے کو جھکنا پڑتا تھا۔

چنانچہ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ امیر کا مقصد ہے کہ رعایا اُس کے سامنے
کرے۔ عرب جو بڑے غیور اور خودسر ہوتے ہیں وہ اس توہین کو ہرگز برداشت
سکتے تھے۔ اُن کے لئے یہی بہت گراں تھا کہ غیر مسلم عورت کے ہاتھ میں اس
اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ چنانچہ یہ ترکیبیں سوچی جانے لگیں کہ اُن کو را
سے ہٹا دیا جائے۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ امیر عبدالعزیز اپنی خوش اخ
اور رحم دلی کی وجہ سے محبوبِ عوام بن چکے تھے اور لوگ اُن کو ایک اچھے باپ کا
بیٹا سمجھتے تھے۔

امیر عبدالعزیز نے پوری رعایا کے ساتھ ایک اچھے مربی اور ایک رحم دل باپ کا
سلوک کیا۔ غلاموں کو، نوکروں کو، عام طبقے کے شہریوں کو اس قسم کی آزادی حاصل
کہ اس سے پہلے نہ اُنہوں نے کبھی دیکھی تھی نہ تصور کی تھی۔ عبدالعزیز نے رعیت
آسانی کے تمام سامان فراہم کئے تھے۔ اُن کے شہروں کا انتظام کیا تھا، اُن کی م
کے لئے ذرائع مہیا کئے گئے، اُن کو ہر قسم کی اطمینان قلبی اور دلجمعی پہنچائی تھی کہ
اپنے ان نئے حاکموں سے بددل یا ناراض نہ ہو جائیں۔

یہاں تک کہ جو عیسائی سردار اپنی جائیدادیں اور زمینیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے
ہرچند کہ تقسیم تو مسلمانوں میں کی گئی تھیں مگر اُن پر ہل چلانے والوں کو بے دخل
کیا گیا۔ اُن کو اپنے کاموں سے ہٹایا نہیں گیا بلکہ وہ پہلے کی طرح جوتتے اور بو
رہے اور زیادہ حصے کے حقدار ٹھہرائے گئے۔ اُن کے رہن سہن میں بھی کوئی تبدیلی
کی گئی۔ اُن پر کوئی مذہبی پابندی بھی نہ عائد کی گئی۔ اس حسن سلوک نے اُن کے
موہ لئے۔ اُن کو بندۂ بے دام بنا دیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کی زندگی
ایک اتنا بڑا انقلاب آ جائے گا، اُن کی حالت یوں چشم زدن میں سدھر جائے
یوں زبردستی نہیں بلکہ یہ رضا و رغبت و اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے ساتھ جو فوج آئی تھی، اُس میں بر
افریقہ کے مقامی باشندے زیادہ تھے جو اسپین میں بسنے یا مستقل قیام کرنے کی غرض
سے نہیں، بلکہ جوشِ جہاد اور جنگ و جدل کی عادت اُنہیں ایک سرحد پار کر کے دو
سرحد میں لے آئی تھی۔ بعد میں جو لوگ آ آ کر شامل ہوتے رہے اُن میں قبطی

زیادہ تھے جو محض مال و متاع اور مالِ غنیمت حاصل کرنے چلے تھے۔ مگر جب موسیٰ بن
نصیر، اُندلس کے ساحل پر اُترے تو اُن کے ساتھ شرفائے حجاز بھی تھے، ثقہ ایرانی بھی،
صحابہ کرام بھی اور اولادِ صحابہ کرام بھی۔ یہ سب اب وہاں مستقل آبادیاں قائم کرنے
اور مستقل بسنے کے خیال سے آئے تھے۔ اُن کو مالِ غنیمت حاصل کرنے کا جذبہ اتنی
دور اور تکلیفیں اُٹھا کر نہیں لایا تھا بلکہ یہ لوگ تو کفرستان میں دین اور اسلام کی مشعل
روشن کرنے آئے تھے۔ چنگ، ناقوس کی جگہ اذانوں کی گونج سنانے آئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ فتح اسپین کے بعد سیاسی حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اگر اس پر
مستقل قبضہ رکھنا ہے تو مقامی باشندوں پر مکمل اعتماد نہ کرتے ہوئے محض محافظ دستوں
پر اعتبار نہ کرتے ہوئے، مسلمانوں کی آبادیوں کو بھی قائم کیا جائے ورنہ یہ محافظ دستے
کسی وقت بھی اُکتا کر بھاگ سکتے تھے یا دشمنوں کے باغیانہ جذبات کا ہدف بن سکتے
تھے۔ اہلیانِ اسپین کا یہ حال تھا کہ ادھر طارق بن زیاد کی پیٹھ پھری اُدھر باجہ، مالقہ،
غرناطہ، ایلبورا میں بغاوت ہو گئی۔ اور موسیٰ کو کچھ عرصہ ماروہ کی فتح میں لگا اور اشبیلیہ،
ایثی، کبورا، غرناطہ، مرسیہ پھر اطاعت سے باہر ہو گئے۔ ایسے لوگوں اور ایسی قوم پر
کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اگر مسلمانوں کو وہاں بسایا نہ جاتا اور اُن کی حکومت کا قیام
عمل میں نہ آتا تو اس قدر جنگ و جدل، اتنی خونریزی، اتنی جانفشانی، یہ سرفروشی سب
ہی ضائع ہو جاتی اور اتنا بڑا علاقہ جو نہ معلوم کس کس مصیبت سے فتح کیا گیا تھا بلاوجہ
ہاتھ سے نکل جاتا اور مسلمان یونہی ہاتھ ملتے رہ جاتے۔

اسپین کی فتح اواخر پہلی صدی میں ہوئی۔ موسیٰ کی واپسی 95 ھ میں ہوئی۔
آنحضرتؐ کو وفات پائے اسی سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اُس وقت کسی صحابی
رسولؐ کا موجود ہونا خالی از تعجب نہ تھا۔ بہت سے تو عہد یزید اور عبدالملک میں محاصرہ
مدینہ کے دوران اپنے خدا اور حبیبِ خداؐ سے جا ملے تھے۔ بہت سے طبعی عمر کو پہنچ کر
جاں بحق ہو چکے تھے۔ جو دو چار باقی رہ گئے تھے وہ مدینہ کی گلیوں اور مکہ کی حدود میں
ہی باقی ماندہ دن گزار دینا غنیمت شمار کرتے تھے۔ مگر یہ اسپین کی سرزمین کی انتہائی
خوش بختی تھی کہ وہاں صحابہ کے قدم پہنچے اور تابعین حضرات کے بھی۔

ہم اس سلسلے میں پہلے بھی حضرت منیذرؓ کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ بزرگ موسیٰ بن

نصیر کے ہمراہ آئے تھے۔ اُنہیں خدمت رسولؐ کا شرف حاصل تھا۔ ساتھ آنے والوں
میں دس کے قریب تابعین تھے جن کے مختصر حالات اس طرح ہیں۔

1- خنش الصنعانی:۔ ان کا نام حسین تھا۔ یہ عبداللہ کے بیٹے تھے اور خنش اُن کا
لقب تھا۔ ابوعلی کنیت تھی۔ شام کے شہر صنعا کے رہنے والے تھے۔ آپ اُندلس، موسیٰ
بن نصیر کے ساتھ تشریف لائے۔ سرقسط میں قیام کیا۔ اپنے ہاتھوں ایک مسجد کی بنا ڈالی
جو جامع مسجد کہلائی۔ وفات کے بعد اسی مسجد کے مغربی کونے میں باب الیہود کے
قریب مدفون ہوئے۔ کبھی ان کا مزار زیارت گاہ عام تھا اور خلق کا اژدہام لگا رہتا تھا۔

2- عبداللہ بن رباح اللخمی:۔ یہ دیکھنے سے معذور تھے۔ اسپین آئے تو یہیں رہ
پڑے۔ ان کی اولاد آگے چل کر خوب پھلی پھولی۔

3- ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یزید المعافری الجبلی والانصاری:۔ انہوں نے قرطبہ کو
مرکز بنایا۔ خدمت خلق بھی کی، خدمت دین بھی۔ لوگ اُن سے بہت مانوس تھے اور
اکثر اُن سے مسائل دریافت کرنے آیا کرتے تھے۔ جب قرطبہ میں انتقال کیا تو
معتقدین زار و قطار روتے رہے۔ ان کے مزار نے لوگوں کو ہمیشہ اپنی جانب متوجہ رکھا۔

4- حبان ابن ابی جبلہ:۔ آپ کی کنیت ابونصر تھی۔ یہ موسیٰ بن نصیر یا ان کے بعد
فرانس جا پہنچے تھے۔ اس ملک کی سرحد پر ایک مقام قرقشونہ کا ہے وہاں وفات پائی اور
دفن ہوئے۔

5- مغیرہ بن ابی بردہ:۔ یہ بھی ایک پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ انہوں نے اکثر
جنگوں میں حصہ لیا۔ یہ اپنے قبیلے کے سالار تھے۔

6- نشیط بن کنانہ الندری:۔ ان کا شمار بھی با عظمت ہستیوں میں تھا۔ قبیلے کی
سرداری کا فخر بھی انہیں حاصل تھا۔

7- حیاۃ بن رجاء التجیبی:۔ ان کا شمار بزرگوں میں ہوتا تھا۔ یہ بابرکت حضرات میں
تھے۔

8- عبداللہ بن شماستہ الفہری:۔ قبیلہ فہر میں تھے۔ حجازی تھے۔ اُندلس ایسا بھایا کہ
باقی زندگی یہیں گزار دی۔

9- عیاض بن عقبہ الفہری:۔ یہ قبیلہ فہر میں تھے۔ عقبہ نے جو شہرت حاصل کی وہ

پوشیدہ نہیں۔ عیاض اُنہی کے صاحبزادے تھے اور بزرگ ہستیوں میں تھے۔

10- عبدالجبار بن ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف زہری:۔ یہ خاندان واجب
التعظیم تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف تو عشرہ مبشرہ میں تھے اور نارِ دوزخ اُن پر حرام تھی۔ اُن
کے مرتبے کے مطابق ان کو عزت اور تکریم حاصل ہوئی۔

اس بات کا خیال رہے کہ اُندلس، اسپین اور ہسپانیہ یہ تینوں ایک ہی ملک کے نام
ہیں۔ ہسپانیہ کا ملک اپنی مغربی حدود میں ایک جزیرہ نما کی شکل رکھتا ہے۔ اس کے
ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور باقی تین طرف نیلگوں سمندر کی موجیں ساحل
سے ٹکراتی ہیں۔ آج کا اسپین پرتگال سے الگ ہے۔ مگر جس وقت مسلمانوں کے قدم
اس سبزہ زار ملک میں پہنچے تو پرتگال بھی اس میں شامل تھا۔

اُندلس کو کبھی یونانیوں نے آئریا کے نام سے پکارا تو کبھی رومانیوں نے اسے
ہسپانیہ کا لقب دیا۔ اور جب کلمہ گو وہاں پہنچے تو انہوں نے اس کو اُندلس کے نام سے
موسوم کیا۔ یہ خیال بھی ہے کہ اُندلس پیغمبر نوح علیہ السلام کے شجرۂ نسب سے اُندلس
بن طوبال بن یافث کے اپنے نام سے مشتق کیا گیا۔ قرین قیاس نہیں ہے۔

مورخین اُندلس کو مسلمانوں کے حملے سے قبل عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا لفظ
بتاتے ہیں۔ مگر جو چیز زیادہ قرین عقل و قیاس ہے وہ یہ کہ جزمانی (ہاسکولس) قوم نے
اس جزیرہ نما کو وندال یا وندالس کا نام دیا ہے۔ یہی نام بگڑ بگڑا کر عربی میں "فندلس" یا
اندلس بنا اور اسی کی بہتر صورت اُندلس ہے۔ جس میں لطافت اور روانی دونوں موجود
ہیں۔ جزمانی، رومیوں کی پراگندگی کے بعد اسپین کے جنوبی حصہ بائیٹکا
(BAETICA) پر قابض ہوئے۔ چونکہ اس پر وندال کے قدم جمے ہوئے تھے اس
بناء پر فاتح نے اسے واندیلشہ کہہ کر پکارا۔

عربوں نے سب سے پہلے اس کے جنوبی حصہ پر حملہ کیا۔ چونکہ وہ ایلشیہ کہلاتا تھا
لہٰذا اسے اُندلس کہنے لگے۔ مگر بعد میں جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تو کل
کا کل علاقہ اُندلس ہی کہلانے لگا۔ حتیٰ کہ اس میں پرتگال کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔ نہ
صرف یہ بلکہ جب لمبی قبائیں پہننے والے، فرانس کی حدود میں داخل ہوئے تو انہوں
نے اکیٹینا (AQUITINA) اور (NORBONIENIN) فتح کیے تو اس کو بھی انہوں

نے اُندلس کا علاقہ شمار کیا۔ رفتہ رفتہ فتوحات کے ساتھ ساتھ سارے علاقہ ہی اُندلس کہلانے لگے۔ اور جب یہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلنے لگے تو بقیہ حصہ بھی اسی نام سے موسوم رہا۔ گویا اس جزیرہ نما میں جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی وہاں کا نام اُندلس رہا۔

پھر جو علاقے بعد میں عیسائیوں نے حاصل کئے اُنہیں مسلمان بھی اُن کے ہی ناموں سے پکارنے لگے۔

یورپ کا یہ ملک قدرتی نعمتوں اور رعنائیوں سے آراستہ ہے۔ اس میں زمین زرخیز کرنے والی ندیاں بھی بہتی ہیں۔ معدنیات سے پُر پہاڑوں کے سلسلے بھی ہیں۔ حسین مگر تیز رو آبشاریں بھی ہیں اور ہرے بھرے مرغزار بھی۔ عربوں نے اسے جزیرہ کہا۔ مگر شکل کے لحاظ سے یہ جزیرہ نما ہے کیونکہ اس کے تین اطراف میں بحر ذخار ہے، ایک طرف فرانس سے جدا کرنے والی پائرینس پہاڑوں کے سلسلے بھی۔ جن کے قدرتی درّے اور پہاڑ ہیں اور اسپین کو فرانس سے ملانے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ جنوب میں بحر رقاق اور مشرق میں بحر متوسط۔ مغرب میں بحر محیط اور جنوب میں پائرینس پہاڑ ہیں اور خلیج بسکے ہے۔

بحر متوسط اور بحر محیط کو جو آبنائے ملاتی ہے اسے آج کل جبر الطارق بھی کہتے ہیں اور یہی افریقہ اور اسپین کے درمیان مختصر سی دوری ہے جہاں بحر محیط اور خلیج بسکے ملتی ہے۔ اسے مجمع البحرین بھی کہتے ہیں۔

جنوب اور شمال مشرق کے کناروں پر جو حلقہ قائم ہوتا ہے وہ بحر رقاق اور بحر متوسط کے ساحلی علاقے ہیں۔ یہ سلسلہ ساحل سے لگا ہوا اربونہ جو فرانس میں شامل ہے، تک چلا گیا ہے۔ مگر بیچ میں سمندر کے کنارے الزہرا آتا ہے۔ یہ علاقہ طرف الاغر ہے جسے TRAFALGAR کہتے ہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے قریب ہی جزیرہ طریف ہے جہاں موسیٰ بن نصیر پانچ سو سواروں کے ساتھ اُترا تھا۔

جنوب اور شمال مشرق سے جو علاقے منسلک ہیں وہ ساحلی شہر رقاق سے شروع ہو کر کنارے کنارے بحر محیط تک چلے گئے ہیں۔ پہلا مقام اشبونہ آتا ہے، اس کے بعد شنترہ اور پھر شنستر بن غرضیکہ یہ سلسلہ جلیقیہ تک چلا گیا ہے جہاں بحر محیط اور خلیج بسکے

آپس میں ملتے ہیں۔

شمال مغرب و مشرق۔ یہ علاقے جلیقیہ کے آگے اشتواراس، اُس کے بعد لشکولنس بعد ازاں نمرہ اور اس سے ملا ہوا جبرالبرتات کا علاقہ ہے۔ اس کے بعد فرانس کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ جنوبی فرانس میں بھی مسلمانوں نے متعدد حملے کئے اور کم از کم بہی معرکے اس سرزمین پر انجام پائے۔

شمال مغرب اور مشرق و جنوب کے ساحلی علاقوں سے ملحق درمیانی علاقے جو انتہائی سرسبز اور شاداب، زرخیز اور قدرتی عطیات سے پُر ہیں، انہی علاقوں میں بڑے بڑے زبردست معرکے ہوئے۔ یہاں ہی حکومتوں نے قیام کیا اور یہیں نشیب و فراز آئے۔

اُندلس کے ایک جانب مختصر مگر پہاڑی اور خشکی کا سلسلہ ہے اور تین جانب پانی ہی پانی۔ ایک سمت بحیرہ روم ہے تو دوسری جانب بحر اٹلانٹک، تیسری جانب جبرالٹر۔ یہ دراصل بحر متوسط اور بحر محیط کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔ یہ تنگ آبنائے جنوبی اُندلس کو شمالی افریقہ سے متصل کرتی ہے۔ اُندلس کے شمال میں بحر خضر ہے۔ اُندلس کے طول و عرض کی بابت کافی خیال آرائیاں کی گئی ہیں۔ جو حدود پہلے متعین تھے اُن کا اطلاق موجودہ حدود پر نہیں ہوسکتا کیونکہ اب پرتگال ایک علیحدہ ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ طریقے پر اگر ہم پیمائش کریں تو مشرق سے مغرب تک طول 365 میل ہو گا اور شمال سے جنوب تک 510 میل۔ اس میں فرانس کا کوئی حصہ شامل نہیں۔ دورِ گزشتہ میں یہ طول و عرض 100 میل اور 600 میل تھا۔ فرق کی وجہ ظاہر ہے۔ اُندلس سطح سمندر سے تقریباً دو ہزار فٹ بلند ہے۔ اگر پورب سے پچھم کی طرف چلا جائے تو یہ اُونچائی کم ہو جائے گی جتنی کہ بحر اٹلانٹک کی سطح آ جائے گی۔

اُندلس میں پہاڑیوں کا جو سلسلہ نمایاں نظر آتا ہے وہ جبل البرانیس (پائیریز) ہے۔ اسے کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جبل البرتات بھی اسی کو کہتے ہیں۔ جبل الابواب، جبل الفاضل اور جبل الحاجز بھی اس کے نام ہیں۔

یہی پہاڑ اُندلس کو فرانس سے جدا کرتے ہیں مگر چند قدرتی درّے تنگ مگر عمدہ

راستے کا کام دیتے ہیں اور ان دونوں ملکوں میں آنے جانے کے یہی راستے ہ
چار ہیں۔ان راستوں کے عموماً یہ نام ہیں۔

1- برت الشمرۃ　　2- برتِ جافہ
3- برت شاذر　　4- برت بونہ

1- برت الشمرۃ صوبہ قیطولینہ میں ہے۔ برت جافہ صوبہ دشقہ میں، برت بینوتہ کے قریب، برف بونہ فرانس کے شہر بونہ کے پاس اور اُندلس میں علاقہ نوار قریب۔جبل البرانس کا سلسلہ مغرب میں کافی دُور تک چلا گیا ہے اور لبیکے اشتوراس کے علاقوں سے گزر کر خلیقیہ میں ختم ہوتا ہے۔لطف یہ ہے کہ جن علا سے گزرتا ہے نام بھی انہی کے حاصل کرتا جاتا ہے۔لبیکے میں جبل شکنن اور اش اوراس میں جبل اشتوراس۔

جبل البرانس کے علاوہ سرزمین اُندلس پر اور بھی پہاڑیوں کے نقش جابجا اُ ہوئے ہیں۔

2- شارات SIERRAS :۔ یہ سلسلہ پائیرنیز کے دکن کی جانب واقع ہے صوبہ سرقطہ کے جنوب و مغرب سے شروع ہوکر پرتگال کے شہر تلمریہ تک گیا۔ شارات عربی زبان کا لفظ ہے جو شاید ہسپانوی لفظ سائرا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کے معنوں میں اختلاف ہے۔اکثر اسے لاطینی زبان سے حاصل کیا ہوا لفظ بتاتے جس کے معنی آرے کے ہیں اور کچھ اسے صحرا کے معنوں میں بتاتے ہیں۔ د قرین قیاس محسوس ہوتے ہیں۔ پہلے معنی ہیں کہ شارات کی چوٹیاں آرے دندانوں کی مانند ہیں اور دوسرے معنی اس وجہ سے کہ وسط ملک کی سرزمین خشک اور صحرا کی مانند ہے۔اس پہاڑ کے کئی حصے ہو گئے ہیں۔ پہلا حصہ رملہ یا رملیہ ہے اور دوسرا حصہ استریلا۔

3- جبل طلیطلہ کا پہاڑی سلسلہ شارات کے جنوب سے شروع ہوتا ہے۔اس ایک ٹکڑے کا نام شارات داد اللب ہے اور دوسرا ٹکڑا دریائے ٹیکس اور وادی آن جو سیراب ہوتے ہیں ان کے بیچ میں ہے۔

4- شاراتِ مورینہ:۔ جبل طلیطلہ کے جنوب میں یہ سلسلہ چلا گیا ہے اور اُند

بیچ میں واقع ہے۔ اکثر نے اسے جبل قرطبہ بھی لکھا ہے۔ کیونکہ اس کی شاخیں بہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ مشرقی حصہ میں جبل مشقورہ ہے جس سے دو بڑے دریا شقور اور وادی الکبیر نکلتے ہیں۔

5- جبل اشینز :۔ یہ چھوٹا سا سلسلہ ہے جس کو اب سائرا نوادا کہتے ہیں۔ اس کی ے چھوٹی چوٹی 11664 فٹ بلند ہے۔ گویا یہ سب سے بلند چوٹی ہے۔ اس کا یردری مولا باسن ہے۔ ابوالحسن شاہانِ غرناطہ میں سے ایک بادشاہ کا نام ہے۔

6- ابشارات:۔ یہ ایک چھوٹا سا سلسلہ ہے جو صوبہ غرناطہ میں جبل الشلیخ کے جنوب ساحل کے قریب دونوں طرف پھیلا ہوا ہے۔

ملک اُندلس کی شادابی، زرخیزی اور ہریالی وہاں کے گیارہ دریاؤں کی مرہون ت ہے جو وہاں اِدھر اُدھر پھیلے پہاڑی سلسلوں سے نکل کر پیچ و خم کھاتے، لہراتے ملک کو سبزہ زار بناتے ہوئے بہتے ہیں۔ ان دریاؤں کے نام اس طرح ہیں۔

1- وادی النساء:۔ یہ مختصر دریا طریف اور جزیرہ خضرا کے درمیان بہتا بحر روم میں رتا ہے۔

2- وادی آرد:۔ یہ دریا جبل رند کے منہ سے نکل کر اور بحر جبرالٹر سے ہٹ کر بحر م میں گرتا ہے۔

3- وادی القرشی:۔ یہ بھی جبل رند سے نکلتا ہے اور مالقہ سے دکن کی جانب بحر روم ں گرتا ہے۔ اس دریا کے کنارے کئی مشہور شہر آباد ہیں۔

4- وادی شقورہ:۔ یہ نسبتاً بڑا دریا ہے۔ اس کو نہر ابیض بھی کہتے ہیں اور یہی ائے مرسلیہ بھی کہلاتا ہے۔ اس میں کئی دریا مل جاتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ زیرنظر ناول موسیٰ بن نصیر میں یہ ایک دم دریاؤں اور ڑوں کا تذکرہ کیسے شروع ہوگیا؟ اس سلسلے میں یہ عرض کر دوں کہ تاریخ، دوسری ل سائنسوں کی طرح ایک سائنس ہے جو اپنے وسیع معنوں میں قوم اور ملک کی تعمیر ریب کے تاثرات پیش کرتی ہے، معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر کھینچتی ہے، عوام کے ثات اور میلانات کا پتہ دیتی ہے۔ جو تاریخ محض حکمرانوں کے کارناموں تک ود ہوکر رہ جائے اور اُس دور کے انسانوں کا ذکر نہ کرے، تاریخ کہلانے کی مستحق

نہیں ہو سکتی۔ ہر سوسائٹی کی بنیاد اس کے ماضی کی روایات اور اعلیٰ اقدار پر رکھی
ہے۔ وہ جتنی مستحکم ہو گی، عمارت اتنی ہی خوبصورت اور عالیشان ہو گی۔

جب تک تاریخ کسی مخصوص عہد کے معاشرے کا مکمل جائزہ نہ لے، اس کی ز
کا کوئی واضح تصور پیش نہ کرے، شاہ سے لے کر گدا تک نہ ملائے، اُس زمانہ
دانشوروں، فنکاروں، صنعت کاروں، عالموں، فقیہوں اور دوسری اعلیٰ شخصیتوں کا
نہ کرے، مختلف فرقوں، جماعتوں اور گروہوں کے باہمی تعلقات یا تنازعات پر
نہ ڈالے، عام زندگی اور روزمرہ کے حالات کی کیفیت نہ بیان کرے، نامکمل بھی
اور ناقص بھی۔ پھر آج کے ناول نویس خصوصاً تاریخی ناول نگار کی ذمہ داریاں گز
لکھنے والوں کے مقابلہ میں دو چند اور سہ چند ہو گئی ہیں۔

آیئے اب ہم ناول کے سلسلے کو پھر وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے ہم
چھوڑا تھا۔ ہم نے اس وقت تک کے اُندلس کے چار دریاؤں کا حال بیان کیا تھا
کے نام یہ ہیں:۔

1- دریائے وادی النساء، 2- دریائے وادی آرد، 3- دریائے وادی القر
4- دریائے وادی شقورہ

اس کے بعد کے دریاؤں کے نام اور تفصیل اس طرح ہے۔

5- دریائے وادی شقر:۔ یہ دریا جبل شنت گر یہ بنور زین سے نکلتا ہے اور شہر
کے پاس بحر متوسط میں گرتا ہے۔ اس کا ایک معاون دریا کبریل ہے جس کا منبع
وہی ہے۔ اس دریا پر قونکہ نامی شہر آباد ہے اور مرسیلہ اور دلعبیہ کی سرسبزی بھی اسی
کی وجہ سے ہے۔

6- دریائے وادی ابیض:۔ اس دریا کو توریا بھی کہتے ہیں۔ یہ جبل وردقہ سے
ہے اور بلینہ کے پاس بحر متوسط میں گرتا ہے۔ یہ قشتابعہ کے علاقے سے بھی گزرتا
اور بلینہ اور ارغون کے پاس سے بھی۔

7- وادی ابرد:۔ یہ تقریباً 425 میل لمبا دریا ہے۔ دریائے جبل البرانس کے شمال
سے BISCAY کے پاس سے نکلتا ہے اور طرطونیہ سے ذرا آگے بحر متوسط میں
ہو جاتا ہے۔ اس کے دائیں جانب وادی سلون ہے جس میں دریائے شلوقہ بہتا

اور وادی المب بھی شامل ہے۔ اور بائیں جانب وادی خملق کے پاس سرقسط کا شہر ہے
اور وادی شعر جس پر لاردہ کا شہر ہے اس کے کنارے طرطوشہ اور مکنامہ، روطہ، سرقسط،
تطیلہ جیسے بڑے شہر آباد ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُدرنوڈا اور طرسونہ کے شہر بھی اسی سے
سیراب ہوتے ہیں۔ اس سے جو شاخ ذاری شلون پر نکلتی ہے، قلعہ ایوب اور مدینہ
سالم کے شہر اور شلون کی شاخ شلوفہ پر "وردقہ" نامی شہر آباد ہے۔ وادی المب نامی
شہر پر قانتیش شہر آباد ہے۔ یہ قیطولونیہ، البر، قشتالیہ اور قون کے علاقوں سے گزرتا ہے۔

8- برباطہ:۔ یہ مختصر دریا ہے جو جبل رندہ سے نکل کر فرافلگر کے جنوب میں بحر
اٹلانٹک میں گرتا ہے۔ یہ صوبہ قادس سے بھی گزرتا ہے۔

9- وادی لکہ یا وادی بکہ:۔ یہ بھی ایک چھوٹا سا مگر مضبوط دریا ہے۔ یہ بھی جبل
رند سے نکلتا ہے اور صوبہ قاوس میں بہتا ہوا بحر اٹلانٹک میں گرتا ہے۔

10- وادی الکبیر:۔ اس دریا کو نہر قرطبہ، نہر اشبیلیہ اور نہر اعظم بھی کہتے ہیں۔ اس
کی اہمیت اور شہرت اور دریاؤں کی نسبت زیادہ ہے۔ یہ جنوب سے چلتا ہوا شمال کی
طرف بڑھتا ہے، مغرب کی جانب مڑتا ہے اور ابدہ اور حیان کے میدانوں میں بہتا
ہوا بانہ شہر کے کچھ شمال کی طرف پہنچتا ہے۔ آخر کار وادی الکبیر اپنی پہنائیاں اور
وسعتیں بحر اٹلانٹک میں غرق کر دیتا ہے۔ اس دریا کے کنارے زرخیزی اور سرسبزی کی
وجہ سے متعدد شہر آباد ہیں۔ ابدا اور بیاسہ کے شہر گو دریا سے تھوڑے فاصلے پر
ہیں، مگر اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سب سے عظیم الشان اور پُرشکوہ شہر
قرطبہ آتا ہے جس کی یادگار کے نقوش نہ مٹ سکیں گے۔

11- وادی آنہ:۔ اس کا پرانا نام اناس تھا۔ عرب آئے تو اس کو آنہ ہی پکارا۔ اس کا
منبع بھی وہی ہے جو دریائے شقر کا ہے۔ یہ با اعتبار اہمیت اپنا جواب نہیں رکھتا۔

12- دریائے تاجہ:۔ یہ دریا 565 میل لمبا ہے۔ پہلے یہ شمال مغرب کی طرف، پھر
مغرب ہی کا رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہے کہ اس میں چھوٹے جہاز
بھی چل سکتے ہیں۔

یہ ملک اپنی قدرتی عطیات اور حسن و دلفریبی کی وجہ سے مختلف اقوام کی نظروں کا
مرکز رہا ہے۔ لیکن ایک قوم نے اسے لوٹا تو کبھی دوسری قوم نے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں

کے قدم یہاں پہنچے جنھوں نے آٹھ صدیوں تک یہاں حکومت کی۔ پھر عیسائیوں نے اپنے اُکھڑے قدم جمائے جو ہنوز جمے ہوئے ہیں۔

کہنے کو یہاں آئیریا، کلٹ، فینیقی، یونانی، شیوانی، الانی وغیرہ قوموں نے اپنے قدم جمائے مگر اسپین کی عظمت اور رفعت بڑھانے کی جو کوشش عربوں نے کی، اُس کی ترقی اور تمدن کے نشانات آج بھی وہاں ملتے ہیں۔ فینیقیوں نے نبی کریمؐ کی پیدائش سے بہت پہلے شام سے آ کر اسپین سے رشتہ جوڑا اور اپنی نئی بستیاں قائم کیں۔ ویزی گوتھ کا آخری بادشاہ غطشہ تھا جس کو اُس کی باغی فوج کے سردار لرزیق (راڈرک) نے شکست دی اور پھر قتل کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر 71ء میں مسلمانوں نے اسپین میں نقل و حرکت شروع کی۔



اسپین اور ماسوائے اسپین، تنگ نظری، تعصب، جہالت وغیرہ پھیلی ہوئی تھی۔ دولت کی زیادتی اور عطیاتِ الٰہی نے ان میں عشرت پسندی اور پست مذاقی کی صفات پیدا کیں۔ گوتھوں نے دو سو سال تک حکومت کرنے کے باوجود رومنوں کی خرابیوں اور گمراہیوں کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بدکاریوں کی ترویج ہوئی۔ اچھائیوں کا منہ کالا کیا گیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ گوتھ بہادر اور جری تھے لیکن اُن کی دلیری، اُس کی جراُتیں، اخلاق اور معاشرے کی کمزوریوں کی بیخ کنی کرنے کی بجائے ان میں اضافہ ہی کرتی رہیں۔ انہوں نے مذہب عیسوی تو اختیار کر لیا مگر مذہبی پابندیوں پر عمل کرنے میں اُن سے ہمیشہ کوتاہی ہوتی رہی۔ اُنہی پر کیا موقوف خود عیسائی پادری اور ہدایت کے علمبردار بھی برائیوں کا زبردست مجموعہ تھے۔

عیسائی پادریوں کی عبادت گاہیں حرم سراؤں سے بڑھ کر تھیں۔ اُن کے خزینے دولت سے بھرے ہوئے مگر اخلاق سے خالی تھے۔ تنگ نظری اُن کا طرۂ امتیاز تھا۔ ظلم وتشدد اُن کا شیوہ۔ علم کی روشنی اُن کی عبادت گاہوں میں پہنچ ہی نہ پاتی تھی۔ یہودی علم وادب کا ذوق ضرور رکھتے تھے مگر راندۂ درگاہ رہتے تھے۔ اُن کی عورتوں کی عزتیں محفوظ نہ تھیں اور نہ اُن کی بیٹیوں کی ناموس۔ اُن کی زبان پر حکم زباں بندی تھا۔ اُن کے اعصاب پر پہرہ، اُن کے خود ساختہ خداؤں کے ایک اشارے پر یہودیوں کی بیویاں، بیٹیاں اور بہنیں یا تو گرجاؤں کی نذر کر دی جاتی تھیں یا کسی کی بھی کنیزیت میں دی جا سکتی تھیں۔ اُن کو اور اُن کی بیٹیوں کو کسی وقت بھی غلام بنایا جا سکتا تھا، اُن کی دولت کو غصب کیا جا سکتا تھا اور رعایا کی تجارت، صنعت وحرفت اور زراعت کو کسی وقت بھی تہس نہس کیا جا سکتا تھا۔

پست طبقے کے لوگ جنہیں عوام کہہ کر پکارا جاتا ہے، حقیقت میں غلام تھے مگر

غلاموں سے بھی بدتر۔ وہ اپنے آقاؤں کے اشارے پر اپنی گردنیں کٹوانے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اُنہیں اپنی جانیں دینے سے بھی دریغ ممکن نہ تھا۔ طاقت اور طاقتوروں نے اُن کی انسانیت اور اُن کی قوت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ ان تمام امور کو انجام دینے پر مجبور تھے جو غلام، ملازم، مہتر، چمار اور چنڈال کیا کرتے ہیں۔ پھر بھی اس کا معاوضہ صرف دشنام طرازی تھا یا بدگوئی اور بد کلامی، کوڑوں کی مار، سرزنش معمولی باتیں تھیں۔ معاشرے میں نہ اُن کی کوئی حیثیت تھی اور نہ کبھی کسی حیثیت کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ کمتر لوگوں سے اخلاق کے ساتھ پیش آنا ایک گناہ سمجھا جاتا تھا۔

درمیانی طبقہ ہر عہد، ہر ملک و ملت میں ایک خاص حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اُن میں دانشمند، ان میں اہلکار، ان میں صلاح کار ہوتے ہیں۔ مگر اسپین کا طریقہ ان کے معاملات میں بھی جداگانہ تھا۔ یہ طبقہ بھی وہاں مصائب کا شکار تھا۔ وہ ٹیکس ادا کرتا تھا، حکومت کے کارندے کی حیثیت سے کام کرتا تھا، زراعت کے کاموں کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ وہ صنعت و حرفت کا نگران تھا، سپاہی وہ تھا، مزدور وہ تھا، ملازم وہ تھا، محکوم وہ۔ باقی سب مالک اور حاکم تھے جن کے ایک اشارے پر دولت کے ڈھیر لگا دینا اُن کا کام، عیش و عشرت بہم پہنچانا اُن کی ذمہ داری۔ خزانوں پر اُن کی بھرپور ڈیوٹی ہوتی تھی۔ ملک کی نگہبانی اُن کا فرض تھا اور جنگوں میں شرکت اور جان کی بازی لگانا اُن کی اطاعت کی دلیل تھی۔

پادری آلہ تھے حکومت کے اور حکومت سہارا تھی مذہبی پیشواؤں کا۔ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار، ایک دوسرے سے زیادہ ظالم، ایک دوسرے سے زیادہ شدت پسند۔ جب یہ عالم ہو تو کسی اخلاق سدھارنے والے کی وہاں کیا ضرورت اور اہمیت ہو سکتی تھی؟ وٹیزا قوم گاتھ کا آخری تاجدار یہودیوں کا بہی خواہ تھا اور یہی خامی اُس کے زوال کا باعث اور اُس کی موت کی وجہ بنی۔

مذہب اور پیشواؤں کے احکام کی خلاف ورزی اس عہد کا سب سے بڑا گناہ تھا جو ناقابل معافی سمجھا جاتا تھا۔ وٹیزا اس کی سزا کیوں نہ بھگتتا۔ پوپ کا حکم مذہب کے ماننے والوں کے لئے فریضہ الٰہی ہوتا۔ اور پھر اس میں تو خود غرضوں، خود پرستوں کا فائدہ تھا۔ بغاوت ہوئی خود فوج کی جانب سے اور لرزیق کی سرکردگی میں۔ اُس نے

شاہی فوج کو شکست دی۔ اُس نے وٹیزا کو واجب القتل کہلوا کر تخت پر خود قبضہ کر لیا۔

اب ہم اُس دور اور عہد کے اُس رواج کا تذکرہ کر رہے ہیں جس کا سبب یہ ناول اور اس کا ہیرو موسیٰ بن نصیر ہے۔ اگر ملک اُندلس (ہسپانیہ) میں یہ رواج نہ ہوتا تو اُندلس پر مسلمان حملہ آور ہوتے اور نہ موسیٰ بن نصیر کو اس قدر شہرت اور عظمت حاصل ہوتی جو اُنہیں اُندلس پر فوج کشی اور فتح سے حاصل ہوئی۔

اُندلس (اسپین) میں اُس عہد کے رواج کے مطابق نوابین، روسا اور اُمراء اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو حرم شاہی میں آدابِ شاہی اور اصولِ تہذیب سکھانے کی غرض سے بھیجتے تھے۔ چنانچہ گورنر سبتہ نواب جولین کی بیٹی فلورا بھی اسی غرض سے حدود محل سرا میں داخل کی گئی۔ اُس کی عزت کی حفاظت والی اُندلس شاہ راڈرک پر اسی قدر واجب تھی جتنی کہ اپنی لڑکی کی۔ مگر وہ اُس کے حسن بے پناہ کا والہ و شیدا اور اُس کے حسن کی سحر طرازیوں سے اس حد تک مسحور ہوا کہ اُس کی لاج کی بھی لاج نہ رکھی اور اُسے اپنے ملازموں کے ذریعے اپنے شبستان میں پکڑ بلوایا، پھر اُس ذلیل اور کمینہ خصلت شیطان نما انسان نے اُس کی ناموس کو بھی داغدار کرنے سے گریز نہ کیا۔

وہ نیک طینت اور معصوم بچی شاہ راڈرک کے بوالہوسی کے ہتھکنڈوں سے بھلا کب واقف تھی؟ وہ معصوم مکر و فریب کی چالوں سے کہاں آگاہ تھی؟ یہ ناگہانی پڑی تو اب رونا دھونا کام رہ گیا اور غم کرنا شعار بن گیا۔ تھی مگر سمجھدار۔ باپ کو اپنی پوری روداد اپنے ایک معتمد کے ذریعہ لکھ بھیجی اور ہرکارے یا معتمد کو تاکید کی کہ جلد از جلد حضور نواب جولین کے پہنچے۔ فلورا نے اُسے راز کو راز رکھنے کی بھی تاکید کی۔

نیک دل اور وفادار معتمد بھاگم بھاگ جولین کے حضور پہنچا اور اُس کے حوالے وہ تحریر کی جس میں اس واقعہ کی تفصیل درج کی گئی تھی۔ نواب جولین کو سن کر اور پڑھ کر اپنے کانوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بھی حقیقت پر اعتبار کرنا پڑا۔ بردباری اور نزاکت کا تقاضہ تھا کہ جلد بازی یا تیزی سے کام نہ لیا جائے بلکہ شاہ اُندلس راڈرک کی طاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچ سمجھ کر قدم اُٹھایا جائے۔

پس جب نواب جولین دربارِ اُندلس میں شاہ راڈرک کے حضور پہنچا تو اُس نے اپنے کسی فعل سے، کسی حرکت سے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسے اس سنگین حادثہ کا

علم ہو چکا ہے کہ جس نے اُس کی رگوں میں خون کی بجائے آگ کے شعلے بھر دیئے
ہیں۔ جس نے اُس کے دل و دماغ میں ایک کھولن مچا رکھی ہے اور جس نے اُس کے
جسم و رُوح میں انتقام کا شدید جذبہ پیدا کر رکھا ہے۔

چنانچہ نواب جولین تمام وقت شاہ راڈرک سے کمال لطف سے گفتگو کرتا رہا۔
باتوں ہی باتوں میں فلورا کی ماں کی شدید بیماری اور اُس کی تیمارداری کے لئے فلورا
کی ماں کے پاس موجودگی کے لئے التماس کیا، بلکہ بڑی لجاجت سے بادشاہ سے
دست بستہ درخواست کی کہ فلورا کو اُس کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔ ظاہر
ہے کہ ماں بستر مرگ پر ہو اور بیٹی سے ملنے کی خواہش نہ کرے، یہ ناممکن تھا۔ اس
لئے نواب جولین کا بہانہ قرین قیاس سمجھا گیا اور فلورا کو باپ کے ساتھ جانے کی
اجازت دے دی گئی۔

چلتے وقت شاہ راڈرک نے نواب جولین سے اس بات کی خواہش کی۔

"شکار کے شوق کی تکمیل کے لئے کچھ اچھے باز اُس کے حضور بھجوائے جائیں۔"

اور نواب جولین نے نہایت ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

"شاہ معظم مطمئن رہیں۔ اس دفعہ ایسے باز شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کروں گا
جیسے باز حضور نے اس سے پیشتر کبھی زندگی میں نہ دیکھے ہوں گے۔"

خیال رہے کہ قلعہ سبتہ جس کا قلعہ دار نواب جولین تھا، اگرچہ بازنطینی کی حکومت
کے ماتحت تھا مگر اس کے زوال کے بعد اس نے اسپین ہی کی حکومت سے رشتہ جوڑ لیا
تھا اور اُسی کا باجگزار ہو گیا تھا۔ اس قلعہ کی مضبوطی اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے
لگایا جا سکتا ہے کہ قلعہ سبتہ کو یورپ کی کنجی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ خود مسلمانوں
کے پیہم دو حملے اس کی فصیلوں کو شکستہ نہ کر سکے تھے۔ آگ کے گولے وہاں ناکارہ ہو
جاتے، منجنیق کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بیرونی حملوں کو روکنے کے لئے قلعہ
آہنی دیوار بھی تھا اور سد سکندری بھی اور اسی لئے اسپین ہمیشہ سے خود کو بیرونی
آوروں سے محفوظ سمجھتا تھا۔

مگر اب حاکم اور قلعہ دار سبتہ نواب جولین کے جذبۂ انتقام نے اُن آہنی
دیواروں کو موم بنا دیا۔ سد سکندری کو مٹی کا تودہ کر دیا۔ پس نواب جولین بے خوف و

خطر اور بڑے دھڑلے کے ساتھ سیدھا مرکز افریقہ قیرواں میں مسلم سردار موسیٰ بن
نصیر کے پاس جا پہنچا۔ نواب جولین قلعہ دار سبتہ اور مسلم سردار موسیٰ بن نصیر میں پہلے
ہی شدید اختلاف تھا۔ وہ ایک دوسرے کی طاقت سے واقف نہ تھے بلکہ دو مرتبہ پنجہ
آزمائی بھی کر چکے تھے۔ موسیٰ بن نصیر نے اس قلعہ پر دو بار فوج کشی کی اور دونوں بار
موسیٰ کو قلعہ کی شدید مدافعت کی وجہ سے ناکام لوٹنا پڑا تھا۔

موسیٰ بن نصیر کو جب اطلاع دی گئی کہ نواب جولین، مسلم سردار سے ملاقات کے
لئے آیا ہے تو وہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

موسیٰ نے ہرکارے کو جھڑک دیا۔

"واپس جا اور اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھ کہ ملاقات کے لئے کون آیا ہے؟"

"سردار بہادر ——" ہرکارے نے ادب سے جواب دیا۔ "میں سردار عالی
مقام کا غلام ہوں۔ میں نے جو عرض کیا وہ سچ ہے۔ میں آپ کے حضور جھوٹ بولنے
کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

موسیٰ بن نصیر کو ہرکارے کے اس پُر اعتماد جواب پر اور زیادہ تعجب ہوا۔ مگر اب وہ
نرم پڑ گیا تھا اس لئے اُس نے نرمی سے دریافت کیا۔

"آنے والے نے اپنا کیا نام بتایا ہے؟"

"سرکار ——" ہرکارہ اور زیادہ اعتماد سے بولا۔ "حضور! میں نے نواب جولین
کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا مگر میں نے اس قلعہ دار کا نام کئی بار سنا ہے اور اس کی
بہادری کے قصے بھی سنے ہیں۔ جب اس نے اپنا نام بتایا تو اُس کا چہرہ بہت رُعب
دار ہو گیا تھا۔ مگر اُس نے نرمی سے کہا۔ جاؤ اور مسلم سردار سے عرض کرو کہ سبتہ کا
قلعہ دار ان سے فوراً ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

"مجھے یقین ہو گیا۔" یہ کہتے ہوئے موسیٰ ن نصیر تلوار ٹیک کر کھڑے ہوتے ہوئے
بولے۔ "مجھے تجربہ ہے کہ نواب جولین جھوٹ نہیں بولتے۔ ہم ان سے دو بار پنجہ ملا
چکے ہیں مگر اُنہیں نیچا نہ دکھا سکے۔"

یہ کہہ کر موسیٰ بن نصیر باہر کی طرف چلے۔ اُن کے پیچھے اُن کا نائب اور پیغام
لانے والا ہرکارہ تھا۔ پھر جب موسیٰ بن نصیر ایک طویل راہداری لے کر کے اپنے

ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط جسم کے تنومند اور دراز قامت ادھیڑ عمر کے انسان کو کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ موسیٰ نے جولین کو کبھی دیکھا نہ تھا صرف اُس کا نام سنا تھا۔ اُس نے نواب کے بارے میں یہی سنا تھا کہ نواب جولین ایک دراز قامت اور بڑی بڑی روشن آنکھوں والا انسان ہے۔ پس موسیٰ بن نصیر نے اُسے اندازے سے شناخت کر لیا۔

موسیٰ بن نصیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا میں ——"

"میں ڈیوک جولین ہوں ——" دوسری طرف سے نواب جولین نے موسیٰ کی بات پوری کر دی۔

پھر دونوں ہاتھ کھول کر ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور نہایت گرم جوشی سے ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے جیسے ایک زمانہ کے بعد ملے ہوں۔ حالانکہ یہ اُن کی پہلی ملاقات تھی۔

پھر جب دونوں الگ ہوئے تو موسیٰ بن نصیر نے محسوس کیا کہ ان کا ایک کاندھا نواب جولین کے آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے۔

موسیٰ بن نصیر نے گھبرا کر پوچھا۔

"کاؤنٹ نواب جولین......! یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟ میری بھابھی تو ٹھیک ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ——" اور نواب جولین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی موسیٰ بن نصیر اُسے جتنی تسلی دیتے، نواب اُسی قدر آنسو بہاتا۔ اور آخر اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ موسیٰ بن نصیر اُسے سہارا دے کر ڈرائنگ روم کے اندر لے آئے اور نواب ایسے صوفے پر بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔

موسیٰ بن نصیر نے نواب جولین کی توقیر بھی کی اور عزت بھی۔ پھر جب نواب نے اپنے آنے کا مقصد رو رو کے بیان کیا تو موسیٰ بن نصیر نہ صرف اُس کے غم میں پورا پورا شریک ہوا بلکہ اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ شاہ راڈرک سے نواب کی بیٹی کی بے عزتی اور بے حرمتی کا پورا پورا انتقام لے گا۔ بلکہ اُندلس کی حکومت اُس کے ہاتھ سے چھین

لے گا۔ نواب جولین کو موسیٰ بن نصیر کی تسلی اور تشفی سے بہت سہارا ملا اور اُس کے غم میں ایک گونہ کمی ہو گئی۔

موسیٰ بن نصیر کو جب یہ یقین ہو گیا کہ نواب جولین، اُندلس پر حملے کے لئے موسیٰ سے فوجی مدد چاہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ وقت وقت کی بات ہے۔ ایک وقت وہ تھا موسیٰ بن نصیر نے قلعہ سبتہ پر دو بار حملے کئے اور دونوں مرتبہ اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اب یہ وقت ہے کہ نواب جولین خود موسیٰ بن نصیر کی اُندلس کے خلاف مدد حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے دل ہی دل میں نہ جانے کتنے منصوبے بنا ڈالے اور اُندلس پر یلغار کے کتنے خاکے تیار کر لئے۔

نواب جولین نے ایک تقریر اسپین کے متعلق کی جس میں وہاں کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا ذکر کیا، ہرے بھرے سبزہ زاروں، شاداب اور حسین وادیوں کا، زر و جواہر اور دولت و حشمت کا، یہ سب کچھ ایسے افسانوی انداز میں بیان کیا کہ موسیٰ بن نصیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر وہ مرد جہاندیدہ تھا۔ با تدبیر اور با شعور تھا، باہمی رنجش، عداوت اور مذہبی عناد اکثر یہ فتنے اُٹھایا کرتی ہے لیکن غربا پر ظلم اور تشدد کی داستانیں اُس بوڑھے مگر دلیر سپاہی کے عزموں کو جوانی بخشنے کے لئے کافی تھیں۔ پھر اُس نے حملہ کے ہر پہلو پر غور کرنا صرف مناسب ہی نہیں سمجھا بلکہ اُس کو ضروری جانا اور چنانچہ اُس نے خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک کو حالات سے آگاہ کیا اور مشورہ بھی طلب کیا۔ نواب جولین سے کوئی وعدہ کرنے کی بجائے تھوڑی مدت مانگی گئی کہ سوچ کے بعد ہاں یا ناں کی جائے گی۔

نواب جولین کی ہر بات صحیح تسلیم کرنے کے باوجود اُس کی ایمانداری کا امتحان لینا ضروری تھا۔ دربارِ خلافت سے بھی منظوری کے ساتھ ساتھ محتاط رہنے کی ہدایت آئی تھی۔ کسی بڑی مہم کے لئے منع کیا گیا، البتہ آزمائشی حملے کی اجازت مل گئی۔ نواب جولین سے کہا گیا کہ پہلے وہ راڈرک کی فوجوں پر حملہ کرے کہ اُس کی ایمانداری کا یقین آ جائے۔ جولین نے اسے بخوشی منظور کیا اور تھوڑی سی فوج کے ساتھ مدینہ سودینہ کے علاقوں کو لوٹا اور تاراج کیا۔ کلیساؤں کو نذرِ آتش کیا اور گرجاؤں کو زیرِ خاک۔ اس طرح اُس نے اپنے ہی آقا سے دشمنی مول لے لی۔ جب یہ سب ہو گیا تو معاہدہ ہوا۔

جو معاہدہ ہوا اس میں سابق شہنشاہ اسپین کے بھائی اوپاس کو شامل کیا گیا اور
کو بھی کچھ علاقے دینے کا وعدہ ہوا۔ مگر مزید احتیاط کے لئے پہلے ایک معمولی
چارسو سپاہیوں اور ایک سو سواروں پر مشتمل طریف نامی جنرل کی سرکردگی میں روا
گیا۔ یہ دستہ جولائی 710ء یعنی 92 ہجری میں الخضرا کے مقام پر اُترا۔ معمولی جھڑ
میں مسلمانوں اور نواب جولین کی مددگار فوجیں کامیاب و کامران رہیں۔ گو اُن
فتوحات کا مقصد حل نہ ہوا، مگر عیسائیوں کی کمزوری، فوجوں کی بزدلی اور نظام عسکری
خامیوں کا پتہ چل گیا۔ اور اب ایک بڑی مہم کی تیاریاں اعلیٰ پیمانے پر شروع ہو گئیں
اس مہم کی سرداری ایک جوان سپہ سالار کے سپرد کی گئی جس کا نام طارق بن زیاد
وہ موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام تھے۔

طارق بن زیاد کی اُندلس میں آمد دراصل اس ملک میں اسلامی حکومت کی ا
تھی۔ جب طارق کو فتح نصیب ہوئی تو اُس نے اس کی اطلاع اپنے آقا موسیٰ بن
کو دی اور خود وہ مزید فتوحات حاصل کرنے میں منہمک ہو گیا۔ اُس نے اُندلس
جنوبی صوبہ اندلسیہ کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ اس کے بعد طارق بن زیاد قر
کی جانب بڑھا۔

قرطبہ نہایت عظیم چھاؤنی تھی۔ اس کا قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ آسانی سے فتح نہ
سکتا تھا۔ لیکن طارق بن زیاد نے نہایت جوانمردی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا محا
کر لیا۔ عیسائیوں نے قلعہ کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ محاصرہ طول
گیا تو طارق نے وہاں اپنے نائب کو چھوڑا اور خود طلیطلہ کی جانب روانہ ہو گیا
اُسے بغیر کسی دُشواری کے فتح کر لیا۔

اسی اثناء میں طارق بن زیاد کے نائب نے قرطبہ کو فتح کر لیا۔ طارق نے
فوج کے ساتھ شمالی علاقوں کی طرف پیش قدمی کی اور کئی علاقوں کو آناً فاناً اپنے
میں کر لیا۔ اب اُندلس کے صرف چند مشرقی اور مغربی علاقے فتح ہونے سے باقی
گئے تھے۔ طارق ان علاقوں کو فتح کرنے کا ابھی ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اُس کا آقا
بن نصیر سرزمین اُندلس میں فوج لے کر وارد ہوئے۔ نواب جولین نے جسے طارق
زیاد نے اندلسیہ کا حکمران مقرر کیا تھا، موسیٰ کا استقبال کیا۔

موسیٰ بن نصیر نے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ طارق نے اُسے اطلاع
بغیر مزید پیش قدمی کیوں کی؟ لیکن جب نواب جولین نے اس امر کا یقین دلایا
کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اُس کی پچھلی فتوحات پر بھی پانی پھر جاتا تو پھر موسیٰ بن نصیر کی
خفگی دُور ہو گئی۔

یہاں سے وہ مغربی علاقے کی طرف بڑھا اور تمام علاقے کو فتح کرتا ہوا طلیطلہ
داخل ہو گیا اور طارق سے ملاقات کی۔ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اُس کا بیٹا
عبدالعزیز بھی اُندلس آیا تھا۔ عبدالعزیز نے بھی فتوحاتِ اُندلس میں طارق بن زیاد اور
موسیٰ بن نصیر کا ہاتھ بٹایا۔ اُنہوں نے جنوب مشرقی علاقے کے کئی شہر فتح کئے۔ اس
کے بعد طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر مشترکہ طور پر جبل البرتات ہوتے ہوئے جنوبی
ن کے علاقے میں داخل ہوئے اور کئی مقامات کو فتح کر کے اسلامی سلطنت کی
حدود میں اضافہ کیا۔

ان دونوں سپہ سالاروں یعنی طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کا ارادہ تھا کہ فتوحات
کا سلسلہ جاری رکھیں اور یورپ کے مزید علاقوں کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں
شامل کریں لیکن ابھی وہ اس ارادہ پر عمل کرنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ خلیفہ وقت
بن عبدالملک کا پیغام اُنہیں موصول ہوا جس کے ذریعے چند سیاسی مصلحتوں کی
بنا پر اُنہیں دمشق طلب کر لیا گیا۔ خلیفہ کی طلبی پر دونوں سپہ سالاروں کو مجبوراً دمشق
جانا پڑا اور فتوحات کا سلسلہ روک دیا گیا۔

چلتے وقت موسیٰ نے اُندلس کی تمام مفتوحہ حکومت اپنے بیٹے عبدالعزیز کے سپرد کر
دی۔ اس طرح اُندلس میں دورِ امارت کی ابتدا ہوئی۔

جہاندیدہ اور ذہین موسیٰ بن نصیر نے اپنی روانگی سے چوبیس گھنٹے پہلے ایک تفصیلی
اپنے دوست کے نام لکھا جو اُس وقت (دمشق میں) دربارِ خلافت میں ایک معزز
عہدے پر فائز تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اپنے اس خط میں پہلے تو اپنے کچھ مشہور
موں کی تفصیل سے اُسے آگاہ کیا پھر اس کے بعد اپنے خط میں تفصیل کے ساتھ
تمام قیمتی اور نادر اشیاء کا ذکر کیا جو دربارِ خلافت میں پیش کرنے کے لئے اپنے
ساتھ لے جا رہا تھا۔ اپنے خط میں موسیٰ بن نصیر نے ان تمام قیمتی اشیاء کا ذکر ہی نہیں

کیا بلکہ اُن کی اہمیت بھی بیان کر دی تا کہ جس وقت وہ چیزیں خلیفہ ولید بن عبد
کے حضور پیش کی جائیں تو موسیٰ بن نصیر پر لگائے گئے الزامات کی شدت میں
واقع ہو جائے۔

موسیٰ بن نصیر کو معلوم ہو گیا تھا کہ اُس کے دشمنوں نے دربارِ خلافت میں اُس
بارے میں بہت زہر اُگلا ہے اور اس پر نافرمانی کے علاوہ بد دیانتی کے الزامات
لگائے ہیں۔ پس موسیٰ بن نصیر چاہتا تھا اُس کے دربار میں پیش ہونے سے پہلے
کا دل پوری طرح نہ سہی کچھ تو صاف ہو جائے اور وہ کسی غیر معمولی سزا سے محفوظ
جائے۔ موسیٰ نے اس خط کی روانگی کے بعد خود کو کچھ ہلکا محسوس کرنا شروع کر دیا۔
مگر اُدھر دربارِ خلافت دمشق میں اُن کی واپسی کے بارے میں ایک زوردار بحث
آغاز ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ عبدالملک کے دو بیٹے تھے۔ بڑے
بیٹے کا نام ولید بن عبدالملک اور چھوٹے کا نام سلیمان بن عبدالملک تھا۔ بڑے ہونے
کے سبب ولید بن عبدالملک ولی عہد سلطنت تھا۔ شاہی زمانے میں بادشاہ کے ایک
سے زیادہ اولاد ہونے کی صورت میں درباری مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔
کچھ امیر، ولی عہد کے ساتھ اور کچھ دوسرے شہزادوں کی خوشامد میں لگے رہتے تھے۔
ہوتا تو یہ تھا کہ دربارِ خلافت میں عام طور پر ایسے امیر چھکتے تھے جو خلیفہ ولید کے
زلّہ بردار تھے اور اُن کی ہر بات اور حکم کو خدائی حکم کا درجہ دیتے تھے۔ اور ہر غلط
بات میں خلیفہ ولید کی تابعداری اور ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

چنانچہ اس وقت بھی موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی واپسی پر تبصرہ نہیں بلکہ
گرم بحث ہو رہی تھی۔ ولید کے ایک طرفدار امیر نے اعلان کیا۔

"موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے خلیفہ محترم کے حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے
اُندلس کی تمام زمین کو روند کے رکھ دیا ہے۔ انہیں اس حکم عدولی کی سخت
چاہیئے۔"

خلیفہ کے ایک مخالف امیر جو ولید کے بجائے شہزادہ سلیمان کو آئندہ کا
(خلیفہ) بنانے کا خواہشمند تھا، اُس نے تڑپ کر جواب دیا۔

"ہمارے دونوں امیر اور سپہ سالاران لشکر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد

زمین میں اسلام کے پرچم کو سربلند کیا ہے۔ اُنہیں تو اس کے صلہ میں بڑے سے بڑا
انعام ملنا چاہیئے۔ جو لوگ ان سالاروں پر حکم عدولی کا الزام لگاتے ہیں وہ نہ تو تاریخ
اور نہ اس کے اصولوں سے واقف ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب لشکر کسی غیر
ملک پر حملہ آور ہو تو اس کے قدم اُس وقت تک نہیں رُکنے چاہئیں جب تک دشمن ملک
کی طاقت بالکل ختم نہ ہو جائے۔ اگر ہمارے سردار اپنے قدم روک لیتے تو ان کے فتح
کئے ہوئے ممالک دوبارہ آزاد ہو کر ہمارے لشکر کے سامنے آ جاتے اور سب کچھ کیا
دھرا اور فتح کیا ہوا علاقہ ہمیشہ کے لئے ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا۔"

خلیفہ ولید کا طرفدار امیر بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اُندلس میں کچھ فتوحات
حاصل کی ہیں مگر ان جنگوں میں مسلمانوں کی کتنی جانوں کا نقصان ہوا ہے اس بات پر
کوئی غور نہیں کرتا۔ اگر یہ جنگیں اسی طرح جاری رہیں تو وہ تمام فوجیں جو اُندلس پہنچ
چکی ہیں، آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گی اور پھر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد خالی ہاتھ
وہاں سے واپس آ جائیں گے۔"

"مگر فتوحات حاصل کرنے میں جانوں کا نقصان تو برداشت کرنا پڑتا ہے۔" ایک
امیر نے ایک عقلمندی کی اور حقیقت کی بات کی۔

"واہ ـــــ یہ کیا بات ہوئی۔" دوسرے نے اُس کی بات کاٹی۔ "جانوں کا
نقصان کر کے ملکوں پر قبضہ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ جب ہمارے آدمی اور فوج ہی ختم
ہو جائے گی تو ہم حکومت کس کے زور پر کریں گے؟"

اُسی وقت ایک امیر نے کھڑے ہو کر خلیفہ سے کہا۔

"عالی مقام خلیفہ محترم! مجھے ابھی ابھی اپنے ایک دوست کا خط موصول ہوا ہے جو
موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے اس رخصتی جلوس میں شامل تھا جس کے ساتھ
دونوں سردارانِ اسلام اس وقت دمشق کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ اس خط میں اُس
سامان اور نادر اشیاء کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو یہ سردارانِ لشکر اپنے ساتھ خلیفہ کی
خدمت میں پیش کرنے کے لئے لا رہے ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں اس کی پوری فہرست
اور تفصیل حضور عالی میں پیش کروں؟"

خلیفہ نے قدرے گردن بلند کر کے ارشاد فرمایا۔

''صرف اہم چیزوں کی فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔''

امیر نے سرِ تسلیم خم کر کے خط پڑھنا شروع کیا۔

میرا دوست لکھتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے اشبیلیہ کو مستقر قرار دے کر ہر طرف یہ ہدایات جاری کر دیں کہ جن جن راستوں سے اسلامی لشکر گزرے وہاں کے حاکم مع اپنی فوج کے لشکر اسلام کو سلامی دیں اور فوج کا کچھ حصہ ساتھ بھی بھیجیں تاکہ لشکر اسلام کی شان و شوکت اور عظمت کا مظاہرہ ہو۔ قوم گوتھ کے سرداران اور مارٹیا کے عظیم المرتبت حکام اس مردِ جری کے جلوس میں محافظین، خراج گزار اور خدام کی حیثیت سے ہمرکاب تھے۔ بے اندازہ اور بے شمار، اموال اور خزائن، قطار در قطار اونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ اس سامان میں کیا کچھ شامل نہ تھا، زرّہ بکتر بھی تھے، تلواریں بھی، ہتھیار بھی اور زینت کی اشیاء بھی تھیں، زیورات بھی، زرق برق لبادے بھی، خوبصورت لباس بھی، وہ اُونٹ جن پر سامان لدا ہوا تھا ایسے سجائے گئے ہیں جیسے وہ بھی مالِ غنیمت کا حصہ ہیں۔ پھر تیس سے زیادہ گاڑیوں پر بیش قیمت جواہرات، نادرو نایاب پتھر، سونا چاندی، زرنگار کپڑے، تکلفات کے جملہ سامان، ان میں سے ہر چیز بے انتہا قیمتی تھی۔ جسمانی آرائش و زیبائش اور تفاخر کی صدہا اشیاء کہ جو نہ عربوں کی نظروں سے کبھی گزریں نہ آئندہ گزرنے کا امکان ہے۔ ان کے علاوہ تیس ہزار سے زیادہ (اور بقول اسکاٹ) لاکھوں کی تعداد میں ملازم اور کنیزیں تھیں جو نازک اندام بھی تھیں اور خوش جمال بھی۔ یہ کہنے کو کنیزیں تھیں مگر اصل میں تھیں شہزادیاں، نواب زادیاں، امراء کی صاحبزادیاں۔ ان کی رگوں میں شاہی خون گردش کر رہا تھا۔ اُن کے چہروں پر شرافت اور نجابت کے آثار اس حد تک نمایاں تھے کہ تابناکی اور تابندگی پیدا ہو گئی تھی۔ معمولی آنکھ اُن کے حسن و جمال کا مشاہدہ بھی نہ کر سکتی تھی۔ مگر اس وقت غلامی کا جوا کاندھے پر رکھے، سنہری زنجیریں گلے میں پڑی ہوئی اپنے حسن اور اپنے بلند مرتبے دونوں کا ماتم کر رہی تھیں۔ یہ سب وہ تھیں جن کا حسن اسپین بھر میں انتخابی تھا۔ حسن اور شباب مثالی تھا۔ چار سو وہ افراد تھے جو خاندانِ گاتھ کے چشم و چراغ تھے۔ جن کی رگوں میں صدیوں سے شاہی خون رواں داں تھا، جن کی پشت در

صرف حکومت کرنے کی عادی رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے چوغے پہنے ہوئے تھے اور اُن کے گلوں میں سنہرے گلوبند تھے جو حقیقت میں طوقِ غلامی کے ذرا مہذب بدل تھے۔ اور ان کے علاوہ قربان گاہوں کے مرصع بجواہر برتن، عود و عنبر اور سینکڑوں ایسی چیزیں تھیں جو بازنطینی اور گوتھک قوم کی نادر اور لاجواب نمونہ تھیں۔ ان چیزوں کی جگمگاہٹ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی تھیں۔

اُن کے پیچھے معزز عرب تھے۔ اعیان قریش تھے، عمائدین افریقہ تھے اور پھر اُن سب کے پیچھے نامور افسرانِ فوج جو موسیٰ بن نصیر کے اردگرد ہالہ کی مانند چل رہے تھے اور ان سب کے پیچھے تقریباً ایک لاکھ معمولی حیثیت کے انسان جو غلام بنائے گئے تھے، سروں پر سامان اور بوجھ لادے جلوس کی عظمت میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔

96 ہجری تھی کہ موسیٰ بن نصیر قیرواں سے اس تزک و احتشام سے دمشق کے لئے روانہ ہوئے۔

موسیٰ بن نصیر بعد میں کسی جگہ پہنچتے اُن کی آمد کی خبر، اُن کے جلوس کی عظمت کے افسانے ہر جگہ پہلے پہنچ جاتے۔ خانہ بدوش، باشندگانِ شہر، صحرانشین اور اہلیانِ ساحل سب بے انتہا اشتیاق سے جمع ہو کر اس پُرشکوہ جلوس کا مشاہدہ کرنے نکل آتے۔ کبھی اُنہیں اپنی قوتِ بصارت پر دھوکہ ہوتا، کبھی اپنے شعور پر۔ آنکھوں سے دیکھتے اور دل میں عش عش کرتے تھے اور زبان سے تحسین اور آفریں کے نعرے بلند کرتے تھے۔ جہاں جہاں سے یہ جلوس گزرتا تھا، آدمی بھی شامل ہوتے تھے۔ پھر جب جلوس حدودِ قاہرہ میں داخل ہوا تو آدمیوں کا ایک انبوہِ کثیر تھا۔ انسانوں کا ایک ایسا مجمع تھا کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ چہار جانب سر ہی سر تھے۔ ایک کونے سے تھالی پھینکتے تو سر ہی سر سے ہوتی ہوئی میلوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی دوسرے کونے پہنچ جاتی۔ ساحل نیل پر تو اتنے آدمی جمع ہو گئے کہ راستہ ہی بند ہو کر رہ گیا۔

یہ شان و شوکت جہاں دوسروں کو مرعوب کئے دے رہی تھی، وہ خود موسیٰ بن نصیر میں غرور اور تکبر کے جذبات پیدا کرنے کا باعث بھی بنی جا رہی تھی۔ وہ بے جا خوشامد، جھوٹی چاپلوسی سے اس قدر خوش اور نازاں نظر آ رہے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ اور اس خوشامد کا نتیجہ تھا کہ موسیٰ بن نصیر آپے میں نہ رہے اور بے حد مغرور ہو گئے۔

قومِ گاتھک کا جانباز سپہ سالار، طارق کا دست راست مغیث الرومی بھی اس جلوس
کے ہمراہ تھا۔ موسیٰ نے چاہا کہ وہ بھی بحیثیت غلام خلیفہ کے سامنے پیش ہو۔ مغیث کی
خدمات دیکھتے ہوئے یہ اُس کی بڑی بے عزتی تھی۔ قرطبہ اُس کے ہاتھوں فتح ہوا تھا
اور بوہیلہ میں اُس کے سپاہیوں نے نصرت حاصل کی تھی۔ طارق بن زیاد کے ساتھ اس نے
ہر موقع پر جانبازی اور جانفشانی کا ثبوت دے چکا تھا۔ اُس کا انکار اُس کی موت کا
باعث ہوا۔ مگر فوج موسیٰ کی جانب سے اور بھی بد دل ہو گئی۔ اُن کو طارق کا سلوک
ناگوار گزرا تھا۔ مغیث کا قتل، یہ تو سونے پر سہاگہ تھا۔

جب موسیٰ بن نصیر، شام پہنچے تو ولید بن عبدالملک بستر علالت پر تھا۔ ولید کے
دوسرے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو تخت ملنے کی پوری اُمید تھی۔ اُس نے موسیٰ کے
پاس یہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ قدرے توقف کرے اور حیلہ و بہانہ کر کے کچھ دنوں بعد
دمشق میں داخل ہو تو مناسب ہو گا۔

موسیٰ بن نصیر کے دل میں اگر کوئی غداری یا بے ایمانی کا جذبہ ہوتا تو وہ اس پیغام
پر توجہ دیتے اور ویسا ہی کرتے جیسا کہ تقاضائے وقت تھا۔ مگر اُن کی یہ وفاداری، یہ
اطاعت ایک ایسے خلیفہ کے ساتھ تھی جس نے محض شبہ کی بنا پر اُن کو اُندلس سے بلا
بھیجا تھا، جس نے صرف سکھانے بھڑکانے سے اُن کے خلاف ہر الزام کو صحیح جانا
تھا، جس نے اُن کے خلاف خطبوں میں تحقیر آمیز الفاظ استعمال کروائے اور ان پر
بیزاری کا اعلان کرانے کا حکم دیا تھا۔ مگر انہوں نے پھر بھی اپنے خلوص اور نیک
شعاری کا ثبوت دیا اور سلیمان کے حضور کہلوا دیا:

''میں اپنی جانب سے غداری یا بے ایماری کا روادار نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر میرے
پہنچتے پہنچتے ولید جاں بحق ہو جائے تو سارے تحفے تحائف آپ کی خدمت میں گزار
دوں گا۔''

جواب معقول تھا۔ مگر سلیمان کے لئے باعث رنج ثابت ہوا۔

موسیٰ بن نصیر جمعہ کے دن دمشق میں داخل ہوئے۔ وہ سیدھے جامعہ مسجد پہنچے۔
وہاں ولید بن عبدالملک صحت یاب ہونے کی وجہ سے نماز جمعہ پڑھانے آئے ہوئے
تھے۔ جب نماز ہو چکی تو موسیٰ بن نصیر نے آدابِ شاہی بجالاتے ہوئے وہ تمام سامان

اور انواع و اقسام کی اشیاء اور گرانقدر تحفے خدمت عالی میں پیش کئے۔
سرداران ملک و قوم جو اپنے اپنے دیس اور تہذیب کے لحاظ سے لباس اور امتیازی
نشان اور رتبے کے نشانات لگائے ہوئے تھے، حاضر کئے گئے۔

حاضرین مسجد اُنہیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ ولید بن عبدالملک کی خوشی کی
کوئی انتہا نہ رہی۔ سلیمان بن عبدالملک جل بھن کر راکھ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس
وقت وہ میز معہ رحل کے پیش کی گئی جو تبرکاً طلیطلہ کے کلیسا میں رکھی ہوئی تھی اور مانده
کے مغرور حاکم کے ہاتھ سے طارق نے چھینی تھی۔ اُس کے تینوں پائے زمرد اور زبرجد
کے تھے۔ چوتھا پایہ محض خالص سونے کا تھا جو موسیٰ بن نصیر نے خود تیار کرایا تھا۔ موسیٰ
نے اُسے سامانِ خمس کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ یہ میز بھی انہی کو
حاصل ہوئی تھی۔

طارق بن زیاد وہاں موجود تھے۔ وہ ضبط نہ کر سکے۔ چوتھا پایہ جو اُنہوں نے
احتیاطاً الگ کر لیا تھا، سامنے کر دیا۔ پھر ساری حقیقت کہہ سنائی۔ اُس وقت موسیٰ بن
نصیر کا جذبۂ رقابت بھڑک اُٹھا مگر سچ بہرحال سچ ہے۔ وہ مصلحت وقت دیکھ کر
خاموش ہو گئے۔ اب وہ طارق کا کر ہی کیا سکتے تھے۔ ولید بن عبدالملک نے اُس کے
جواہرات علیحدہ کرا کے تختہ اور پائے مکہ شریف بھجوا دیئے۔ بعد میں موسیٰ بن نصیر کو بے
انتہا نوازشات اور اکرامات سے نوازا۔ ولید اُن سے بغلگیر ہوئے، اُن کی خدمات کا
اعتراف کیا اور خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ اور پھر موسیٰ بن نصیر کے بھی شکر گزار ہوئے
اور اپنا لباس خاص بطور مراحم خسروانہ اور پچاس ہزار دینا بطور انعام دیئے اور عزت و
تکریم سے رخصت کیا۔

مگر یہ عزت و تکریم زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ چالیس ہی روز کا عرصہ گزرا تھا کہ
ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور سلیمان بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن
ہوئے۔ اب اُن کو اپنے غصے اور رقابت کے جذبے کو تسکین دینے کا موقع ملا۔ موسیٰ
بن نصیر اُس وقت اسی سال کے ہو چکے تھے۔ اُن کے اعضاء مضمحل تھے۔ اُن کی
طاقت قریب قریب جواب دے چکی تھی۔ حرص و طمع کی اب وہاں گنجائش نہ تھی۔ وہ یادِ
الٰہی میں باقی دن گزار دینا چاہتے تھے۔ مگر سلیمان بن عبدالملک نے اُنہیں دربار میں

طلب کیا، اُن کی بزرگی، دانائی، خدمات، صلاحیت اور عزت یا کسی چیز کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اُنہیں سرِ عام رُسوا کیا۔ اُن پر خیانت کا مقدمہ قائم کیا۔ اُن سے پچھلا تمام حساب مانگا گیا۔ جبر ستانی اور ظالمانہ حرکات پر جواب طلب کیا گیا۔

مگر وہ ان سب باتوں کا کیا جواب دیتے؟ اگر اُنہوں نے کچھ مظالم کئے تھے تو حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر کئے تھے۔ ضبط و نظم اس چیز کا تقاضہ کرتا تھا۔ اگر اُنہیں بد دیانت اور خائن کہا جائے تو اس سے زیادہ بہتان اُن کی ذات پر کیا لگایا جا سکتا ہے۔ اُنہیں اس قدر مال و متاع اور اسلحہ افریقہ سے حاصل ہوا، اس قدر آدمی ان کی خدمت پر آمادہ تھے کہ وہ بلا تکلف اس سامان کو ہضم کر کے ایک آزاد سلطنت کی بنیاد ڈال سکتے تھے۔ لیکن ان میں سے اُنہوں نے کوئی بات بھی نہ کی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگر اُنہوں نے کہیں اسراف بے جا کیا بھی تو فوج کو خوش کرنے کے لئے غریب سپاہیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے۔ قلعوں اور فصیلوں کو مضبوط کرنے کے لئے شہر کو با رونق بنانے کے لئے اور صنعت و حرفت اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے اگر اُنہوں نے جاہ حشم کو روا رکھا تو اس سے مفتوحین پر مسلمانوں کی عظمت، شوکت اور دبدبے کا مظاہرہ مقصود تھا، اُن پر رُعب ڈالنا تھا نہ کہ اپنی ذات کو ممتاز کرنا۔ اُنہوں نے اپنے اوپر تو کچھ بھی خرچ نہ کیا، اپنے خاندان کے افراد کو تو ذرا سا بھی نہیں نوازا۔ مگر جب دلائل سننے کو وقت کی سب سے زبردست طاقت تیار ہی نہ ہو تو دلائل کا اثر کیونکر ہو؟ اخراجات، اصراف بے جا گردانے گئے۔ ضبطی جائیداد تو الگ جو انعامات اکرامات ولید نے بخشے تھے وہ بھی چھین لئے گئے۔

اسکاٹ کہتے ہیں کہ دو لاکھ اور بعض دوسروں کے بقول چالیس پچاس ہزار دینار تاوان عائد کیا گیا۔ اتنا روپیہ وہ کہاں سے دے سکتے تھے، کیونکر دے سکتے تھے۔ اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اُنہیں سزا کا بھی مستوجب قرار دیا گیا۔ جلتی، تپتی ریت اور چلچلاتی دُھوپ میں اُنہیں ستون سے باندھ کر کھڑا کر دیا جاتا۔ یہ تھا صلہ اُن کی خدمات کا۔ یہ تھا معاوضہ فتح اُندلس کا۔ یہ تھا خلوص نیّت کا صلہ۔ کئی گھنٹے اذیت دینے کے بعد بعض اصحاب کی سفارش پر اُنہیں چھوڑا گیا۔ مگر پھر قید خانہ میں پھینک دیا اور اسی پر بس نہیں کیا، اُن کے بیٹے عبدالعزیز جنہیں وہ اُندلس میں قائم مقام بنا آئے

تھے، جو بہت ہی متقی اور پرہیز گار تھے، زاہد شب زندہ دار، عابد دیندار تھے، صرف اس شبہ پر کہ کہیں باپ کا یہ انجام سن کر وہ علم بغاوت نہ بلند کر دیں، اُنہیں جب وہ سورۂ فاتحہ ختم کر کے سورۂ واقعہ کی تلاوت کرنے لگے تو عربوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا گیا۔ پھر اُن کا سر موسیٰ بن نصیر کے سامنے پیش کیا۔ یہ شقاوت قلبی کی بہت ذلیل مثال تھی۔ یہ ظلم و تشدد کا بڑا رکیک مظاہرہ تھا۔ زخموں نے موسیٰ کو پہلے ہی چور چور کر دیا تھا۔ پیہم دُکھوں نے اُن کو پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا، بیٹے کا سر دیکھ کر اُنہوں نے صرف ایک آہِ سرد کھینچی اور اتنا کہہ کر رہ گئے کہ......

"ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا گیا جو دن کو انصاف و عدل اور انتظامات ملکی کیا کرتا تھا اور رات کو خدا کی عبادت۔ جو قائم اللیل اور صائم النہار تھا۔"

اب اُن میں صدمے برداشت کرنے کا دم خم نہ تھا۔ اب اُن میں غم سہنے کی تاب نہ تھی۔ مگر زندگی تھی کہ ختم ہونے کو ہی نہ آئی تھی۔

97ھ میں جب سلیمان حج کرنے گیا تو موسیٰ بن نصیر بھی پابہ زنجیر اُس کے ساتھ تھے۔ جہاں وہ بدوؤں کے درمیان دن رات بھیک مانگا کرتے تھے اور پیٹ بھرنے کے بعد جو کچھ بچ رہتا تھا وہ تاوان کی رقم میں ادا کر دیا کرتے تھے۔ آخر اس افلاس، تنگ دستی، مجبوری اور بیمارگی کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اس فرزند سعید اور خادمِ توحید نے سفر آخرت اختیار کیا۔

موسیٰ بن نصیر کا یہ ہیبت ناک اور عبرتناک انجام ایک وسیع النظر، جلیل القدر، وحید العصر سپہ سالارِ اعظم کا انجام تھا کہ جس کا جواب پھر سطوتِ اسلام نہ پیدا کر پائی۔ ان میں جنگی جوہر کوٹ کوٹ کے بھرا تھا۔ نزاکت حالات اور نکات معاملات کو سمجھنے میں اُنہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اُن میں دلیری اور بہادری بدرجہ اتم تھی۔ ہمت اور مستقل مزاجی اپنے کمال پر تھی۔ وہ کسی تکلیف سے گھبرانا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ مصائب سے ڈرنا بے معنی سمجھتے تھے۔ جنگی چالوں میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ کسی مسئلے کو بغیر سوچے سمجھے طے نہ کرتے تھے۔ وہ کوئی قدم غور و خوض کے بغیر نہ اُٹھاتے تھے۔ ہر معاملہ میں پوری احتیاط برتتے تھے۔ کامیابی کا یقین کامل ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی

خامی یا فروگزاشت باقی نہ رہنے دیتے تھے کہ بعد میں انجامِ بد سے دوچار ہونا پڑے۔ اُن کی دانشمندی، تدبر اور دور بینی ضرب المثل تھی۔ اندازہ ہمیشہ صحیح اور تخمینہ عموماً درست ہوتا تھا۔ کبھی کسی دشمن نے اُنہیں شکست سے ہمکنار نہیں کیا۔ اُنہوں نے کسی میدان میں بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ سپاہی اُن کے گرویدہ، عامل اُن کے فریفتہ رہتے تھے۔ وہ بڑی بلیغ اور فصیح تقریر کرتے تھے اور مُردہ دلوں میں رُوح اور مرجھائے جذبات میں برقی رَو سی دوڑا دیتے تھے۔ جہاں امور دینوی اور معاملات ملکی بجا لانے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتے تھے وہاں فرائض دینی اور امورِ مذہبی کو بھی انجام دینے میں کوئی کمی باقی نہ رکھتے تھے۔ وہ مردم شناس تھے، مردم آزار نہیں۔ وہ سیاست داں تھے مگر مکر و فریب سے ہمیشہ گریزاں رہتے۔ انہوں نے امانت کو ہمیشہ امانت سمجھا اور دوسرے کے حصہ کو خرد برد کرنا گناہ۔ اگر اُنہوں نے کچھ دولت جمع بھی کی تو وہ اُن کے حصہ کی تھی، اُن کی محنت کا صلہ۔

کہیں کہیں اگر ظلم کی داستانیں اُن کے نام سے منسوب ہیں تو وہ اُن کی بے شمار خوبیوں پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ عیسائی مورخوں نے اُن کی عظمت کو پامال کرنے اور اُن کی کامیابیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اُن پر نہ معلوم کتنے بہتان تراشے، کتنے افسانے گھڑے، اُن کو لالچی اور طامع بتایا۔ اُن کو ظلم و جور کا عادی کہا۔ اُن کو نمک حلال کہنے سے پرہیز کیا۔ اُنہیں مغلوب الغضب بتایا۔ اگر وہ طامع ہوتے تو دولت کے انبار لگا لیتے کہ وقت ضرورت کام آئے اور انہیں بے چارگی اور مفلسی کی موت نہ مرنا پڑتی۔ اگر وہ نمک حلالی کے عادی نہ ہوتے تو سلیمان کے پیام پر عمل کرتے اور اپنی آمد کی رفتار سست کر دیتے۔ اگر وہ جوش، غصہ اور غضب سے مغلوب رہتے تو طارق بن زیاد کو کبھی کا قتل کرا چکے ہوتے۔ اگر وہ ظلم و جور کو ہوا دیتے تو اتنی کنیزوں اور غلاموں کی بجائے اُن کی لاشیں ہی ساتھ ہوتیں۔ عیسائی اور یہودی جو امان و اماں کی زندگی بسر کرتے رہے، اُن کی بجائے اُن کی سڑی ہڈیاں نالیوں اور سڑکوں پر بکھری پڑی ہوتیں۔ یہ محض بے بنیاد الزامات اور تہمتیں ہیں جو ان کے سر تھوپ دی گئی ہیں کیونکہ وہ مملکت اسپین کے فاتح عظیم تھے۔

موسیٰ بن نصیر کے ساتھ یہ سلوک خلفائے بنو اُمیہ پر ایک بہت بھدا داغ ہے۔

اُن کی احسان فراموشی اور احسان ناشناسی کا عظیم ثبوت ہے۔ یہ ان کی کج اخلاقی، بے مروتی اور رکیک القلبی کا غلیظ مظاہرہ ہے۔ موسیٰ بن نصیر کا شمار تو ان عظیم المرتبت ہستیوں میں ہے جنہوں نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جنہوں نے "سطوتِ گوتھ" کو کچل کے رکھ دیا، جنہوں نے اسلام کے قدم براعظم یورپ میں گاڑ دیئے، جنہوں نے نعرۂ توحید، تثلیث پرستوں میں بلند کروا دیا، جنہوں نے کفر و الحاد کی وادیوں میں اذانوں کی گونج پیدا کر دی، جنہوں نے برائیوں کا قلع قمع کر کے ایک بہتر اور جامع نظام قائم کر دیا۔ موسیٰ بن نصیر نے جو کچھ کیا، مسلمان اس پر ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے اور اسلام ہمیشہ اپنی اس عظمت پر نازاں رہے گا۔ سلیمان نے جو کچھ کیا، دنیا ہمیشہ اُس کو نفرت کی نظروں سے دیکھے گی اور لعن طعن کرتی رہے گی۔

طارق بن زیاد کا ذکر عہد ولید بن عبدالملک میں جامع مسجد تک تو آتا ہے۔ جب میز کا مسئلہ پیش ہوا اور طارق بن زیاد نے اس کو اپنی حاصل کردہ اشیاء میں بتلایا اور چوتھا پایہ پیش کر کے اسے ثابت بھی کر دیا، پھر طارق بن زیاد پر کیا بیتی؟ یہ سب کچھ گمنامی میں ہے۔ ولید بن عبدالملک نے موسیٰ کی طرح طارق کو انعام و اکرام سے نوازا اور دارالخلافہ میں رہائش کے لئے ایک محل سجا سجایا بھی عطا کیا۔

سلیمان بن عبدالملک نے طارق بن زیاد سے کوئی تعرض تو نہ کیا مگر اُس کو اس حد تک قابل اعتماد بھی نہ سمجھا کہ آئندہ پھر کسی مہم پر روانہ کرتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طارق نے غالباً گمنامی کے باقی دن جو آرام اور آسائش سے لبریز تھے گزار دیئے۔

مغیث الرومی پہلے ہی قتل کیا جا چکا تھا۔ نواب جولین بدستور سبتہ (CEUTA) کے علاقہ کا والی رہا اور وہاں اُس نے زندگی کے باقی دن حکمرانی کرتے گزار دیئے۔ اُس کی پیشرو پشت میں ابو سلیمان ایوب دسویں صدی عیسوی میں فقہ اور شریعت کے بہت بڑے عالم گزرے جو قابل بھی تھے اور زکی اور ذہین بھی۔ نواب جولین نے خود اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ابھی نا قابل تحقیق بات ہے۔

طارق بن زیاد کی اولاد اُندلس میں الموحدین کے آنے سے قبل تک عزت و حرمت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ موسیٰ بن نصیر کے شاگرد، غلام یا بیٹے طارق بن زیاد کے ساتھ بارہ ہزار سپاہی حدود اُندلس میں نہیں داخل ہوئے تھے بلکہ اُس کے جلو میں ایک

انقلاب، ایک بہتر معاشی نظام، ایک نیا طرزِ بود و باش، ایک جدید اندازِ معاشرت، ایک مضبوط طرزِ حکومت، ایک جداگانہ تہذیب اور انوکھا تمدن ساتھ ساتھ آیا تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ صرف نیزے، کلہاڑی اور تلوار ہی نہیں لائے تھے بلکہ حسن سلوک، اخلاق و مروت، محبت و یگانگت لے کر آئے تھے۔ وہ برائیوں کا ازالہ کرنے آئے تھے، نیکیوں اور خوبیوں کی بنیادیں ڈالنے آئے تھے۔ وہ بدکاری، زناکاری کا خاتمہ کر کے نیک طینتی اور شرافت کا پرچم لہرانے آئے تھے۔ وہ اپنے ہمراہ وہ سب کچھ لے کر آئے تھے جس کے لئے اہل اُندلس صدیوں سے ترس رہے تھے۔

ملک اُندلس ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہاں یکے بعد دیگرے مختلف قومیں اپنی قوت اور جبروت کا مظاہرہ کرتی رہیں اور اس سرزمین کو ہمیشہ روندتی اور کچلتی رہیں۔ آیئے ہم عیسائی مورخین پر ایک ناقدانہ نظر ڈالیں جن میں ڈوزی، ڈاکٹر کونڈے، اسکاٹ، لین پول وغیرہ زیادہ معروف ہیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوگا کہ اہل ٹونیشیا، نہ رومنوں، نہ یونانیوں، نہ گوتھوں نے اُندلس کو وہ سب کچھ دیا جو اُن کے خیال کے مطابق غیر مہذب، بداخلاق، وحشی، ڈراؤنی صورت اور بھدے لباس پہننے والوں یعنی مسلمانوں نے دیا۔ جبکہ اس وقت طاقت اور قوت، جبر و تشدد ہر چیز پر حاوی تھا۔

اُس وقت عوام قانون سے ڈرنا تو الگ رہا، خود قانون کا مذاق اُڑاتے تھے۔ وہ قانون کی خلاف ورزی کو فخر سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہوں کے احکام اُن کے محل میں بھی نہ مانے جاتے تھے۔ لوگ نظم و ضبط سے جلتے تھے، ہر طرف سازشیں تھیں، نمک حرامیاں تھیں، بے ایمانیاں تھیں اور بدکاریاں اور شہوت رانیاں تھیں۔ ہر بات میں نام و نمود کا خیال تھا، ظاہری نمود و نمائش اوّل مقصد تھا۔

بادشاہ اور شاہی ملازمین کی تو کوئی پرواہ ہی نہ کرتا تھا۔ ایک دن سرِ دربار ایک غلام نے دوسرے غلام کو جوتوں سے پیٹ ڈالا۔ یہ تماشہ بادشاہ سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم تک نے دیکھا اور خوب خوب قہقہے لگائے۔ ایک طرف شاہِ وقت ہنس رہا تھا تو دوسری طرف ایک فراش کا منہ قہقہے بکھیر رہا تھا۔ چنانچہ مار کھانے والے غلام نے بادشاہ کو دہائی دی۔

بادشاہ کا نام درمیان میں آتے ہی مارنے والے غلام نے اپنے کمزور غلام کو جسے

روئی کی طرح دُھنک رہا تھا، اُسے فوراً چھوڑ دیا اور باادب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ مقدمہ بادشاہِ وقت کے حضور پیش ہوا۔ بادشاہ نے خود فیصلہ کرنے کی بجائے قاضی القضاۃ کو طلب کر لیا۔ قاضی صاحب نے بڑی توجہ اور انہماک سے مقدمہ سنا اور پھر فیصلہ کیا کہ جوتے مارنے والے غلام اور جوتے کھانے والے غلام دونوں کو مزید ایک ایک سو جوتے مارے جائیں۔ چنانچہ سرِ بازار جوتے بازی کی چاند ماری شروع ہو گئی اور دونوں غلاموں نے ایک دوسرے پر جوتے برسا برسا کر اُس کی چاند گنجی کر دی اور اس تمام وقت کے دوران ادنیٰ غلام سے لے کر شاہِ وقت تک قہقہے لگاتے رہے۔

اور جب یہ عالم ہو پورے ملک کا تو مسلمان جو اپنے ساتھ محبت، اخوت، مساوات، رحم دلی، خوش حالی اور خوش خیالی، بہتر اصول اور عمدہ نظام لے کر آئے تھے، انہیں کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ مسلمان آندھی اور طوفان کی طرح اُندلس میں داخل ہوئے تھے۔ اُس وقت اُن کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی عظیم فتوحات حاصل کریں گے کہ دیکھتے ہی دیکھتے حملہ آور سے حکمران بن جائیں گے۔ سال ڈیڑھ سال کا عرصہ کیا ہوتا ہے جس کے دوران اُنہوں نے گوشے گوشے اور چپے چپے پر اسلام کا علم نصب کر دیا۔

اب مسلمانوں کا اُس تنگ آبنائے سے لے کر کوہ پائرنیس تک بول بالا تھا۔ مسلمانوں نے جس سرعت سے غلبہ حاصل کیا اس کی مثال کسی اور جگہ ملنا مشکل ہے۔ مسلمانوں نے پلک جھپکاتے زنگ خوردہ، تنگ نظر اور تشدد آمیز قوانین کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ وہ قانون نافذ کیا جس میں غلام و آقا برابر تھے۔ جس میں زمیندار اور کسان ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ اب اُندلس میں بھائی چارہ تھا، محبت تھی، یگانگت تھی۔ اب وہاں نسلی امتیاز فنا ہو گیا تھا۔ غریبی اور امیری کا فرق مٹ گیا تھا۔ جہاں مستحقین کو وہ سب کچھ عطا ہو جس کے وہ مستحق تھے، جہاں وٹیزا کی اولاد اور اُس کے بھائی ''اوپاس'' کو وہ سب کچھ دیا گیا جس کے وعدے کئے گئے تھے، جہاں یہودیوں کو وہ ساری جائیدادیں واپس دلائی گئیں جو غصب کر لی گئی تھیں، جہاں مزارعین کو اُس کے مزارعہ سے پوری منفعت حاصل کرنے کا حق دیا گیا تھا، جہاں

ٹیکس صرف تین روپے سالانہ لگایا گیا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا؟ یہ ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔

متوسط طبقے کے ساتھ خاص مراعات برتی گئیں کیونکہ ملک کی فلاح و بہبود اُنہی سے وابستہ تھی۔ اُن پر سے پابندیاں اور قیود ہٹا لی گئیں۔ اُن کو اُن کے کاموں میں سرکار کی طرف سے ہر مدد کا وعدہ کیا گیا۔ اُن کی صنعت و حرفت کو شاہانہ سرپرستی بخشی گئی۔ اُن پر جو بے جا ٹیکس عائد تھے، معاف کر دیئے گئے۔ اُنہیں حکومت کا خاص آلہ کار اور رُکن سمجھا گیا۔

اسپین جو ساری دنیا سے الگ تھلگ گمراہیوں اور بدکاریوں کا مرکز تھا، خوش اخلاقیوں اور نیک چلنوں کا منبع بن گیا۔ خانقاہیں وہ خانقاہیں نہ رہیں جو پہلے تھیں بلکہ اُن کی اصلاح کی گئی۔ بدکار اور فاحشہ عورتوں کو وہاں سے الگ کیا گیا۔ حرص و ہوس کے سامان کو مٹا ڈالا گیا۔ پادریوں کے اخلاق کو سنوارا گیا۔ امراء اور وزراء کے کردار کو سنبھالا گیا۔ ظاہری اسباب نام و نمود ضبط کر لئے گئے، نمائشی چیزوں کو چھین لیا گیا۔ راہبوں اور راہبات کو نیک چلنی اور صالح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔ غلاموں کو دُکھ دینے یا ظلم کرنے پر سزائیں مقرر کی گئیں۔ اُن کے حقوق قائم کئے گئے، اُن پر مظالم بند کر دیئے گئے، استبداد منع کر دیا گیا، تشدد ختم کر دیا گیا۔

اب اُن کو سزائیں نہ دی جا سکتی تھیں۔ عورتوں کو بھیڑ بکری سمجھنے اور استعمال کرنے سے جبراً روک دیا گیا۔ اُن کی فلاح کے لئے قوانین کا اجراء ہوا۔ اُن کی بہبود کی خاطر لوگوں کو اپنے دیرینہ طرزِ عمل کو بدلنے پر مجبور کیا گیا۔ اُن کے ساتھ ناروا سلوک رکھنا، اُن کو محض آلہ تفریح یا سامانِ تعیش سمجھنا آئینی طور پر غلط تھا۔ اُن سے کھلے بازار یا جبراً بد اخلاقی کا مرتکب ہونا کڑی سزا کا مستوجب ہوتا تھا۔

یہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے ساتھ آنے والوں کا دم قدم تھا کہ لوگوں میں ازسرِ نو حب الوطنی کے جذبات پیدا ہوئے۔ ملک کے ساتھ وفاداری کا جذبہ عود کر آیا، جانثاری کا جوش اُبھر آیا۔ اب وہاں کے لوگ قوم و ذات کی قید سے علیحدہ ہو کر ملک کی حفاظت اپنا ایمان سمجھنے لگے۔ ملت یا مذہب کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ملک کی ترقی اور بہبود کو اپنا فریضہ گرداننے لگے۔ خیر خواہی نے نفسا نفسی کی جگہ لے لی۔ اپنا

اپنا خیال مٹ گیا اور دوسروں کی خیر و فلاح اولین فریضہ قرار دی گئی۔ ذاتی اقتدار کی جگہ ملی اقتدار نے لے لی۔ افراد کے تسلط کی بجائے قوم کا تسلط چھا گیا۔ فرقہ بندی کا نشان نہ رہا، گروہ بندی کا نام نہ رہا۔ قدیم تہذیب و تمدن کی بنیادیں اس طرح بھک سے اُڑ گئیں جیسے ان کے نیچے سرنگ لگی ہو اور اُن پر بارود بچھا دی گئی ہو کہ ایک دیا سلائی دکھائی اِدھر ہر چیز بھک بھکا کر رہ گئی۔ یہی اصول تھے، یہی خوبیاں تھیں کہ مسلمانوں کو یہودیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور عیسائیوں نے بھی، لٹی پٹی رعایا نے بھی، دل جلے حاکموں نے بھی۔ مسلمانوں کی آمد ایک فال نیک، ایک سعادت عظمیٰ سمجھی۔

بات یہیں تک پہنچ کے ختم نہیں ہو جاتی۔ مسلمان جو ایک اجنبی کی طرح تھے، جن کی کوئی بات یہاں والوں سے مطابقت نہ رکھتی تھی، جن کا کوئی انداز مفتوحین سے مماثلت نہ رکھتا تھا، یہاں کچھ اس طرح چھائے کہ ملکیوں کو غیر ملکیوں کے بارے میں اپنے خیالات اور نظریات تبدیل کرنا پڑے۔ اپنے عقائد تبدیل کرنا پڑے۔ کہاں تو وہ لوگ اُن کو بالکل تہذیب و تمدن سے نا آشنا اور بیگانہ سمجھتے تھے اور کہاں اُن کی تہذیب و اخلاق کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ بے تحاشہ مذہب اسلام قبول کرنے لگے۔ اُنہوں نے سازشوں اور چالوں کو حصولِ تاج و تخت کا ذریعہ بنانا ختم کر دیا۔ اُن کے امیر اب ناعزد ہوتے تھے جو بہر صورت اور بہر طور یگانۂ روزگار اور عظیم الشان اہلیت کے مالک ہوتے تھے۔ رعایا جو کبھی محفوظ اور کبھی نامحفوظ رہتی تھی اور جنہیں ہمیشہ بیرونی حملوں یا قزاقوں کی آمد کا خطرہ رہتا تھا اس سے اب وہ نجات پا گئے اور اپنے آپ کو محفوظ اور امن و امان میں سمجھنے لگے۔ قومی تعصبات جو قومی ترقی میں ہمیشہ رخنہ بنے ہوئے تھے، مٹا دیئے گئے اور ان کی جگہ ملک کی ترقی اور خوشحالی میں ہر مذہب و ملت کے فرد کو شریک کیا گیا۔ سزاؤں کا وہ دل ہلا دینے والا طریقہ ختم کر دیا گیا اور اب سزائیں جرم کی مطابقت سے دی جاتی تھیں جن میں بہیمیت کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا۔ چوروں اور ڈاکوؤں کی بیخ کنی کی گئی اور رعایا کو اُن کے شر سے محفوظ کیا گیا۔ کاشتکاروں اور کسانوں کی محنت اب رائیگاں نہ جاتی تھی بلکہ اُن کو اس کا حسب قانون معاوضہ ملتا تھا اور اُن کے افلاس کو دُور کرنے کے لئے ہر ممکن ترکیب کی جاتی تھی۔ بروقت ضرورت اُنہیں تقاویاں دی جاتیں۔ قحط کے دوران اُنہیں ہر ممکن مدد دی جاتی۔ بیج، کھاد، بیل

اور دیگر سامان مفت دیا جاتا۔ غربت کو خدا کا سب سے بڑا عذاب تصور کیا جاتا۔ جو نادار، یتیم، لاوارث تھے اُن کو شاہی خزانے سے عطیات دیئے جاتے۔ مالِ غنیمت اور زکوٰۃ میں بھی اُن کا حصہ ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی انصاف کی کوشش کی جاتی۔ اب ملک کی حفاظت ہر فرد و بشر پر واجب تھی مگر اندرونی حفاظت صرف مسلمانوں کے ذمے تھی۔

جب یہاں آبادیاں قائم کرنا شروع ہوا تو یہاں کے قدیم باشندوں سے مصالحت کے ذریعے رشتے جوڑے، اُن کو اپنے برتر اخلاق اور بہتر عمل سے اس حد تک مرعوب اور متاثر کیا کہ وہ صرف اسلام اور مسلمانوں کو ہی واحد نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ اُن کو اب مسلمانوں کی موجودگی گراں گزرنا تو درکنار ایک نعمت یزداں نظر آتی جو بے طرح اُن پر نچھاور کر دی گئی تھی۔ اب ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی آدمی بھی مطمئن اور محفوظ تھا اور عدل و انصاف کا حقدار۔ کٹر سے کٹر مذہبی انسان بھی اب یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ اُس کو فرائض دینی بجا لانے میں کوئی رُکاوٹ محسوس ہو گی۔ ہر شخص جس پر کوئی زیادتی ہوتی، بلا کھٹکے حاکم وقت کے دروازے انصاف کے لئے کھٹکھٹا سکتا تھا۔ اہلیانِ کلیسا کو بھی اپنے گمراہ کن اصول بدل کر نیک اصول داخل کرنا پڑے۔

رومن کیتھولک کہنے کو تو انہیں قزاق، غاصب اور خائن کہتے تھے مگر دل ہی دل میں اُن کی حرکات و سکنات اور خوش خلقیوں کے معترف تھے اور اپنی بدکاریوں پر لعنت ملامت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کو بھی اپنے طور طریقے بدلنے پڑے اور یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ جو الزامات مسلمانوں کے خلاف لگایا کرتے تھے محض بے بنیاد اور فساد پھیلانے کی غرض سے تھے۔ وہ اگر اپنے طریقوں کو نہ بھی بدلنا چاہتے تو اُن کی من مانی نہ چل سکتی تھی۔ وہ اب عیش و عشرت سے عاجز آ کر واقعی ایک شریف اور عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ پس انہوں نے کلیسا چھوڑا اور اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ یہ ضربِ کاری تھی اُن کے طریقوں پر جو بدل کر ہی رہے۔ اب قربان گاہوں پر قربانیاں نہ دی جا سکتی تھیں۔ اب مذہبی رسوم میں دنیا داری اور نمائش شامل نہ ہو سکتی تھی۔ اب نیکیوں کا دور دورہ تھا، اچھائیوں کا چرچا۔

مگر فاتحین تنگ نظر نہ تھے۔ اُنھوں نے یہاں کے بھی اچھے قوانین کا احترام کیا۔ یہاں کے مناسب دستوروں کو بدلہ نہیں۔ یہاں کے اصولوں کو بھی خواہ مخواہ گزند نہیں پہنچائی بلکہ غیر مسلموں پر اسلام کے وہی قانون لاگو ہوتے تھے جو اُن کے عقائد اور مذہب سے ٹکر نہ کھائیں اور ان کے طریقوں کے منافی نہ ہوں۔ رعایا خوش ہو گئی، یہودی مرفہ الحال، غلام آزاد، عورتیں با حجاب، متوسط طبقہ مطمئن اور مسرور، کسان اور دہقان شاداں و فرحاں، تلخیاں ختم، گمراہیاں ختم، بداخلاقیاں ختم ہو گئیں۔

جہاں لاقانونیت اور بے ضابطہ پن کا دور دورہ ہو وہاں قانون اور ضابطہ کا نظام و نفاذ آسان کام نہیں۔ مگر ان کلمہ پڑھنے والوں کے دلوں میں جو جذبہ کارفرما تھا اُس میں ایک آہنی عزم تھا، ایک جذبہ عمل تھا، ایک اخلاق تھا۔ وہ سرزمین اُندلس پر آئے ہی اس لئے تھے کہ اللہ کے نام اور اُس کے قانون کا بول بالا ہو۔ پھر وہ کس طرح ایسے طریقے اختیار کر سکتے تھے جس کی وجہ سے قرآنی احکام اور شرعی اصولوں پر ضرب پڑے۔

چنانچہ ازسرنو تمام مفتوحہ زمین کی پیمائش کی گئی۔ جو جاگیردار، زمیندار اور نواب اپنی زمینوں کو چھوڑ کر بھاگ چکے تھے یا لڑائی میں مارے گئے تھے اُن کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگ بسائے گئے۔ آبادکاری کے لئے ہر طریقہ اور وسیلہ بہم پہنچایا گیا۔ کہیں یمنی بسے تو کہیں حجازی۔ کہیں شامی تو کہیں ایرانی۔ کہیں افریقی تو کہیں مصری۔ اسی طرح بھانت بھانت کے لوگ ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئے۔

بیرونی حملوں کے خطرے کے پیش نظر تمام قلعوں کی مرمت کی گئی۔ نئی فصیلیں بنیں، نئے اور مضبوط قلعے تیار ہوئے۔ سرحدوں پر چوکیاں بنیں، چھاؤنیاں قائم ہوئیں، دُور دراز کے علاقوں میں خبر رساں ایجنسیوں کا اجرا ہوا تاکہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر فوری طور پر خبریں آ جا سکیں۔ چنانچہ صرف ایک سال کے اندر اُندلس کی سرحدیں لوہے اور سیسے کی دیواریں بن گئیں۔

علامہ ڈوزی نے ہمیشہ مسلمانوں کی طاقت کا مذاق اُڑایا اور دشمنانِ اسلام کی تعریف اور توصیف کرتے اُن کا منہ نہیں گھستا۔ اُنھوں نے اُندلس پر مسلمانوں کے قبضہ کو غاصبوں کا نام دیا، دل کے پھپھولے پھوڑے۔ مگر وہ اس سے نہ انکار کر سکے کہ مسلمانوں نے اسپین کی فتح کے بعد دراصل وہاں کی برائیوں کی بیخ کنی کی اور بے

لگاموں کو لگام دی۔

شروع شروع میں ضرور کچھ قتل و غارت گری ہوئی جو ہر جنگ میں ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد عربوں نے فوراً حالات پر قابو پا لیا اور جور و استبداد، ظلم وستم کا ازالہ کر کے امن و آشتی کا ماحول پیدا کر دیا۔ مسلمانوں نے آغاز سے انجام تک اپنا رویہ نرم اور دوستانہ رکھا۔ مسلمانوں نے اُندلس کے قانون پر ہاتھ نہیں ڈالا اور اسے جوں کا توں رہنے دیا۔ انہوں نے ہسپانوی ججوں اور منصفوں کو بحال رکھا جس کی اُمید کسی فاتح سے نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں نے صرف وہی جائیدادیں اور علاقے آپس میں بانٹے جنہیں اُنہوں نے بزورِ شمشیر فتح کیا تھا یا پھر وہ جائیدادیں تقسیم کی گئیں جن کے مالکوں کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ پھر بھی ایسی زمینوں پر پہلے والے کاشتکاروں کو بحال رکھا، بلکہ اُن کے حقوق میں اضافہ کر دیا۔

یہ بھی ہوا کہ بعض شہر اور علاقے مقامی لوگوں کے پاس ہی رہنے دیئے گئے۔ تھیوڈومیر کو مرسیہ کا علاقہ بخش دیا گیا۔ شرائط صلح میں یہ شرط تھی کہ جو شخص شہر چھوڑ کر نہیں گیا اُس کی کوئی چیز بھی ضبط نہیں کی گئی۔ اسی طرح جو معاہدہ تھیوڈومیر اور عبدالعزیز صاحبزادہ موسیٰ بن نصیر کے درمیان ہوا وہ آج تک تاریخ میں موجود ہے۔ اس کی شرائط کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ مرسیہ کا علاقہ تھیوڈومیر کو بخش دیا گیا اور اس کا نام تھیوڈومیر یا تدمیر رکھ دیا۔

عوام پر صرف بارہ درہم سالانہ جو تقریباً تین روپے ہوتے ہیں ٹیکس لگتا تھا۔ خواص پر 48 درہم سالانہ ٹیکس تھا یعنی صرف سولہ روپے سالانہ۔ متوسط طبقہ پر صرف چودہ روپے سالانہ ٹیکس لگایا گیا۔ عورتیں، بچے، راہب، پادری، لولے، لنگڑے، اندھے، اپاہج، بیمار، معذور، غلام، بھیک منگے اس ٹیکس سے بری تھے۔ کاشت کے لائق زمینوں پر خراج عائد کیا جاتا تھا جو مالگذاری کی شکل میں ہوتا تھا اور ضلع بہ ضلع بدلتا رہتا تھا اور زمین اور فصل کے لحاظ سے لگایا جاتا تھا۔ یہ کسی بھی صورت میں آمدنی کے بیس فیصد سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔

مسلمانوں میں تعصب نام کو بھی نہ تھا بلکہ وہ وسیع النظر ہوتے اور رواداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کسی کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا حالانکہ رواج عیسائیوں اور یہودیوں دونوں میں رائج تھا۔ جو غیر مسلم، مسلمان ہو جاتا تو وہ ان تمام مراعات کا مستحق تھا جو کسی دوسرے مسلمان کو حاصل تھیں۔ غلام، قبول اسلام کے بعد ملازم نہ رہتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ شرفاء تک اپنی بیٹیاں بیاہ دیتے تھے۔

کلیسا اور اہالیانِ کلیسا کو جو مراعات مسلمانوں کے ہاتھوں سے حاصل ہوئیں اس پر وہ دانتوں میں اُنگلیاں دباتے تھے اور شکر مسیح علیہ السلام کرتے تھے۔ مذہب کی خوبیاں لوگوں کے کردار میں داخل ہو گئی تھیں۔ کیا امیر، کیا غریب جو "**لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ**" کہتا، نیک صفوں میں شامل ہو جاتا۔ جب یہ سلسلہ فزوں سے فزوں تک ہوا تو عیسائی پادریوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور اُنہوں نے اپنی اصلاح کر ڈالی۔

مختصر یہ کہ اسپین میں مسلمان کیا آئے ایک ضابطہ آیا، ایک قانون آیا، ایک مستحکم سیاسی نظام آیا، معاشرتی اصول آئے، بہتر انتظامات آئے، مذہبی محاسن آئے، سیاسی خوبیاں آئیں، غرض کہ انسانی بود و باش میں ایک مکمل انقلاب آیا جس کا احسان مند نہ صرف اسپین بلکہ پورے یورپ کو ہونا چاہئے۔



اُندلس آنے والی فوج میں افریقہ کے مقامی باشندے زیادہ تھے اور اُن میں بربر
قوم کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ فوجی مجاہد ہسپانیہ میں آباد ہونے نہیں آئے تھے
بلکہ اُن کی جنگ و جدل کی جبلّت اور جوشِ جہاد اُنہیں وہاں کھینچ لایا تھا۔ اس کے بعد
آنے والوں میں بھی زیادہ تر بربر اور قبطیٰ تھے جو اب مالِ غنیمت اور مال و متاع کے
لالچ میں آ رہے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ جب مسلم سپہ سالار موسیٰ بن نصیر، ساحل اُندلس
پر اُترے تو اُن کے جلو میں شرفائے حجاز بھی تھے اور شام کے روٴسا بھی۔ ایرانی ثقہ
لوگ بھی اور صحابہ کرام بھی اور اولادِ صحابہ بھی تھی۔ بعد میں آنے والے یہ لوگ اب
وہاں آبادیاں قائم کرنے اور مستقل رہائش کے لئے تشریف لائے تھے۔ اُنہیں مال و
دولت کی لالچ اتنی دُور کھینچ کے نہیں لائی تھی بلکہ وہ تو اس خیال سے آئے تھے کہ
ہسپانیہ (اُندلس) کے کفرستان میں دین و ایمان کی شمع روشن کریں اور یہ بے دینوں کی
بسیاں چنگ و ناقوس کی بجائے اذانوں کی آواز سے گونج اُٹھیں۔

اس کے ساتھ ہی وقت اور سیاسی حالات کا بھی یہی تقاضہ تھا کہ اب وہاں مقامی
باشندوں کے ہاتھ میں لوگوں کی زندگیاں دے دی جائیں اور فوج کو الگ رکھ کر صرف
محافظ دستوں کے سپرد وہاں کا انتظام و انصرام کر دیا جائے۔ کیونکہ مقامی محافظ کسی
وقت بھی اطاعت سے منہ موڑ سکتے تھے یا مسلمانوں کو غیر ملکی سمجھتے ہوئے ان کے
خلاف صف بستہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ وہاں مستقل
مسلمانوں کی آبادیاں قائم کی جائیں۔ کیونکہ مقامی آبادیاں مثلاً اشبیلیہ، غرناطہ، ماردہ
ایلبورا وغیرہ میں مسلمانوں کے ذرا غافل ہوتے ہی بغاوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔

پس ایسے بے اعتبار لوگوں پر اس قدر اعتبار کہ اُنہیں نظام سلطنت سونپ دیا جائے
کوئی عقلمندی یا دانائی نہیں بلکہ ایک زبردستی غلطی ہوگی۔ اس لئے کہ اگر وہاں مسلمانوں

مستقلاً آباد کیا جاتا تو اس قدر جنگ و جدل، اتنی خونریزی، اس قدر جانفشانی اور
زردشی سب ہی باتیں اور چیزیں ضائع ہو جاتیں اور سمندر پار کا اتنا بڑا علاقہ جو پتہ
ہیں کن کن مشکلات اور مصائب جھیل کر فتح کیا گیا تھا خود اپنی غفلت سے ہاتھوں
ے نکل جاتا اور مسلمان کف افسوس ملتے رہ جاتے۔

اُندلس کی فتح پہلی صدی کے اواخر میں ہوئی۔ جناب موسیٰ بن نصیر 95 ہجری میں
اپس ہوئے اور حضور پاکؐ کو وفات پائے اسّی سال سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا تھا۔
س وقت اصحابِ رسولؐ میں سے کسی کا زندہ ہونا تعجب خیز تھا۔ حضور پاکؐ کے زمانہ
ے لوگ تو عہد یزید اور عبدالملک میں محاصرہ مدینہ کے دوران خدائے پاک اور رسول
لؐ سے جا ملے تھے۔ بہت سے لوگ عمر طبعی کو پہنچ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے
ے۔ اگر دو چار باقی بھی رہ گئے تھے تو انہیں مکہ اور مدینہ کی گلیاں چھوڑنا کسی طرح گوارا
تھا۔ بلکہ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ سمندر پار اسپین کی سرزمین تک بعض صحابہ کرام
ر تابعین پہنچے تھے اور انہوں نے اپنی موجودگی سے اس سرزمین کو عزت بخشی تھی۔

موسیٰ بن نصیر کے ساتھ جو بزرگ آئے تھے اُن میں سب سے زیادہ عظیم ہستی
عزت منیذر کی تھی۔ ان کے علاوہ تابعین میں 1- خنش الصنعانی، 2- ابی عبداللہ،
- ابوعبدالرحمٰن، 4- حبان بن ابی جبلہ، 5- مغیرہ بن ابی بردہ، 6- نشیط بن کنانہ، 7- حیاۃ
نا رجاء، 8- عبداللہ البغری، 9- عیاض بن عقبہ اور 10- عبدالجبار بن ابوسلمہ تھے۔

ان اصحابِ کرام کا تفصیل سے ذکر اس کتاب کے پچھلے صفحات میں موجود ہے۔

ان اصحاب کے علاوہ جن قوموں نے اس سرزمین کو رونق بخشی اور اسے اپنا وطن
انے کی کوشش کی ان قوموں میں سب سے زیادہ ''عرب'' تھے۔ عربوں کے علاوہ جو
میں اُندلس میں آئیں اور یہاں آباد ہوئیں ان میں عدنانی، قحطانی اور بربر اور دیگر
زیقی لوگ تھے۔ ان سب کی الگ الگ تفصیل آپ پچھلے صفحات پر پڑھ چکے ہیں۔

اب ہم اپنے تاریخی ناول ''موسیٰ بن نصیر'' کو پھر آگے کی طرف بڑھاتے ہیں۔
وسیٰ بن نصیر اگرچہ اُندلس سے واپس جا چکے تھے بلکہ اپنے افسوس ناک انجام سے
وچار تھے مگر اس عظیم سپہ سالار اور امور سلطنت کے ماہر نے اُندلس میں ایک ایسی
سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی جس کے نقوش تاریخ اندلس کے صفحات سے کسی طور نہیں

مٹائے جا سکتے۔ اس لئے کہ اندلس میں موسیٰ بن نصیر کے جانے کے بعد اُن کا فرزند ارجمند عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر برسرِ اقتدار آیا تو اُس نے نہ صرف اپنے باپ کا نام زندہ رکھا بلکہ اُنہی نقوش پر چلتے ہوئے اُندلس کی اسلامی سلطنت میں چار چاند لگا دیئے۔

عبدالعزیز چونکہ اپنے باپ کے ذہین بیٹے تھے اور انہوں نے اسلامی سلطنت کو اُندلس میں اور فروغ دیا اور اپنے باپ موسیٰ بن نصیر کے کاموں کو آگے اور ترقی کی طرف بڑھایا اس لئے ان کے مختصراً حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اُندلس کی اسلامی تاریخ سے موسیٰ بن نصیر کے خاندان کو کسی طور الگ نہیں کیا جا سکتا۔

موسیٰ بن نصیر اپنی فتوحات کا سلسلہ جلیقیہ میں قائم کئے ہوئے تھے کہ امیر المومنین ولید بن عبدالملک کا پروانہ مغیث الرومی کے ہاتھوں موصول ہوا کہ وہ جلد از جلد اسپین سے روانہ ہو کر دربارِ خلافت میں دمشق میں خلیفہ کے حضور پیش ہوں۔ حکم حاکم جان دارد، موسیٰ بن نصیر کو یہ طلبی یقیناً بہت ناگوار گزری ہوگی مگر وہ کر ہی کیا سکتے تھے؟ خلیفہ سے حکم عدولی کی ہمت اُن میں نہ تھی۔ اُنہوں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ پورے اسپین کو فتح کرنے کے بعد وہ فرانس بلکہ پورے یورپ کو زیر و زبر کر کے رکھ دیں گے۔ مگر وہ صرف ایک سردار تھے۔ وہ خود مختار نہ تھے اس لئے انہوں نے خلیفہ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور واپسی کی تیاری کرنے لگے۔

مگر شاید خلیفہ ولید کو موسیٰ بن نصیر کی شدید ضرورت تھی کہ اُنہوں نے دوسرے قاصد ''ابوالنصر'' کو اُندلس بھیج دیا جس نے خلیفہ کا حکم دوہرا کر اسے فوراً واپس جانے کی تاکید کی۔ پس موسیٰ بن نصیر نے اپنے فرزند ارجمند عبدالعزیز کو 95ھ میں امیر اُندلس مقرر کیا اور خود قیرواں روانہ ہو گئے۔

ہسپانیہ نیا نیا فتح ہوا تھا۔ پورے ملک کا انتظام اور نئی مملکت کی ازسرِنو تنظیم کوئی معمولی کام نہ تھا جسے آسانی سے انجام دیا جا سکے۔ مگر موسیٰ بن نصیر کا یہ ذہین بیٹا عبدالعزیز اعلیٰ صلاحیت کا مالک اور ایک نہایت جرأت مند جوان تھا۔ اُس نے نئی حکومت کا ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام قائم کیا کہ مسلمانوں کے پنجے اُندلس (ہسپانیہ) میں جم گئے اور مضبوط ہو گئے۔ مقامی سلطنت گوتھک کے پرخچے اُڑ چکے تھے اور عیسائی

حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ عبدالعزیز کو ان منہدم بنیادوں پر ایک نئی مگر مضبوط عمارت تعمیر کرنے کی تمنا تھی جسے اُس نے بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا اور ایک ایسی پائیدار حکومت قائم کی جو صدیوں تک زمانہ کے تھپیڑے سہتی رہی، مقابلہ کرتی رہی، مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔

سلطنت اسپین کے بہت سے شہر ایسے تھے جن پر مرکز کا براہِ راست قبضہ نہ تھا بلکہ انہیں گورنروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ادھر موسیٰ اور طارق ہسپانیہ سے نکلے ادھر ان خودسر گورنروں نے مرکز کے اقتدار سے منہ موڑ لیا اور فرمانبرداری سے انکار کر دیا۔ مگر عبدالعزیز نے فوراً اُن کے خلاف کارروائی کی اور فوجیں بھیج کر نہ صرف سرکوبی کی بلکہ انہیں سخت سزا دے کر پھر اطاعت پر مجبور کر دیا۔

اسلامی سلطنت کا اطاعت گزار عیسائی امیر تھیوڈو میر تھا۔ اُس سے اطاعت کا معاہدہ تھا جس کی تجدید کی گئی اور اُسے بہت سی مراعات دی گئیں۔

اس کے علاوہ شمال مغرب کی جانب کئی فوجیں روانہ کی گئیں کہ دُور دراز کے علاقوں پر اسلامی حکومت کا دبدبہ برقرار رہے۔ یہ فوجیں دُور تک نکل گئیں اور انہوں نے لائی سی ٹیا جسے ''لیو'' کہا جاتا تھا، اس کے اکثر مقامات فتح کئے اور پھر خلیج کیلئے سے ملحق علاقوں پر قبضہ کر لیا اور پھر نارڈا تک پہنچ گئے۔ یہ تمام کے تمام سرحدی علاقے تھے۔ ان کی حفاظت اور ان پر مضبوط قبضہ بھی ضروری تھا ورنہ وہ کسی وقت بھی متحد ہو کر میدانوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی فوجوں کی آمد کا ہر دم خطرہ لاحق رہتا تھا۔ لہٰذا وہاں کے قلعوں میں تجربہ کار اور قابل اعتبار گورنر مقرر کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر امیر عبدالعزیز نے اپنے باپ سے صحیح تربیت حاصل نہ کی ہوتی تو وہ اس اہم موقع پر دھوکہ کھا سکتے تھے۔ مگر عبدالعزیز نے چھوٹی چھوٹی فوجی چوکیاں قائم کیں جہاں مختصر فوج رکھی۔ اُس کے سپرد صرف نگہداشت اور حفاظت کا کام تھا یا پھر اگر کوئی بڑی فوج حملہ آور ہو تو اس کی اطلاع قریب کے گورنروں اور امیر عبدالعزیز کو پہنچائی جا سکے۔

امیر سلطنت عبدالعزیز نے نظامِ جمہوریت قائم رکھنے کے لئے ایک مشاورتی کونسل بنائی جس میں عقلمند، ذی شعور اور بیدار مغز لوگ شامل کئے گئے۔ اس طرح

شخصی حکومت کی بجائے مشاورتی حکومت کو ترجیح دی گئی۔ اس کونسل نے خزانے کی آمدنی کے ذرائع وضع کیے، اخراجات کے اصول بنے، رعیت پر چھوٹے چھوٹے ٹیکس لگائے، جرائم کی روک تھام کے لئے عدالتیں قائم ہوئیں، فوجداری عدالتیں الگ الگ بنیں، شریعت اور قانون سے واقف لوگوں کو جج اور منصف مقرر کیا گیا جو مقدمہ سن کر اپنی واقفیت کی بنا پر فیصلہ کرتے۔ اُن کی اپیلیں گورنر علاقہ یا امیر اُندلس کے حضور بھیجی جا سکتی تھیں۔ غیر مسلمانوں کو شرعی پابندیوں سے الگ رکھا گیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر اُن کے مذہب کے لوگوں کو منصف اور جج مقرر کیا گیا۔ اگر ایک فریق مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہوتا تو ان کے مقدمات قاضی اور مسلمان حاکموں کے یہاں سنے جاتے۔

دوسرے مذہب والوں کو مکمل مذہبی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ اُن پر مسلموں کا احترام تو لازم تھا مگر اُن کے اصولوں پر چلنا نہیں۔ مگر ٹیکس کی ادائیگی لازمی تھی۔ ٹیکس کی وصولی کے سلسلے میں حتیٰ الامکان تشدد سے گریز کیا جاتا۔ پڑوسی کو کوئی ستا نہیں سکتا تھا۔ زمین کی بہتری پر عبدالعزیز نے خاص توجہ دی۔ خوشحالی کا تعلق اچھی فصلوں اور اچھی کاشت سے ہے، اس سے عبدالعزیز واقف تھے۔ پرانے کسانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ حسب سابق زمینوں کو کاشت کریں۔ اُنہیں جو حقوق حاصل تھے اُنہیں دوگنا اور سہ گنا کر دیا گیا۔ تیار شدہ فصل لارڈ کاؤنٹ کی ملکیت ہوتی تھی۔ اس کا تھوڑا سا حصہ کاشتکار کو دیا جاتا تھا۔ کسی حاکم کو لگان چھین لینے کی اجازت نہ تھی اور نہ اُن سے مفت کام لیا جا سکتا تھا۔ اُن کے مویشیوں کو بھی کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

یہ سب کچھ رعایا کی خوشحالی کے لئے تھا۔ عبدالعزیز نے اپنی رعایا کے ساتھ ایک اچھے مربی اور رحم دل باپ کا سا سلوک کیا۔ غلاموں کو، نوکروں کو اور عام شہریوں کو اس قسم کی آزادی حاصل تھی جو اُن کے تصور میں بھی نہ تھی۔ رعیت کو تن آسانی کے تمام سامان فراہم کیے گئے، شہروں کا انتظام کیا گیا۔ معاش کے لئے ذرائع مہیا کیے گئے کہ وہ اپنے نئے مالک سے بددل نہ ہو جائیں۔ جو عیسائی سردار اپنی جائیدادیں اور زمینیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اگرچہ مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں مگر اُن پر ہل چلانے والوں کو بے دخل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح کاشتکاروں کے رہن سہن میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی نہ اُن پر کوئی مذہبی پابندی لگائی گئی۔ اس حسن سلوک نے رعیت کے

دل موہ لئے۔ اُن کو بندۂ بے دام بنا دیا۔ اُن کے خیال میں بھی نہ تھا کہ اُن کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب بھی آ سکتا ہے کہ اُن کی زندگی چشم زدن میں بدل جائے گی۔ یہ اس سلوک کا نتیجہ تھا کہ غیر مسلم برضا و رغبت اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔

مؤرخین نے امیر عبدالعزیز پر عیش و عشرت سے زندگی گزارنے کا الزام لگایا ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق امیر عبدالعزیز کے محل میں حسین ترین عیسائی کنواری لڑکیاں کنیز کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ ہر فاتح کے یہاں مفتوحین کی اولادیں یا تو غلام بنائی جاتی تھیں یا پرورش کی خاطر رکھ لی جاتی تھیں۔ عبدالعزیز کے محل میں تو ان کے لئے تمام سامانِ آرائش مہیا تھے۔ خصوصاً جبکہ وہ لاوارث اور بے سہارا ہو چکی تھیں۔

اسپین کے آخری بادشاہ راڈرک کی بیوہ اے جی لونا نے امیر عبدالعزیز سے شادی کر لی تی اور وہ اُس کو حد سے زیادہ چاہتے تھے اور احترام کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اُنہیں اپنے مذہب (عیسائیت) پر رہنے کی اجازت بھی دے دی تھی اور وہ کوئی رُکاوٹ ان کی ادائیگی میں نہ ڈالتے تھے۔ اپنے عشوے، غمزے اور شوخی ادا کی بدولت ملکہ اے جی لونا بہت جلد امیر عبدالعزیز کے مزاج پر حاوی ہو گئی اور عیسائیوں پر خاص مراعات جو ہو رہی تھیں ان میں یقیناً ملکہ کا ہاتھ ہو گا۔ مسلمان خصوصیت سے برسر اقتدار طبقے کے لوگ اس بات کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ (شاید) ملکہ نے امیر کو اس بات پر اکسایا کہ رعایا اور اراکین سلطنت جب امیر کے سامنے حاضر ہوں تو اُس کی عزت بجا لانے کی خاطر اُس کے سامنے سجدہ کریں۔ مذہب اسلام میں یہ چیز سخت مذموم ہے۔ کیونکہ اسلام میں ''سجدہ'' صرف خدا ہی کو کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزیز نے ملکہ کا یہ مشورہ تسلیم نہ کیا۔ لیکن انہوں نے اپنے محل میں پہنچنے کے لئے ایک دروازہ ایسا ضرور بنوا دیا جو ذرا چھوٹا تھا اور اُس سے گزرتے وقت جھکنا پڑتا تھا۔ پس لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ امیر کا مقصد ہے کہ رعایا اُس کے سامنے سرخم کرے۔ عرب جو بہت غیور اور خودسر ہوتے ہیں، اُن کو تو یہی بہت گراں تھا کہ ایک غیر مسلم عورت کے ہاتھ میں اس قدر اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ اس طرح عبدالعزیز کی مخالفت کا انہیں ایک اور بہانہ مل گیا۔

مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ موسیٰ بن نصیر کے بعد اگر امارت کے فرائض عبدالعزیز کے بجائے کسی اور کے سپرد کئے جاتے تو اُندلس کی حکومت اور امارت چند سال بھی نہ چل سکتی۔ یہ عبدالعزیز کا حوصلہ تھا کہ اُس نے باپ کے اُندلس سے جانے کے بعد اسے نہ صرف قابو میں رکھا بلکہ اصلاحات اور ضروری انتظامات کے ذریعہ اس میں استحکام پیدا کیا۔ وہ ایک ذی مرتبہ امیر تھے اور ایک باشعور، مدبر، ذی حوصلہ، دانا، جہاں بانی اور جہاں داری کے اصولوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اُنہوں نے صرف ایک سال کی مدت میں وہ کچھ کر دکھایا جو دوسرے سالہا سال نہ کر سکتے تھے۔

اگر اسپین میں ایک قوم اور فرقے کے لوگ آباد ہوتے تو اُنہیں سنبھالنا اور قابو میں رکھنا زیادہ دقت طلب ہوتا۔ مگر وہاں تو بربر، افریقی، قحطانی، عدنانی اور عرب غرض یہ کہ مختلف علاقوں اور مزاجوں کے لوگ آ کر یہاں آباد ہوئے تھے جن کی بول چال، اندازِ زندگی، رہن سہن اور زبان ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ ان مختلف الخیال لوگوں کو قابو میں رکھنا موسیٰ بن نصیر اور اُن کے بعد اُن کے فرزند ارجمند عبدالعزیز ہی کا کام تھا۔

یہ لوگ تو باہر سے آئے ہوئے لوگ تھے، خود ہسپانوی اور مقامی باشندے اس قدر ناقابلِ اعتماد تھے کہ اُن پر اعتبار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جبکہ اسپین کے سیاسی حالات کا تقاضہ تھا کہ اُس پر مستقل قبضہ رکھا جائے۔ کیونکہ مقامی باشندوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ادھر طارق بن زیاد نے پیٹھ پھیری اور ادھر ایلبورا، غرناطہ، مرسیہ اور اشبیلیہ وغیرہ میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ ایسے لوگوں پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا تھا؟ وہاں کا تقاضہ تھا کہ وہاں کی سرزمین پر مسلمانوں کو آباد کیا جائے۔ کیونکہ اگر نہیں کیا جاتا تو وہاں قبضے کے لئے جو جنگ و جدل، خونریزی، جانفشانی اور سرفروشی مسلمانوں نے کی ہے وہ سب بیکار ہو جاتی اور اُنہیں سوائے افسوس کے اور کچھ ہاتھ نہ آتا۔

اسپین میں سب سے زیادہ جو قوم باہر سے آئی اُن میں عربوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ عرب، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر دونوں کے ساتھ ہی اس ملک میں آئے تھے۔ آٹھویں صدی میں جب الحر بن عبدالرحمٰن ثقفی اُندلس کے امیر ہو کر آئے تو ان کے ساتھ تقریباً چار سو افراد آئے۔ یہ سب شرفائے عرب میں سے تھے۔ یہ لوگ اسپین

آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اُن کے بعد جب اسمح بن مالک خولانی والی اسپین بنے تو اُن کے ساتھ بھی ملک شام سے کئی عربی خاندان آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ پھر اسی صدی میں جب افریقہ میں بربریوں نے بغاوت کی تو اُموی محصور فوج کے سردار بلج بن بشر قشیری، شاہی دستوں کے ساتھ اُندلس چلے آئے اور معہ سپاہیوں کے (اسپین) آباد ہو گئے۔ اُن کے بعد 743ء میں جب ابوالخطار حسام بن ضرار الکلبی والی اُندلس بن کر آئے تو اُن کے ساتھ مصر، حمص، فلسطین، اُردن اور دمشق، قنسرین کے لوگ بھی لشکر میں شامل تھے۔ اُن کو زمینیں بھی دی گئیں اور جاگیریں بھی اور وہ بھی یہیں آباد ہو گئے۔ مصریوں نے اکشنوبہ اور باجہ کے علاقے پسند کئے اور پھیلتے پھیلتے مرسیہ اور تدمیر تک پہنچ گئے۔ حمص والے یسیلہ اور اشبیلیہ میں مقیم ہوئے اور اُردن کے لوگ ریہ اور مالقہ میں۔ دمشق والے البیرہ اور غرناطہ میں اور قنسرین والے جین (JAEN) کے شہری بنے۔

عربوں کی طرح اُندلس میں عدنانیوں کے بھی بہت سے قبیلے آئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان عدنانی قبائل میں بنی ہاشم، بنی اُمیہ، بنی مخزوم، بنی فہر، بنی کنانہ، بنی ہذیل، بنی تیم، بنی قیس، عقیلان، بنی ثقیف، بنی ربیعہ، بنی زیاد گویا سب ہی مشہور قبیلے باشندگان میں مدغم ہو کر رہ گئے۔

قبیلہ بنی ہاشم عرب میں ماسوائے عرب میں بھی بہت ہی مقبول اور محترم حضرات میں شمار ہوتے تھے۔ کیونکہ ہمارے نبی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کے افراد جب بنی اُمیہ کی حکومت دم توڑ رہی تھی تو سات سال قرطبہ (اُندلس) میں (1016ء سے 1023ء تک) وہاں حکومت کرتے رہے۔ علاوہ مالقہ میں بھی اُنہوں نے بائیس سال (1035ء تا 1057ء تک) حکومت کی۔ یہ ایک سال کی مدت تک جزیرہ الخضرا میں بھی حاکم رہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بنی اُمیہ کے دورِ حکومت میں اُندلس فتح ہوا۔ پہلے بنو اُمیہ اس قبیلے کی طرف سے اسپین میں حاکم رہے، پھر عبدالرحمٰن الداخل کے بعد تو یہ مستقل شاہانِ اسپین رہے اور ہشام کے عہدِ حکومت تک اس قبیلے کا دور دورہ رہا۔

قبیلہ بنی مخزوم نے اسپین میں کسی ایک جگہ پڑاؤ نہیں ڈالا اور پورے اُندلس میں

بکھر گئے۔ اس قبیلہ کا نابینا شاعر ''المخزومی'' بڑی زبردست ادبی شخصیتوں میں شمار
سلطان اشبیلیہ معتضد کے وزیر اسی خاندان کے لوگ رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
ان کی کثیر تعداد اطراف اشبیلیہ میں آباد تھی۔

بنی فہر نے کچھ زمانہ تک اسپین میں کافی اقتدار قائم رکھا۔ اس قبیلے سے متعلق
عبدالملک بن قطن 114ھ مطابق 73ء سے لے کر 116ھ 74ء اور پھر 123ھ
742ء میں تقریباً ایک سو سال تک والی اُندلس رہے۔ اُنہی کی اولاد میں ابوالقاسم
صوبہ بنیۃ کے علاقہ البوت کے حاکم تھے اور 393ھ سے 453ھ تک حکومت کرتے
رہے۔ اُن کی اولاد میں سے بنی الجد تھے جن میں بڑے بڑے عالم و فاضل گزرے
ہیں۔ اس مشہور قبیلے کے یوسف بن عبدالرحمٰن تھے جنہوں نے عرصہ تک آزادانہ
اسپین پر حکومت کی اور پھر عبدالرحمٰن الداخل کے ہاتھوں شکست کھائی۔ مگر اس قبیلے
کے لوگ ہمیشہ صاحب دولت رہے اور جہاں جہاں بھی آباد ہوئے وہاں عزت کے
مستحق سمجھے گئے۔

بنی کنانہ اطراف و جوانب طلیطلہ میں آباد تھے۔ ان میں بعض بڑے آدمی پیدا
ہوئے تھے جن میں سے ایک رقشی کنعانی ہیں جو بہت مشہور ہیں۔ قاضی ابوالولید، وزیر
ابوجعفر اور ابوالحسن مشہور سیاح اور عالم اسی کنبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اموی حکام ان کی
عزت کرتے تھے اور وہ قابل تکریم مانے جاتے تھے۔

بنی ہذیل، حدود تدمیر میں خصوصاً اُوری ہیولہ جا کر آباد ہوئے اور وہیں عزت و
شہرت پائی۔

بنی تیم جو مرۃ بن آدین طانجہ بن الیاس بن نصر کی اولاد میں سے ہیں، اُندلس میں
آ کر افراط سے بسے تھے۔ اس قبیلہ کے بعض لوگوں نے شہرت بھی پائی۔ مگر ابو طاہر جو
مقامات الملودنیہ کے مصنف تھے، بہت مشہور ہوئے۔

بنی جنبہ بھی اسی قبیلے کی ایک شاخ تھی مگر کم تعداد میں آباد تھے۔ بنو قیس، عیلان
میں بکثرت آباد تھے۔ ان میں بعض بنو سلمی کہلاتے تھے۔ بنو سلیم بن عکرمہ بن خصفہ
بن قیس، عیلان کی اولاد سے عبدالملک بن حبیب سلمی، حضرت امام مالک کے شاگرد
اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ قاضی ابو حفص بن عمر جو کبھی قرطبہ کے قاضی القضاۃ

تھے وہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ بھی اسپین
میں کافی نامور تھا۔ اس قبیلے کی ایک شاخ بنو خرم بھی تھی جس میں ابو محمد خرم الحافظ
الظاہری بہت بڑے محدث گزرے ہیں۔ حالانکہ وہ ایرانی النسل تھے۔

بنو ہوازن، اشبیلیہ کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ اس قبیلہ کی اور شاخیں بھی
تھیں، مثلاً کلابی، کلاب بن ربیعہ کی اولاد اور قسیری، قشیر بن کعب بن ربیعہ کی
اولاد۔ بلج بن بشر القشیری اسی شاخ سے متعلق تھے جو اُندلس کے والی 123ھ یا
124ھ میں رہے تھے۔

بنو ثقیف بھی یہاں آباد تھے۔ حجاج اسی قبیلہ کا گورنر کوفہ اور بصرہ تھا۔ یہ لوگ ابحر
بن عبدالرحمٰن الثقفی کے ہمراہ آئے تھے مگر اُندلس میں اِدھر اُدھر بس گئے۔

بنی ربیعہ اور اُن کی شاخیں بنو اسد علاقہ ابیرہ میں قرب غرناطہ آباد ہوئے۔ وادی
آش میں بھی اُن کی بستیاں تھیں۔

بنو بکر بن رائل، آدینہ اور سلطیش کے علاقہ میں بس کر رہ گئے۔ اُن میں ابو عبید
بکری مشہور مورخ اور جغرافیہ داں تھے۔ بنو ایاد، اشبیلیہ اور اُس کے گرد و نواح میں آباد
ہوئے۔ اس طرح عدنانیوں کی مختلف شاخیں اور مختلف قبیلے پورے اُندلس میں چھا
گئے اور اکثر نے کافی مرتبہ اور شہرت حاصل کی۔

اب قحطانی اور بربر اور افریقی قبائل باقی رہ گئے تو ان کی تقسیم اس طرح ہوئی۔

قحطان اور اُس کی اولاد زیادہ تر یمن میں آباد تھی۔ اس لئے قحطانیوں کو ''یمانیہ''
کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس قبیلے کی بھی متعدد شاخیں تھیں جن میں قابل ذکر:
1- بنو خزرج 2- بنو اوس 3- بنو ازد 4- غافق 5- ہمدان 6- مذحج 7- طے 8- مرہ
9- عاملہ 10- خولانی 11- معافر 12- لخم 13- جزام 14- کندہ 15- تجیب 16- حمیر
17- خثعم 18- ذی رُعین 19- ذی اصبح 20- محصب 21- ہوازن 22- قضاعہ
23- کلب 24- حضرموت اور سلامہ وحتب تھے۔

قحطان، جو کہلان کی اولاد ہونے کی وجہ سے خود کو کہلانی بھی کہتے تھے، اُندلس میں
بکثرت آباد ہوئے۔ اسی طرح بنی ازد بھی خاصی تعداد میں بسے ہوئے تھے۔ ان میں
سے بعض شہرت یافتہ بھی تھے۔ محمد بن مانی البیری مشہور شاعر تھے۔ احمد بن احمد ازدی

پایہ کے مورخ تھے۔ ازدی کی اولاد عنان نامی چشمے کی مناسبت سے جہاں وہ پہلے آباد تھے عنانی بھی کہلائے۔ یہ لوگ غرناطہ اور مالقہ کے قریب ایک شہر ماطہ میں آباد تھے۔

بنو خزرج اور اُوس، یہ مدینہ کے وہ دو قبیلے تھے جنہوں نے پیغمبر اسلام کو سب سے پہلے مدینہ میں پناہ دی۔ انہی لوگوں نے حضورؐ کو وہاں آنے کی دعوت بھی دی۔ اس قبیلے کے بہت سے بہ تعداد کثیر مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے اُندلس میں جا پہنچے۔ حتیٰ کہ بقول ابن سعید، مدینہ میں تو انصاری ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

یہ لوگ اطراف طلیطلہ میں بستیاں قائم کئے ہوئے تھے۔ خزرج قبیلے کے بزرگ صحابی سعد بن عبادہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد انصاریوں کی جانب خلافت کے لئے منتخب کئے گئے تھے، اُن کی اولاد میں سے بنو احمر تھے جو عرصہ تک غرناطہ پر حکومت کرتے رہے۔ وہاں 1232ء سے 1492ء تک اسی خاندان کا عمل دخل تھا۔

قبیلہ اُوس کی شاخ غافق تھی جو جین میں آباد تھی۔ اُن کی اولاد میں سے عبدالرحمٰن غافقی جو ذی الحج 102ھ سے صفر 103ھ اور 113ھ سے 114ھ تک امیر اندلس رہے۔ فرانس میں انہوں نے بڑے معرکے انجام دیئے اور آخر 114ھ میں جنگ پویٹرز میں شہید ہوئے۔ عبداللہ بن ابی الخصال بھی ایک مشہور شاعر تھے جن کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔

ہمدان کی نسبت سے بعض کیلانی خود کو ہمدانی کہتے تھے۔ غرناطہ سے سات میل کے فاصلہ پر اُن کی آبادی تھی۔ بنو اضحیٰ بھی اُسی کی ایک شاخ تھے۔

بنو مذحج، یمن کے رہنے والے تھے جو شاید وہاں کے ایک سرخ پہاڑ کا نام ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ زید بن کہلان کا بیٹا اُود تھا اور اُس کا بیٹا طے جس سے قبیلہ طے ہے۔ طے کی بیوی کا نام مذحج تھا۔ اس نسبت سے یہ قبیلہ بنو طے کہلایا۔ مرسیہ کے جنوب میں اُن کی بستیاں تھیں۔

مراد بن مالک کی اولاد بنو مراد کہلاتی تھی۔ انہوں نے اُندلس میں قرطبہ سے اشبیلیہ کے راستے پر ایک قلعہ بھی اپنے نام سے تعمیر کیا تھا جس کو ''مراد'' کہتے تھے۔ یہ لوگ کچھ دوسری جگہوں پر بھی آباد تھے۔

بنو سعید، عنس بن مالک کی اولاد سے تھے۔ غرناطہ کے قریب اپنے نام سے ایک قلعہ بنو سعید آباد کیا۔ ''کتاب المغرب'' بھی اسی قبیلے کے کسی فرد کی تصنیف ہے۔

خولانی اشبیلیہ اور جزیرۃ الخضر کے درمیان قلعہ خولان ہے جو اُنہی کا بنایا ہوا ہے یہ اسی میں بسے ہوئے تھے۔ غرناطہ کے معزز فرد عہد اسلام تک اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندانِ لخمی نے اُندلس میں کافی عزت پائی۔ سلاطینِ اشبیلیہ بنی عباد لخمی کی اولاد تھے اور بنو الباجی اور بنو وافد بھی ان میں سے ہی تھے جو اشبیلیہ کے باشکوہ حضرات میں سے تھے۔

بنو خرام، سرقسط میں آباد ہوئے اور وہیں حاکم مقرر ہوئے۔ اُن کے بہت سے قلعہ رباح (CALATRAVA) میں آباد تھے۔

بنو حمیر جو الیمنی بھی کہلاتے تھے، اُندلس میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ ابو عبداللہ ابن الخیاط نابینا شاعر اسی قبیلے کا فرد تھا۔

اصبحی جو اصبح یا ذی صبح سے مشتق تھا، وہ کہلان کی اولاد سے تھے اور اُن میں امام مالک بن انسؓ بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔ یہ لوگ قرطبہ اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے۔

یحصبی:۔ یہ قلعہ بنی سعید کے نزدیک آباد تھے۔ اسی وجہ سے یہ قلعہ یحصب بھی کہلاتا ہے۔

بنو قضاعہ:۔ مالک بن حمیر سے منسوب تھے۔ اسی قبیلے کے فرد ابو الخطار حاکم اُندلس اور عنبسہ بن شحیم بھی اسی قبیلے سے متعلق تھے۔

بنو خشین:۔ بنو فتوخ، بنو جعیہ، قرطبہ کے اطراف میں بس گئے اور خاندان بنو [illegible] اشبیلیہ میں اُن کا شمار ثقایانِ اشبیلیہ میں سے تھا۔

بنو کلب:۔ یہ جزیرہ الخضراء میں آباد تھے۔

بنو حضرموت:۔ یہ لوگ قرمونہ اور اشبیلیہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس کے علاوہ بنو [illegible] کے اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے قبیلے اور اُن کی شاخیں مختلف شہروں میں اقامت گزیں ہوئیں۔

بربر اور افریقی:۔ بربر سب سے پہلے اسپین میں داخل ہوئے۔ یہ افریقہ کے وحشی

اور جنگجو قبیلوں سے متعلق تھے اور عقبہ بن نافع کے افریقہ فتح کر لینے کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اندرون افریقہ کے کونے کونے سے کھنچ کر یہ اسپین پہنچے۔ نواتہ، ہوارہ اورغہ، الجیریا، مغرب الاوسط، مغرب الاقصیٰ اور ساحلی علاقوں سے چل کر پہلے یہ طارق کے ساتھ اور پھر اس کے بعد مستقل حدود اسپین میں داخل ہوتے رہے۔ اُنہوں نے شمالی اُندلس میں اپنی آبادیاں قائم کیں۔ چنانچہ براگا، برتھا اور شمالی اسپین میں استورگا سمورہ، لیدسمہ، طلنکہ، سبت مانکش، شقوبیہ وغیرہ جنوبی علاقوں میں جا کر آباد ہوئے مگر جب عیسائیوں نے وہاں زور پکڑا تو مجبوراً اُن کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ پھر یہ وسطی علاقہ میں کوریہ، ماردہ، بطلیوس میں پھیل گئے۔ یوسف بن تاشفین بھی بربر تھا۔

ابھی اُندلس میں فتوحات کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ 95 ہجری میں اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر کو آگے پیچھے دو فرمان بھیجے۔ ایک پروانہ مغیث رومی کے ہاتھ اور دوسرا قاصد ابوالنصر کے ہاتھ۔ ان دونوں میں اُنہیں فوراً دارالخلافہ دمشق واپس آنے کا فوری حکم دیا گیا اور موسیٰ بن نصیر نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اُندلس کا امیر مقرر کیا اور خود قیرواں روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد اُندلس میں پہلے امارت، پھر خلافت کا آغاز ہوا۔

اُندلس ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا۔ سارے ملک کا انتظام، پوری مملکت کی ازسرنو تنظیم ایسا معمولی کام نہ تھا کہ جسے آسانی سے انجام دیا جا سکتا۔ یہ صرف عبدالعزیز کا سلیقہ، اُن کی صلاحیت اور اُن کا جری حوصلہ تھا کہ اُنہوں نے سیاسی اور معاشرتی نظام کو اس خوبصورتی سے مستحکم کیا کہ مسلمانوں کے پنجے وہاں جم کر رہ گئے۔ گوتھک سلطنت کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔ عیسائی حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور اُنہی منہدم شدہ بنیادوں پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنا تھی جو مضبوط بھی ہو اور پائیدار بھی۔ اور واقعی ایک ایسی حکومت و عمارت قائم کی گئی جو کئی صدیوں تک ہر تھپیڑے کو سہتی رہی، ہر حملے کو برداشت کرتی رہی اور ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اُندلس کے اب بھی بہت سے ایسے شہر تھے جن پر قبضہ براہِ راست نہ تھا بلکہ وہ گورنروں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ اُن میں بعض گورنر اور بعض اہلیانِ شہر یہ سمجھتے ہوئے کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر جیسے جنرل تو واپس جا چکے ہیں اور اُن

ساتھ بہت فوج بھی، اس لئے اُنہوں نے اطاعت سے منہ موڑا اور فرمانبرداری حدود سے نکل گئے۔ عبدالعزیز کو اس کی اطلاع ملی تو اُس نے پہلے تو اس کی ...ی کی پھر فوراً فوج کو تیار کیا کہ باغیوں کی سرکوبی کی جائے اور اُنہیں اس دیدہ ...ی پر سزا بھی دی جائے۔

پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ موسیٰ بن نصیر کے سمجھدار اور لائق بیٹے امیر عبدالعزیز ... نظام حکومت قائم رکھنے کے لئے ایک مشاورتی کونسل بنا دی تھی۔ اس کمیٹی میں ...مند اور بیدار مغز لوگوں کو شامل کیا گیا تھا کہ وہ خزانہ کی آمدنی بڑھانے کے لئے ...ے وضع کریں اور اخراجات کے لئے اصول بنائیں۔ اگرچہ اب موسیٰ بن نصیر برسر ...ار نہیں رہے تھے مگر اُن کے اصول اور طریقے اب بھی رائج تھے اور حکومتی حکام ...کی روشنی میں حکومت کے معاملات حل کرتے تھے۔

امیر اُندلس عبدالعزیز نے شریعت سے واقف لوگوں کو منصف اور جج کے عہدے ...ئے تھے جو مقدمات سنتے اور شرعی اصولوں کے تحت فیصلے کرتے تھے۔ دوسرے ...ب کے لوگوں کو اگرچہ مکمل مذہبی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی مگر اُن پر ...انون کا احترام لازم قرار دیا گیا تھا۔ دیوانی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔ اگر کوئی ...ی معاملات کے عدالتوں کے فیصلے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تو اُسے ...اری عدالتوں کے سپرد کر دیا جاتا اور آخر کار اُسے واجب الادا رقم دینا پڑتی تھی۔

رعایا کی بہبود اور آسائش کی خاطر موسیٰ بن نصیر اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے ...عزیز نے حفظانِ صحت کی تمام تراکیب کو جاری اور ساری کیا۔ اُنہوں نے تعلیم ...بنوائیں، سرائے اور مسافر خانے تعمیر کرائے۔ تعجب اس بات پر نہیں کہ سب کچھ ...ل نے کیا، بلکہ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ سب کچھ صرف ایک سال کی قلیل ...یں ہو گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امیر عبدالعزیز جنہوں نے اپنے لائق ...ائق باپ موسیٰ بن نصیر سے نہ صرف پورا پورا سبق حاصل کیا بلکہ اُنہوں نے ایک ...ے مختصر عرصے میں وہ کر دکھایا جو دوسرے سالہا سال میں نہیں کر سکے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اُندلس کے امیر عبدالعزیز نے اُندلس کا نقشہ ایک ...مکمل تبدیل کر کے رکھ دیا تو یہ اُن کی ذاتی اہلیت کا نتیجہ تھا۔ آپ کا یہ خیال ایک

حد تک تو درست ہو سکتا ہے مگر ہم اسے کلی طور پر درست نہیں کہہ سکتے۔ یہ تسلیم کر
اُندلس کے امیر عبدالعزیز میں بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں، مگر اس کے ساتھ آپ کو
یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیر عبدالعزیز کی تمام صلاحیتیں اُس کے عظیم باپ موسیٰ بن
نصیر کی اعلیٰ تربیت اور اہلیت کا نتیجہ تھیں۔ خداوند تعالیٰ نے اُندلس کے پہلے امیر
عبدالعزیز کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اگر اُندلس پر قبضہ برقرار رکھنا ہے تو اپنے
باپ موسیٰ بن نصیر کے نقشِ قدم پر چل کر آگے بڑھو۔ کیونکہ اسی میں ہی تمہاری عظمت
اور کامیابی ہے۔

کسی کا قول ہے اور قولِ صادق ہے کہ:

"اللہ عزت دیتا ہے اور اللہ ہی ذلت دیتا ہے"

اللہ پاک نے موسیٰ بن نصیر اور اُس کے شاگردِ رشید طارق بن زیاد کو وہ عزت دی
کہ اُنہوں نے آبنائے جبرالٹر پار کر کے اُندلس (ہسپانیہ) کی زمین کو اپنے گھوڑوں کی
ٹاپوں سے روند ڈالا۔ یہ اُن کی فتوحات کا دور تھا اور یہ اُن کی عظمت کی نشانیاں تھیں
کہ کبھی وہ مشرق کا رُخ کرتے تو مغرب والے بھی کانپنے لگتے اور جب وہ شمال پر
یلغار کرتے تو جنوب کی آبادیاں بھی تھرتھرانے لگتیں۔

وہ بھی ایک وقت تھا کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی فوجیں ارغون
(ARAGON) کی سمت کوچ کر رہی تھیں۔ راستہ بہت خراب اور دُشوار تھا۔ ندیاں
بھی تھیں اور نالے بھی۔ میدان اور جنگل بھی، جہاں گرد بھی طوفان کی طرح اُڑا کرتی
تھی۔ مگر یہ دونوں سردارانِ لشکر اپنی فوجوں کے ساتھ ان دُشوار گزار راستوں کو طے
کرتے آخر ارغون کے دارالسلطنت سرقسط جا پہنچے۔ منزلیں طے کرنے کے لئے ہر گھڑ
سوار کو سامان کے ساتھ تانبہ کا ایک برتن دیا گیا جس سے کھانے اور پینے دونوں کا
کام لیا جاتا تھا۔ ایک چمڑے کی چھاگل پانی سے پُر اور ایک تھیلا کھانے پینے کی
چیزیں رکھنے کے لئے دیا گیا۔ پیادے بے چاروں کے پاس بس اُن کے ہتھیار تھے
تھے۔ سامان تمام کا تمام باربردار خچروں پر لدا ہوا تھا۔

سامان میں فوجی ضرورت کی ہر چیز ساتھ تھی مگر غرور اور کروفر نام کو بھی نہ تھا جو اتنی
دولت وحشمت حاصل ہونے کے بعد ہونا چاہئے تھا۔

کھیتیاں جلانا منع تھا، غیر سپاہیوں سے تعرض منع تھا، آگ لگانا، بستیاں جلانا، دنگا
خلاف قاعدہ تھا، مذہبی جذبات کا احساس رکھنے کی خاص ہدایت تھی، عورتوں پر
اور بچوں پر ظلم سخت ترین گناہ تھے، جو لوگ جنگ کے لئے آمادہ ہوں اُن سے
کوئی نرمی نہ کی جائے، جو مصالحت کے لئے کوشاں ہوں اُن کے لئے ہر ممکن
رعایت برتی گئی۔ یہی حکم تھا۔

مگر اہلیانِ ارغون پورے صوبے کو انتہائی محفوظ اور ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ عبور سمجھتے
ہوئے شرارت ہی پر آمادہ رہے۔ ہتھیار ڈالنے یا صلح کی جانب بڑھنے کی بجائے
بار بار ٹکرانے اور جنگ وجدل کرنے پر ہی تلے رہے۔

چنانچہ جنگ ہوئی، ہتھیار ٹکرائے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ نہ حفاظتی
تدابیر کام آئیں نہ نمائشی بہادری اور دلیری۔

چنانچہ زمینیں ضبط کر لی گئیں، جائیدادیں چھین لی گئیں اور اُن سب پر افریقیوں کو
بسایا گیا اور تمام شر پسند عناصر کو اُن کے ماتحت کر دیا گیا۔ شہریوں پر ٹیکس لگایا گیا جو
معقول تھا مگر پہلی مرتبہ۔ یہاں کے گورنر حسین بن عبداللہ نے ایک مسجد تعمیر کی جس
کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ان سب باتوں سے فرصت پا کر قلتونہ CATALONA
اور بلنسیہ VALENCIA پر چڑھائی کی گئی۔ انہوں نے معمولی مدافعت کے بعد
ہتھیار ڈال دیئے۔

یہاں بھی کھیتیوں کو تباہ نہیں کیا گیا، نہ بستیوں کو جلایا گیا۔ بلکہ وہاں بربر آباد کئے
گئے جنہوں نے یہاں کی عورتوں سے نکاح کئے اور گھر گرہستی جما کر بیٹھ گئے۔

اب ان دونوں سپہ سالاروں نے اپنا رُخ مغرب کی جانب موڑا اور انتہائی دُشوار
گزار، خاردار علاقوں سے گزر کر جلیقیہ (GALICIA) پہنچے اور پھر الیسٹریا میں۔ یہ
دونوں صوبے ایسے تھے جو اب بھی عیسائی حکمرانوں کا دم بھرتے تھے اور ابھی تک انہی
کے زیرِ اثر تھے۔ عیسائی مذہب کا اب بھی یہاں عروج تھا اور پادریوں کا بڑا اثر تھا۔

کوئی بادشاہ تو باقی نہ رہ گیا تھا مگر جہاں جہاں جو امیر تھا وہی حاکم بن بیٹھا تھا۔
راہیں اور راستے اس قدر دُشوار گزار تھے کہ میلوں کوئی آبادی کا پتہ نہ چلتا تھا۔ کہیں
پہاڑیاں تھیں تو کہیں چٹیل میدان، کہیں چھوٹی موٹی آبادی تو کہیں دُور تک آبادی کا

پتہ نہیں۔ یہ مسلمانوں ہی کا دل وجگرا تھا جو ان خطرناک راستوں، علاقوں سے بھی نہ گھبرائے، نہ ہمتیں ہاریں بلکہ منزلیں طے کرتے رہے اور ان خطرناک علاقوں کو فتح کرتے رہے۔

انجام کار ان فاتحین نے یہاں بھی ایک زبردست اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کی آبادیاں قائم کیں، اپنے گورنر مقرر کیے، محافظ فوج کے دستے چھوڑے، رعایا سے خراج بھی وصول کیا، اُنہیں اطاعت کا سبق بھی سکھایا۔ مگر یہ علاقے اُندلس کی حدِ آخر تھے۔ اس کے بعد اگر سامنے کچھ نظر آتا تھا تو پائیرنیس (PYERENECS) کی فلک بوس چوٹیاں جن میں اِکا دُکا درّے اور گھاٹیاں تھیں، ورنہ پہاڑ ہی پہاڑ۔ اور یہیں کھڑے ہو کر موسیٰ بن نصیر نے پورے یورپ کی فتح کا ایک عظیم الشان خاکہ تیار کیا۔

وہ پورے اُندلس کو روندتے چلے آئے تھے اور اب اپنے قدموں تلے حکومت فرانس کو بھی کچلنا چاہتے تھے جو اپنے رعب، دبدبہ، شان و شوکت میں اُندلس سے کم حیثیت اور اہمیت نہ رکھتی تھی۔

مورخین اختلاف رکھتے ہیں اس نظریہ سے کہ موسیٰ بن نصیر واقعی فرانس میں داخل ہوئے تھے کہ نہیں، اور اُنہوں نے فرانس کے کچھ علاقے فتح کئے اور اپنے مقبوضات قائم کئے۔

یہیں اُنہیں خلیفۃ المسلمین کا پروانۂ واپسی ملا اور اس کی تعمیل میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد دونوں کے وہ خواب ادھورے رہ گئے۔ ان خوابوں کے تانے بانے بکھر کر رہ گئے۔ طارق بن زیاد اس وقت ''استورگا'' میں تھے اور موسیٰ بن نصیر ''لیوگیو'' میں جب ایک برق رفتار نامہ بر ابو نصر اُن کے پاس اس حکم کے ساتھ پہنچا کہ مزید پیش قدمی کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ کہ دونوں سردار بارگاہِ خلافت میں حاضری دیں۔

حکم حاکم مرگِ مفاجات، موسیٰ بن نصیر جب طارق بن زیاد سے ملے تو بس اتنا ہی کہہ کر رہ گئے۔

''بیٹے! اب واپس چلنے ہی میں مصلحت ہے۔''

اشبیلیہ کو دارالسلطنت قرار دیا گیا، حکومت کی باگ ڈور عبدالعزیز پسر موسیٰ بن نصیر

رد کی گئی، پھر اُنہیں نشیب و فراز سمجھا کر اواخر 95ھ میں آبنائے جبرالٹر پار کر
سیٰ بن نصیر قیروان پہنچے اور وہاں سے دمشق جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

تمام مورخ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی ن سے واپسی ایک بڑی گہری سازش کا نتیجہ تھی۔ اس لئے کہ دارالخلافہ دمشق میں ایسا کام نہیں تھا جو موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے وہاں پہنچے بغیر نہیں ہو سکتا جس وقت ان سپہ سالاروں کو بلایا گیا اُس وقت بلند حوصلہ اور باہمت موسیٰ بن نے نہ جانے کون کون سی اسکیمیں سوچی اور ترتیب دی تھیں۔ خیال ہے کہ شاید نے پورے یورپ کو فتح کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا اور اس سلسلے میں اُس کے آگے بڑھ بھی چکے تھے۔

اس وقت طاقت کا توازن مسلمانوں اور خاص کر موسیٰ بن نصیر کے ہاتھ میں تھا۔ سیٰ، خلیفہ کے احکام کو کچھ عرصہ کے لئے معرضِ التوا میں رکھ کے اپنا لشکر یورپ ت میں ڈال دیتے تو امکان اس بات کا تھا کہ یورپ کی کوئی طاقت مسلمانوں برد آزما ہونے کی ہمت نہ کرتی۔ رشک اور حسد کی آگ افراد کو اتنا نقصان نہیں ی جتنا نقصان اس سے پوری قوم کو پہنچتا ہے۔ کاش دمشق میں بیٹھے ہوئے خود ت اور خودغرض لوگ یہ سوچ سکتے کہ اس موقع پر موسیٰ کی محاذ جنگ سے واپسی خود انوں کے لئے کس قدر مضرت رساں ہے۔ کاش خلیفہ ولدی بن عبدالملک کے بھرنے والے، ان جری حوصلہ سپہ سالاروں کے خلاف زہر اُگلنے والے یہ سوچ کہ اگر غرور اور فتح مندی سے سرشار ہو کر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد باغی ہو جاتے اور آزاد حکومت کی بنیاد ڈال بھی لیتے تو آخر وہ بھی تو مسلمانوں ہی کی ت ہوتی اور یہود اور نصاریٰ سے بہرصورت لاکھ درجے بہتر ہوتی۔

گر ــــــ مگر تنگ نظری اور بغض و عناد ایسے مسئلوں کو صحیح روشنی میں دیکھنے کا نہ ہے اور نہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ یہ بات سوچ سکے ہوتے تو یورپ اور وہاں کی دوسرے ملکوں کی وہ تاریخ نہ ہوتی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کہنے نے اتنا کچھ کہا اور کان بھرنے والوں نے اتنے کان بھرے کہ خلیفہ ولید بن لک نے بغیر سوچے سمجھے اُنہیں واپسی کا پروانہ بجھوا دیا۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی فوری

تعمیل کا حکم بھی دیا۔ موسیٰ بن نصیر چاہتے تو اس حکم کی خلاف ورزی کر سکتے تھے۔ مگر وہ ایک سچے، وفادار اور صلح پسند انسان تھے۔ وہ نمک حرام نہیں بلکہ نمک حلال تھے۔ پھر اُنہیں یقین ہو گیا کہ خلیفہ نے یہ حکم بغیر صحیح حالات معلوم کئے جاری کیا ہے اس لئے کہ خلیفہ کے لئے مشہور تھا کہ وہ کانوں کے بہت کچے ہیں۔

پس موسیٰ بن نصیر نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اپنی نیک نیتی اور شرافت سے منہ نہ موڑا اور یہی فیصلہ کیا کہ شرافت کا تقاضہ یہی ہے کہ جو کچھ ہو اور جس طرح بھی ہو، اس کی بہر صورت تعمیل کی جائے۔ اور اُنہوں نے فوری واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُنہوں نے اشبیلیہ کو مستقر بنا کر ہر طرف ہدایات بھجوا دیں کہ جن جن راستوں سے سپہ سالاران لشکر اسلام گزریں، وہاں وہاں کے حاکم مع اپنی فوج کے اُنہیں سلامی دیں اور فوج کا کچھ حصہ ساتھ بھی بھیجیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے لشکر اسلام کی شہرت و عظمت کی حقیقی نمائش مقصود تھی جو اُس دور میں ہر سالارِ لشکر کو کرنی پڑتی تھی۔

پس گوتھ قوم کے سرداران، مارٹیبا کے عظیم الشان حکام اس مردِ جری کے جلوس میں محافظین، خراج گزار اور خدام کی حیثیت سے ہمرکاب ہوئے۔ بے اندازہ اور بے شمار اموال اور خزائن قطار در قطار اُونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ اس سامان میں کیا کچھ شامل نہ تھا۔ زرّہ بکتر بھی تھے اور تلواریں بھی۔ ہتھیار بھی تھے اور زینت کی اشیاء بھی۔ زیورات اور زرق برق لبادے بھی، خوبصورت لباس بھی، خود وہ اُونٹ جن پر سامان بار کیا گیا تھا وہ اسی قدر سجائے گئے تھے جیسے وہ بھی مالِ غنیمت کا بڑا حصہ ہوں۔ پھر تیس سے زائد گاڑیوں پر بیش قیمت جواہرات، نادر و نایاب پتھر، سونا، چاندی، زرنگار کپڑے، تکلفات کے جملہ سامان کہ ہر چیز اُن میں بہت قیمتی تھی۔ جسمانی آرائش و زیبائش اور تفخر کی صدہا اشیاء جو نہ عربوں کی نظروں سے کبھی گزریں اور نہ آئندہ گزرنے کا امکان تھا۔

ان کے علاوہ تیس ہزار سے زیادہ (بقول اسکاٹ) لاکھوں کی تعداد میں ملازم اور کنیزیں تھیں جو نازک اندام بھی تھیں اور خوش جمال بھی۔ یہ کہنے کو تو کنیزیں تھیں مگر اصل میں تھیں شہزادیاں، نواب زادیاں، اُمراء کی صاحبزادیاں۔ اُن کی رگوں میں شاہی خون گردش کر رہا تھا۔ اُن کے چہروں پر شرافت اور لجاجت کے آثار اس حد تک

نمایاں تھے کہ تابناکی اور تابندگی پیدا ہو گئی تھی۔ معمولی آنکھیں اُن کے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر اس وقت غلامی کا جوا کاندھے پر رکھے، سنہری زنجیریں گلے میں پڑی ہوئی، اپنے حسن اور اپنے مرتبے دونوں کا ماتم کر رہی تھیں۔ یہ سب وہ تھیں جن کا حسن اسپین بھر میں انتخاب تھا۔ جن کا شباب مثالی تھا۔ چار سو افراد ایسے تھے جو خاندانِ گاتھ کے چشم و چراغ تھے، جن کی رگوں میں صدیوں سے شاہی خون رواں دواں تھا، جن کی پشت در پشت صرف حکومت کرنے کی عادی رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے چوغے پہنے ہوئے تھے اور اُن کے گلوں میں سنہری گلوبند تھے جو حقیقت میں طوقِ غلامی کے ذرا مہذب بدل تھے۔ ان کے علاوہ قربان گاہوں کے مرصع بجواہر برتن، عود دان اور ان کے علاوہ سینکڑوں ایسی نایاب چیزیں تھیں جو گوتھک اور بازنطینی سلطنت کی نادر اور نایاب چیزیں تھیں جن کی چکاچوند دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کرتی تھیں۔ اُن کے پیچھے معززین عرب تھے، قریش تھے، عمائدین صوبہ افریقہ تھے اور پھر اُن سب کے پیچھے نامور افسرانِ فوج جو موسیٰ بن نصیر کے اِردگرد ہالہ کے مانند چل رہے تھے۔ پھر سب کے پیچھے تقریباً ایک لاکھ معمولی حیثیت کے انسان جو سچ مچ غلام بنائے گئے تھے، سروں پر سامان اور بوجھ لادے جلوس کی عظمت میں اور زیادہ اضافہ کر رہے تھے۔ وہ 96ھ تھی۔ موسیٰ بن نصیر قیرواں سے تزک و احتشام کے ساتھ دمشق کے لئے روانہ ہوئے۔

عجیب بات یہ تھی کہ موسیٰ بن نصیر کسی جگہ بعد میں پہنچتے مگر اُن کی آمد کی خبر اور اُن کے جلوس کے افسانے ہر جگہ پہلے پہنچ جاتے۔ خانہ بدوش، باشندگانِ شہر، صحرا نشین اور اہالیانِ ساحل سب کے سب بے انتہا اشتیاق سے جمع ہو کر اس پُر شکوہ جلوس کا نظارہ کرنے نکل آتے۔ کبھی اُنہیں اپنی قوتِ بصارت پر دھوکہ ہوتا، کبھی اپنے شعور پر۔ آنکھوں سے دیکھتے اور دل ہی دل میں عش عش کرتے تھے۔ اُن کی زبانوں سے تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

مغیث الرومی اس جلوس کے ہمراہ تھا۔ موسیٰ نے چاہا کہ وہ بھی بحیثیت غلام خلیفہ کے سامنے پیش ہو۔ مغیث کی خدمات دیکھتے ہوئے یہ اُس کی سخت بے عزتی تھی۔ وہ قرطبہ کا فاتح تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے "آریوہیلہ" میں نصرت حاصل کی تھی۔ وہ

طارق کے ساتھ ہر موقع پر جانبازی اور جانفشانی کا ثبوت دے چکا تھا۔ مگر اُس کا انکار اُس کی موت کا باعث ہوا۔ مگر فوج موسیٰ بن نصیر سے کچھ اور بد دل ہو گئی۔ فوج کو طارق کے ساتھ ہی سلوک ناگوار گزرا تھا، اب مغیث کا قتل تو سونے پر سہاگہ تھا۔

جب یہ جلوس قاہرہ میں داخل ہوا تو آدمیوں کا ایک انبوہ کثیر تھا۔ انسانوں کا اتنا بڑا مجمع پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر تھے۔ ایک کونے سے تھالی پھینکی جائے تو سر ہی سر سے ہوتی میلوں کا فاصلہ طے کرتی دوسرے کونے میں پہنچتی۔ ساحل نیل پر تو اتنے آدمی جمع ہو گئے کہ راستہ ہی بند ہو گیا۔ یہ شان و شوکت جہاں دوسروں کو مرعوب کر رہی تھی وہاں خود موسیٰ بن نصیر میں غرور اور تکبر کے جذبات پیدا کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ وہ بے جا خوشامد اور جھوٹی چاپلوسی سے اس قدر خوش اور نازاں نظر آ رہے تھے کہ بیان سے باہر۔ اور اس خوشامد ہی کا نتیجہ تھا کہ موسیٰ بن نصیر آپے میں نہ رہے اور مغرور ہو گئے۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک اس وقت صاحب فراش تھا۔ جب موسیٰ شام میں پہنچے تو ولید بن عبدالملک کے آخری ایام تھے اور اُن کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ سلیمان بن عبدالملک کو جو خلیفہ ولید کے بھائی تھے، خلافت کا اعزاز ملے گا۔ پس جب سلیمان بن عبدالملک کو موسیٰ بن نصیر کے اپنے ساتھ بے پناہ ساز و سامان لانے کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنے غلام کے ہاتھوں موسیٰ بن نصیر کو پیغام بھیجا کہ اگر موسیٰ توقف کریں (یعنی ولید کی موت تک انتظار کریں اور حیلہ بہانہ بناتے ہوئے کچھ دنوں بعد یعنی ولید کی موت کے بعد) دمشق میں وارد ہوں تو مناسب ہو گا۔

یہ لالچ اور خود غرضی کی انتہا تھی۔ ایک بھائی بستر مرگ پر آخری سانسیں لے رہا تھا اور دوسرا بھائی (سلیمان) موسیٰ بن نصیر کو پیغام بھیج رہا تھا کہ وہ ولید بن عبدالملک کی موت کا انتظار کرے اور اُس کے مرنے پر دمشق میں داخل ہو تو بہتر ہو گا۔ یعنی موسیٰ بن نصیر کا لایا ہوا تمام ساز و سامان ولید بن عبدالملک کی بجائے نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے حصہ میں آئے۔ مگر شاید خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰ بن نصیر نے اپنی رفتار کم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر اُن کے دل میں غداری یا بے ایمانی کا جذبہ ہوتا تو وہ سلیمان کے پیغام یا حکم پر توجہ دیتے اور ویسا ہی

کرتے جو وقت کا تقاضہ تھا اور جو کچھ درباروں میں ہوتا تھا۔

مگر موسیٰ بن نصیر نے مصلحت وقت سے منہ موڑ لیا اور نیک شعاری کا ثبوت دیا اور سلیمان بن عبدالملک کے مشورے یا درخواست کا یہ جواب دیا۔

''میں اپنی طرف سے غداری یا بے ایمانی کا روادار نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر میرے پہنچتے پہنچتے ولید جاں بحق ہو گئے تو یہ سارے کے سارے تحفے تحائف میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔''

موسیٰ بن نصیر کا جواب درست تھا، مگر مصلحت وقت کے خلاف۔ کیونکہ خلیفہ بن ولید عبدالملک نے اُن کے ساتھ کوئی نیک یا ایمانداری کا رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ولید بن عبدالملک نے محض شبہ کی بناء پر اُن کو اُندلس سے بلوا بھیجا تھا اور جس نے صرف سکھانے بھڑکانے پر اُن کے خلاف ہر الزام کو صحیح جانا تھا۔ ولید بن عبدالملک نے اُن کے خلاف خطبوں میں تحقیر آمیز الفاظ استعمال کروائے تھے اور اُن پر بیزاری کا اعلان کرانے کا حکم دیا تھا۔ مگر موسیٰ بن نصیر واقعی ایک نیک دل اور سچے انسان تھے اور حق پرتی کو اپنا شیوہ سمجھتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے ایمان کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ہونے والے خلیفہ کو صاف کہلوا دیا کہ وہ بے ایمانی نہیں کر سکتے۔

پھر قارئین کرام! آپ نے دیکھا کہ ولید بن عبدالملک کے مرنے پر جب سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اُس نے سب سے پہلے موسیٰ بن نصیر سے بدلہ لیا اور اُن کی سرِعام تحقیر کرائی۔ اُنہیں اُن کے عہدے سے برخاست کر دیا اور اُن پر لاکھوں روپے کی خیانت کا الزام لگایا۔



موسیٰ بن نصیر کی واپسی:

بلادِ مغرب میں موسیٰ بن نصیر، طنجہ کی حدود تک جا پہنچے۔ لیکن اس کے آگے جانے کا خیال انہوں نے ترک کیا اور افریقہ کی طرف واپس ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے غلام طارق بن زیاد کو ارضِ طنجہ اور گرد و نواح کے علاقوں کا والی بنا دیا۔

اس وقت طارق بن زیاد کا نام پہلی مرتبہ اس سلسلہ میں آیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ قابل فخر اور قابل احترام ہستی ہے جس نے اسلامی فتوحات کو اندلس (ہسپانیہ) کی سرزمین تک پہنچایا تھا۔ افریقہ کی طرف واپس ہوتے ہوئے موسیٰ بن نصیر نے تمام مفتوحہ علاقوں میں تعلیم کے لئے درسگاہوں کی بنیاد رکھی۔ وہ دراصل مسلمانوں کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ان کا اس جنگ اور فتوحات کا مقصد صرف سیم و زر جمع کرنا نہیں بلکہ مفتوح اقوام کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا اور اُنہیں دینِ حق کا رستہ دکھانا ہے۔

کیونکہ موسیٰ بن نصیر نے تعلیم کی اہمیت صحابہ کرامؓ سے سیکھی تھی جن کی رفاقت میں انہیں مدتوں فیض یاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ لہٰذا وہ ہمہ تن اشاعت تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔

جن علاقوں میں بتوں کی خدائی کا دور دورہ تھا یا جہاں کاہنوں نے مسند سنبھال رکھی تھی، موسیٰ بن نصیر نے وہاں حسن اخلاق سے دعوت اسلام پیش کی اور ہزاروں کافر اُن کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے۔ اس سلسلے میں موسیٰ بن نصیر نے عرب سے سینکڑوں جید علماء کو بلا کر اُنہیں بربر کے علاقوں میں روانہ کیا تاکہ بربری علاقوں والے قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیم سے فیض یاب ہوں اور وہاں کے باشندے اسلامی رسوم و آداب سے بہرہ ور ہو کر نیک اعمال کی عادت ڈالیں۔

موسیٰ بن نصیر، افریقہ میں عیش و آرام کے لئے نہیں واپس آئے تھے۔ بلکہ ان کا نصب العین یہ تھا کہ دارالولایت میں رہ کر جہاں اس وسیع اور عریض ملک میں نظم و ضبط قائم کیا جائے وہاں اس ملک میں اسلامی علوم کا ایک عظیم ادارہ بھی قائم کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مردِ مجاہد نے اپنے ان نیک ارادوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا۔

وہاں کے لوگ اللہ اور رسولؐ کے نام، سے بھی ناواقف تھے۔ موسیٰ بن نصیر نے افریقی علاقوں میں اسلامی سکوں کی صنعت کا رواج ڈالا جس میں تانبے اور دوسری دھاتوں کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ رومی سکے کو جو اس وقت وہاں رائج تھا، ختم کر دیا گیا۔ نئے سکے سے لین دین کی بہت سی اُلجھنیں دُور ہو گئیں۔

افریقی علاقوں میں اسلامی ملکوں کی صنعت اس عرب مجاہد کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔ سکوں پر اللہ کا نام اور رسول کریمؐ کا اسم مبارک کندہ کیا جانے لگا۔ اس سے قبل رومی سکوں پر سرداروں کے نام سکوک ہوا کرتے تھے۔

افریقہ کا انتظام مکمل کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر کی نظریں بحر روم کی وسعتوں پر مرکوز ہو گئیں۔ زمین کا کوئی کنارہ موسیٰ بن نصیر کی ہمت سے بلند نہ تھا۔ بلکہ وہ تو بحر روم کے تلاطم امواج سے پار، دُور بہت ہی دُور تک اسلامی پرچم کو لہرانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ پس اُس نے جزیرہ میورقہ کی طرف جو بلادِ اُندلس کے مشرق میں واقع ہے، اپنے بیٹے عبداللہ کی سرکردگی میں ایک فوجی مہم روانہ کی اور عبداللہ اس مہم سے کامیاب اور کامران ہو کر لوٹا۔ وہ اپنے بہت سے اموال اور غنائم لایا۔

اس بحری مہم سے آئندہ کے لئے ایک ایسا دروازہ کھل گیا جسے بند کرنے کے لئے براعظم یورپ کی مضبوط ترین افواج بھی بے بس ہو کر رہ گئیں اور خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

بلند ہمت اور بہادر لوگ مصائب میں گھرے رہتے ہیں تاکہ ان کے صبر کا امتحان لیا جائے کہ اُن میں ہمت و جرأت اور استقلال کا کتنا مادہ موجود ہے۔ پس ہمارے اس بہادر یعنی موسیٰ بن نصیر کو بھی ان مراحل سے گزرنا پڑا۔

براعظم افریقہ کے بہت سے شہر جنگ و جدل اور لوٹ مار کی نذر ہو گئے تھے۔ ہر

طرف ویرانی اور بربادی کے آثار نمایاں تھے۔ پورے علاقے کو قحط نے آ دبوچا تھا۔ اجناس کی گرانی اور کمیابی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لوگوں نے صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ انہیں دن رات صرف یہ فکر رہتی تھی کہ پیٹ کی آگ کو کس طرح بجھایا جائے؟ ہر شخص قوت لایموت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ لوگوں کی پریشانی اور اضطراب قیامت کا منظر پیش کر رہے تھے۔

یہ مرحلہ موسیٰ بن نصیر کے لئے بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا۔ وہ کرتے تو کیا کرتے۔ اشیائے خوردنی کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہوگئی تھیں۔ لوگوں کی چیخ و پکار اور آہ و فغاں سے دل پارہ پارہ ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی موسیٰ بن نصیر کو یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ وہ کل کو خدا کو کیا جواب دیں گے؟ کیونکہ رعیّت کے بارے میں اُن سے ضرور سوال ہو گا۔ اُنہوں نے فوراً فیصلہ کیا کہ اس مصیبت کے تدارک کے لئے تمام ممکنہ ذرائع کو کام میں لایا جائے تاکہ مصائب اور حوادث کے بادل ملک پر سے چھٹ جائیں۔

آخر موسیٰ بن نصیر نے عوام کو صوم و صلوٰۃ اور بارگاہِ الٰہی میں التجا کرنے کی درخواست کی۔ پھر ایک دن موسیٰ بن نصیر تمام لوگوں کو ساتھ لے کر تپتے ہوئے صحرا میں نمازِ استسقاء کے لئے نکلے۔ ان میں بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین تک شامل تھیں۔ لوگوں نے اپنے مویشیوں کو بھی بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے لئے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ اس طرح یہ بے زبان بھی ان کے ساتھ التجاؤں میں شریک تھے۔

پس اللہ تعالیٰ کے حضور انسان اور جانور سب ہی حاضر ہوئے۔ موسیٰ بن نصیر نے خطبہ پڑھا مگر خطبہ میں خلیفہ کا نام نظر انداز کر دیا۔ پچھلی صفوں سے ایک آواز بلند ہوئی۔

''موسیٰ! آپ نے خطبہ میں امیر المومنین (خلیفہ) کے لئے کیوں دُعا نہیں کی؟''

موسیٰ بن نصیر نے جواب دیا۔

''ایسے مواقع پر اللہ کریم کے ذکر کے ساتھ کسی دوسرے کا نام لینا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ موقع صرف اسی ایک ذات کریم کو مخاطب کرنے اور پکارنے کا ہے۔''

چنانچہ اللہ پاک نے اپنے مخلص بندوں کی دُعا کو قبول فرمایا اور اسی وقت بارانِ رحمت کی جھڑی لگ گئی۔ انسان، حیوان سب بارانِ رحمت سے فیض یاب ہوئے اور ساری زمین گل و گلزار بن گئی۔ گرانی رخصت ہوئی اور ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہو

گئی۔

سرزمین اُندلس:

عربوں کی فتح سے پہلے سرزمین اُندلس قوم ''قوط'' کا مسکن تھی جنہوں نے رومیوں کو پسپا کر کے قبضہ جما لیا تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں اس قوم نے روما کا محاصرہ بھی کیا تھا اور طلیطلہ کو دارالحکومت بنا کر مستقل حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ بعد میں اُن کا دارالحکومت قرطبہ، اشبیلیہ اور ماروہ کے شہروں میں منتقل ہوتا رہا۔

مسلمانوں کے زمانہ میں اُندلس کا آخری قوطی حکمران غیطشہ تھا جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا اور تخت و تاج اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ جب غیطشہ راہی ملک عدم ہوا تو اُس کی اولاد صغر سنی کی وجہ سے حکومت کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے قابل نہ تھی۔

آہو چشم فلورا:

بلاد مغرب کے مقابل یورپ کی حدود میں ایک علاقہ ہے جس کے تین اطراف میں پانی اور چوتھی سمت برفات یا برانس کا کوہستانی سلسلہ ہے جو فرانس اور اس علاقے کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اس جزیرہ نما کی وسیع سرزمین ایبیریا کے نام سے مشہور ہے۔ آج یہاں اسپین اور پرتگال کی حکومتیں قائم ہیں۔ عربوں نے اس سرزمین کو اُندلس کا نام دیا۔ شاید یہ نام اُس قوم کی وجہ سے مشہور ہوگیا جو عہد قدیم سے اس سرزمین پر آباد تھی۔ یا پھر فراندلس کی بناء پر جو پانچ سو سال ق۔م پیش قدمی کرتے ہوئے جبل طارق کی گھاٹی تک آ پہنچے تھے۔

بہرحال یہ لفظ عربی النسل نہیں ہے۔ کیونکہ عربوں کے یہاں اسلام سے پہلے یہ لفظ استعمال میں نہیں تھا۔ عربوں کی فتح سے پہلے سرزمین اندلس میں قوم ''قوط'' آباد تھی جنہوں نے رومیوں کو شکست دے کر اس سرزمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں قوم نے روما کا محاصرہ بھی کیا تھا اور طلیطلہ کو دارالحکومت بنا کر مستقل حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ بعد میں ان کا دارالحکومت قرطبہ، اشبیلیہ اور ماروہ کے

شہروں میں منتقل ہوتا رہا۔

موسیٰ بن نصیر کے زمانہ میں اندلس کا حکمران غیطشہ قوطی تھا جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا اور یہ تخت و تاج اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ جب غیطشہ مرا تو اس کی اولاد صغیر سنی کی وجہ سے حکومت کا بارِ گراں اٹھانے سے مجبور و معذور تھی۔ درباریوں میں ایک شخص غیطشہ کے خاص مقربین میں تھا۔ غیطشہ کی نظروں میں اس کی بہت قدر و منزلت تھی۔ مگر وہ اندر سے بہت حریص اور لالچی تھا۔ شاہ کی موت اور بچوں کی صغیر سنی کو غنیمت جان کر اُس نے رعیّت کے بدمعاشوں کو اپنے ساتھ ملایا اور عنانِ حکومت بچوں کے ہاتھ سے چھین کر اس حریص اور لالچی انسان کے ہاتھوں میں دے دی۔ اس شخص کا نام لرزیق، ارزیق یا راڈرک تھا۔

اس طرح وہ شخص سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اُس کی رگوں میں شاہی خون نہیں تھا اور نہ وہ قوم قوط سے تعلق رکھتا تھا۔ اس وجہ سے اندلس کے شرفاء اور عوام اُسے غاصب اور چور سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ لرزیق حسن سیرت سے بھی عاری تھا۔ ایک تو اُس نے تخت و تاج فریب سے حاصل کیا تھا پھر اُس نے شاہانِ اُندلس کے اخلاق کو سلام کر کے عیش و عشرت کا بازار گرم کر دیا۔ اُس نے غیطشہ کی اولاد سے تاج تخت چھیننے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے اپنے مخلص دوست اور ساتھی یولیان (جولین) سے بھی ہتک آمیز سلوک کر کے اُس سے دشمنی پیدا کر لی۔ یولیان یا نواب جولین، لرزیق یا راڈرک کی طرف سے ریاست سبتہ کا عامل (گورنر) تھا۔ یہ علاقہ افریقی کنارے پر جبل الطارق کی جانب واقع ہے۔ ان دنوں سبتہ افریقی سردار تھا جو شاہ اُندلس کے ماتحت تھا۔ شاہ قوط کا نائب وہاں کا مالک ہوتا تھا۔ وہ اکثر وہیں قیام پذیر رہتا اور گاہے گاہے اُندلس کے دارالحکومت میں حاضر ہو کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرتا تھا۔

اندلس اور سبتہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ ساحل یورپ اور افریقہ کے قریب قریب تھے۔ یہیں وہ تنگ گھاٹی ہے جو خلیج جبل الطارق کے نام سے مشہور ہے۔ اس گھاٹی کے مقابل افریقی سرزمین میں سبتہ اور طنجہ کے شہر آباد تھے۔

طلیطلہ کے شاہی محلات میں لرزیق شاہانہ زندگی بسر کرنے اور خود کو اندلس کے

حکمرانوں کا قائد اور سردار تصور کرنے لگا۔ شرفاء اور اُمراء کی اولاد کے لئے شاہی محلات کے دروازے کھلے تھے۔ اُمراء اپنی اولاد کو شاہی دربار میں بھیج دیتے تا کہ وہ شاہانہ فضا میں پروان چڑھیں اور عمدہ ماحول میں نشوونما پا کر اپنے خاندان کے لئے باعث افتخار بنیں۔

اس شاہی ماحول میں اُمراء کی لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے رہا کرتے تھے تا کہ آپس میں ربط و ضبط بڑھے۔ اندلسی بادشاہوں کا یہ دستور اشراف اور ارکان میں یگانگت اور شاہ پرستی کے جذبات کو تقویت دیتا تھا اور لڑکے اور لڑکیاں آغاز عمری سے بادشاہ کے مطیع اور تابعدار ہونے کے عادی ہو جاتے تھے اور دشمن کے حملے کے وقت یکجان دو قالب ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے تھے۔

اس طرح شاہانِ اُندلس اپنے اشراف سے بہت عمدہ سلوک کرتے تھے اور ان کے تمام مصارف خود برداشت کرتے اور اُمراء کی لڑکیوں کو اُن کی عروس کے موقع پر گراں بہا تحائف جہیز کے طور پر دیتے تھے۔ ان خصوصی عنایات کی بناء پر اشراف کے دلوں میں شاہانِ وقت کے متعلق اطاعت اور وفاداری کے جذبات پروان چڑھتے اور وہ بڑے شوق سے اپنی اولاد کو محلات کی وسعتوں اور رنگینیوں میں تعلیم و تربیت کے لئے روانہ کرتے۔

حاکم سبتہ نواب جولین (یولیان) کی ایک بیٹی تھی جس کا نام فلورا تھا۔ وہ بہت ہی حسین و جمیل تھی۔ اُس کی نظروں میں بلا کا جادو تھا۔ زبان میں دلوں کو موہ لینے والی شیرینی تھی۔ وہ بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے محسوس ہوتے۔

چنانچہ نواب جولین نے بھی فلورا کو دوسری لڑکیوں کی طرح دربارِ اُندلس میں بھیج دیا۔ فلورا عفت اور شرافت کا ایک ایسا معصوم مجسمہ تھا جس کی طرف حریص نظریں اٹھنے کی جرأت نہ کر سکتی تھیں۔ مگر اُس معصوم ہستی کو کیا معلوم کہ کسی کی دزدیدہ نظریں اُس کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور یہ نظریں اندلس کے شاہ لرزیق یا راڈرک کی تھیں جو اس حقیقت کو بھول چکا تھا کہ شرفاء کی ودیعت کردہ عفت اور عصمت کی کس طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو ہوا سو ہوا، فلورا کا آبگینہ عصمت چور چور ہو گیا۔ اُس نے ایک خط کے ذریعہ اپنے والد کو تمام حالات لکھ

بھیجے۔ اُس نے باپ کو مطلع کر دیا کہ ظالم لرزیق (راڈرک) نے شرافت اور نجابت کے اصولوں کو کس دیدہ دلیری سے پامال کر دیا ہے۔

بولیان (نواب جولین) نے بیٹی کا خط خوشی خوشی کھولا مگر جب عزت اور عصمت کی تباہی اور بربادی کی خبر پڑھی تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ غیرت اور حمیت سے اُس کا خون کھول اٹھا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور وہ غیظ و غضب کی آگ میں جلتے ہوئے چلایا۔

"دین مسیح کی قسم! میں اُس فاسق اور فاجر کو ضرور کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ اس کی سلطنت اور تخت و تاج کو ملیا میٹ کر دوں گا اور اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

ان حالات میں نواب جولین، سبتہ میں خاموش نہ بیٹھ سکا۔ اُس نے سفر کے لئے ایک عمدہ جہاز منتخب کیا جو ساحل اندلس اور افریقہ کے درمیان آمد و رفت کے کام آتا تھا۔

یہ سمندر میں طوفان کا موسم تھا۔ تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں، مگر نواب جولین کے دل میں آتش انتقام اس شدت سے شعلہ زن تھی کہ وہ موسم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فوراً چل پڑا۔

فتوحات اُندلس سے پہلے بھی اہل اُندلس میں شرافت و عزت کا احساس بیدار تھا۔ ہاں اسلام کے ورود نے غیرت کے ان جذبات میں چار چاند لگا دیئے۔ بربر کی آمد رفت اور میل جول سے اہل اندلس نے غیرت اور حمیت کا جذبہ حاصل کرلیا تھا جو نسل در نسل ان میں محفوظ چلا آتا تھا۔ چنانچہ نواب جولین اس طوفانی موسم میں جہاز پر سوار ہو کر دارالحکومت طلیطلہ پہنچ گیا جہاں اس کی معصوم بیٹی موجود تھی اور جہاں تخت و تاج کا غاصب موجود تھا۔

دربان نے شاہ کو نواب جولین کے آنے کی اطلاع دی اور کمرۂ استقبالیہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔

شاہ راڈرک (لرزیق) نے چھوٹتے ہی نواب جولین سے سوال کیا۔

"کیا ملک کے حالات معمول کے مطابق ہیں؟"

نواب جولین کا بدن غصے اور غم سے آگ کی طرح تپ رہا تھا مگر اُس نے خود پر قابو حاصل کیا۔ کیونکہ ابھی تو اُسے انتقام لینا تھا۔ پس اُس نے شاہ کو بہلانے کے لئے کہا۔

"ملک کے حالات بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مگر میری بیوی بہت سخت بیمار ہے۔ اُس کا آخری وقت ہے اور وہ فلورا کو ایک نظر دیکھنے کی خواہشمند ہے۔"

نواب نے اس قدر لجاجت سے کہا تھا کہ شاہ کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکا اور اُس نے فلورا کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ کو یقین ہو گیا کہ جولین کو کسی قسم کا شبہ نہیں۔ لیکن اُس وقت نواب جولین کے دل کا جو حال تھا اُسے کوئی اور نہیں جان سکتا تھا۔

پس شاہ لرزیق (راڈرک) نے فلورا کو رخصت کرتے وقت شاہانہ حیثیت کے مطابق باپ بیٹی دونوں کو بیش بہا تحائف سے نوازا اور انہیں خوشی خوشی رخصت کر دیا۔ باپ بیٹی دونوں چل پڑے۔ باپ اپنے دل میں جذبات کا ایک طوفان لئے ہوئے تھا جس کا اُس نے دوسروں کو قطعی کوئی احساس نہ ہونے دیا۔ مگر اُس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ انتقام لینے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہ کرے گا۔

اب ہم بلاد مغرب میں سمندر کے افریقی ساحل پر کھڑے ہیں۔ وہ دیکھو، ایک جہاز فلورا اور نواب جولین کو لے کر ساحل کی قدم بوسی کرتا نظر آ رہا ہے۔ سبتہ اور گرد و نواح میں عربوں کا اکثر گزر ہوتا۔ نیز موسیٰ بن نصیر نے عرب علماء کو اشاعت اسلام کے لئے دُور دراز مقامات تک پھیلا دیا تھا۔

ایک دن نواب جولین کسی کام سے محل سے نکلا۔ راستے میں ایک مسلمان سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اُس کے خدوخال بتا رہے تھے کہ یہ شخص بربری نہیں بلکہ عرب قوم کا ایک فرد ہے۔ اگرچہ اسلامی روح اور رسم و رواج کے بعد عرب اور بربری رنگ اخوت اور مساوات میں رنگے جاتے ہیں۔ وہ پہلے بھی فضائل نفس اور مکارم اخلاق سے۔ جو بدوی زندگی میں میراث سمجھے جاتے ہیں اور شہری زندگی کے تکلفات سے بالکل بے نیاز۔ اسلام نے ان کے عمدہ اخلاق اور اوصاف کو اور بھی زیادہ جلا بخشی۔

نواب جولین نے اُسے روک کر نرم لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ مجھے موسیٰ بن نصیر کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟ وہ آج کل کہاں تشریف فرما ہیں؟"

"وہ آج کل اپنے دارالحکومت میں قیام پذیر ہیں۔"

نواب جولین نے پھر سوال کیا۔

"کیا آپ کے امیر سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ اور کیا وہ مجھ جیسے انسان کو ملاقات کی عزت بخش سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں...... ہمارے امیر کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہیں۔ کوئی غریب سے غریب شخص بھی ان سے شرفِ ملاقات سے محروم نہیں رہ سکتا۔ اے اندلس سردار! کیا تم ہمارے امیر موسیٰ بن نصیر سے ملاقات کا ارادہ رکھتے ہو؟"

اُس نے انکار کیا۔

"جی نہیں۔ میں نے تو بس یونہی دریافت کیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

جب نواب جولین کو موسیٰ بن نصیر کے مستقر کا علم ہو گیا تو اُس نے رختِ سفر باندھا اور بھیس بدل کر چل پڑا۔ اس نے اپنی وضع قطع میں اس قدر تبدیلی کر لی کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔ اُس نے چند رفیق سفر ساتھ لئے اور تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ آخر وہ طویل سفر طے کر کے منزل کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دریائے نیل کے ڈیلٹا کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ پھر وہ موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں بڑی رازداری اور احتیاطی تدابیر اختیار کر کے حاضر ہوا تاکہ کسی دوسرے کو اس کی ملاقات کا علم نہ ہو سکے کہ وہ کون ہے اور موسیٰ بن نصیر سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔

نواب جولین نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا۔

"اے فخرِ عرب! آپ ہی نے بلادِ بربر اور شمالی افریقہ کو امن و امان کی برکت سے مالا مال کیا ہے۔ اگرچہ اس مقصد کی انجام دہی کے لئے آپ کو گراں بہا قربانیاں دینا پڑیں۔ آپ اس خطہ کے لئے امن و انصاف کے دیوتا ہیں اور آپ ہی وہاں کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔"

"نہیں۔ اے سیدِ عرب! میں شاہ لرزیق کی طرف سے والی ہوں جو افریقی ساحل کی دوسری طرف ایک طویل و عریض جزیرے کا مالک ہے۔"

موسیٰ نے پوچھا۔

"لرزیق کس قماش کا انسان ہے؟"

"کس قماش کا...... اے شیخ! وہ تو بہترین سرزمین کا بدترین حاکم ہے۔ اے شیخ، سرزمین اندلس میں تمام ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہے۔ ہر طرف نہریں جاری ہیں۔ جابجا چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ زمین سونا اُگلتی ہے، پھل دار درخت، پھل توڑنے والے کے انتظار میں اپنی شاخوں کو سرنگوں لئے کھڑے ہیں۔ زمین کے چپے چپے پر سبز مخمل کا فرش بچھا ہوا ہے۔ رات دن نسیم جانفزا کے معطر جھونکے قلب و رُوح کو فرحت بخشتے ہیں۔ وہاں کے موسم میں حد درجہ کا اعتدال ہے۔ نہ افریقہ جیسی گرمی کہ ہر شے کو جلا کر بھسم کر دے اور نہ بحرِ منجمد جیسی سردی کہ جسم ہی سن ہونے لگے۔ وہاں کی آب و ہوا مریض کے لئے صحت بخش اور علیل کے لئے شفا بار ہے۔ اے امیر! الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے کہ میں اُس سرزمین کا لفظی خاکہ کھینچ سکوں جس سے اس علاقے اور اندلس کے جزیرے میں تفاوت کا علم ہو سکے۔"

"آپ نے مکان کے اوصاف تو بیان کر دیئے مگر مکینوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"امیر...... کیا عرض کروں، مختصر یہ کہ اس جنت ارضی پر شیاطین کا قبضہ ہے۔ بادشاہ حاسد اور کینہ پرور ہے اور اُمراء ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہر ایک، دوسرے کی تباہی کا خواہاں ہے۔ ان سب میں اختلاف کی خلیج حائل ہے۔ وہاں موروثی بادشاہ کے انتقال پر لرزیق نے اس کی کمزور اور خورد سال اولاد کو تخت و تاج سے محروم کر کے خود قبضہ کر لیا ہے۔ وہاں رعیت کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام اندلس میں وہ کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ تمام اُمراء اور شرفاء دل سے اُس کے مخالف ہیں۔ بادشاہ کی اولاد کو اس سے شدید نفرت ہے۔ ان کی نگاہ میں وہ ظالم اور غاصب ہے۔ لرزیق کے تمام لشکری بد دل ہو چکے ہیں۔ نہ ان میں دفاع کی ہمت ہے اور نہ لڑنے کی طاقت۔ حرص و ہوا نے ان کے تمام معاملات کو زیر و زبر کر رکھا ہے۔ ان کی جمعیت پراگندگی اور انتشار کا شکار ہے۔"

"ایسے حالات میں اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تو سبتہ کے ساحل پر پُرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے اس کنارے کے فتنہ پرداز اور مفسد امراء سے کیا واسطہ؟ کاش میں اسلحہ سے مضبوط ہوتا تو بڑی آسانی سے ان پر قبضہ کر لیتا اور تلوار کی نوک سے ان سرکشوں کے تمام کس بل نکال دیتا......"

نواب جولین بولتے بولتے ایک دم رُک گیا۔ شاید وہ موسیٰ کے منہ سے کچھ سننا چاہتا تھا۔ مگر موسیٰ بدستور اپنی نظریں جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ نواب جولین نے پھر اپنی بات شروع کی۔ اُس نے کہا۔

"اے امیرِ عرب! آپ اس علاقے پر کیوں قبضہ نہیں کر لیتے جبکہ آپ کے پاس عظیم لشکر اور کافی اسلحہ موجود ہے اور بلادِ مغرب اور افریقہ کی بہ نسبت اس علاقے کو زیرِ نگیں کرنا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں؟"

موسیٰ بن نصیر اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ کہیں یہ امیر ہماری سرزمین میں شاہ اُندلس کے لئے جاسوسی تو نہیں کر رہا ہے؟ پس موسیٰ نے فرمایا۔

"پہلے آپ سبتہ کی مختصر جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوں۔ اس کے بعد ہم پروگرام طے کریں گے۔"

نواب جولین نے جواب دیا۔

"میں آپ کی رائے عالی کے مطابق اندلسی ساحل پر غارت گری کروں گا اور جو کچھ مجھ سے بن پڑا کر گزروں گا۔"

موسیٰ بن نصیر کے ساتھ وعدہ کر کے نواب جولین واپس چلا گیا۔ موسیٰ کے ذہن میں ابھی تک یہی خیال جاگزیں تھا کہ حملہ کی ابتداء نواب جولین کرے تاکہ ہم اس کی صداقت کو پرکھ سکیں۔

پس نواب جولین سبتہ پہنچتے ہی ساحل اندلس پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ کیونکہ اُسے اس سودے میں کوئی خسارہ نہ تھا۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اب لرزیق کے ناپاک ہاتھوں کی گرفت سے وہ آزاد ہے۔ نیز اس حملے میں اُسے عرب مجاہدین کی تائید حاصل ہو جائے گی اور موسیٰ اور کھل جائے گا کہ ملوک قوط سے میں منحرف ہو چکا ہوں۔

ادھر نواب جولین نے چند ہی دنوں میں ایک لشکر فراہم کیا اور دو جنگی جہازوں پر

وار ہو کر سمندر کا سینہ چیرتا اُندلس کی سرسبز اور شاداب سرزمین کے ساحل پر جا لنگر انداز ہوا۔ پہلے ہی حملے میں بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ایک بڑی تعداد کو قیدی بنایا۔ بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا اور لوٹ مار کر کے صحیح وسلامت معہ مال و دولت کے واپس لوٹا۔ اس کامیاب حملے میں نواب جولین کا ایک آدمی بھی ضائع نہ ہوا تھا۔

یہ خبر تمام مسلمانوں میں پھیل گئی۔ اس سے انہیں نواب جولین کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ نواب جولین، اندلس والوں کے خلاف ہے اور اب وہ ہماری طرف دستِ رفاقت دراز کر رہا ہے۔ لوگوں کو اس بات پر ضرور تعجب تھا کہ یہ نواب جولین کی اہلِ اندلس سے شدید نفرت کی کوئی وجہ ضرور ہے۔

موسیٰ بن نصیر نے نواب جولین کی زبانی، اندلس کے دلفریب حالات سنے تھے اور اُس کے دل میں اُندلس فتح کرنے کی اُمنگ پیدا ہو گئی تھی۔ جب سے موسیٰ بن نصیر افریقہ میں گورنر بن کے آیا تھا اس وقت سے اندلس فتح کرنے کا جذبہ شدت سے پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اگر اللہ نے اُسے کامرانی سے نوازا ہے تو اس کی راہ میں عدل و انصاف کے قیام کے لئے اگر سمندر میں بھی چھلانگ لگانا پڑے تو اس میں بھی اللہ کی نصرت شاملِ حال رہے گی۔ پھر بلادِ مغرب بھی تو ایک علاقہ ہی ہے۔

پس موسیٰ بن نصیر نے اپنے کاتب کو بلا کر خلیفہ کو ایک خط لکھوایا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

> "مجھے اندلس کے ایک سابق گورنر سے وہاں کا حال معلوم ہوا ہے۔ وہاں عدل و انصاف کے گلے پر چھری چلائی جاتی ہے۔ بنا بریں وہاں کے امرائے سلطنت اور ارا کین دولت میں منافرت پھیلی ہوئی ہے۔ موجودہ حالات کے تحت اسے فتح کرنا بہت آسان ہو گا۔"

اس خط کے آخر میں موسیٰ بن نصیر نے اس سرزمین یعنی اندلس پر فوج کشی کی اجازت مانگی۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر کا خط پڑھا مگر اُس نے موسیٰ کی رائے

اور مشورے سے اتفاق نہ کیا کہ اتنے دور دراز علاقہ میں مجاہدین کو مشکلات میں پھنسا دینا، دانشمندی کے خلاف ہے۔ انہوں نے موسیٰ کو لکھا کہ تمہیں وہاں حملہ کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اس مہم کا آغاز چھوٹے چھوٹے غزوات سے کرو۔ تاکہ وہاں کے حالات سے ہم پوری طرح واقف ہو جائیں۔ موسیٰ! تم احتیاط سے کام لو۔ تمام مجاہدین کو یکلخت جنگ میں دھکیل دینا کسی طرح مناسب نہیں۔

موسیٰ بن نصیر کو خلیفہ کا خط ملا۔ مگر وہ ان خطرات کو خاطر میں کب لاتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے خلیفہ کو فوراً دوسرا خط لکھوایا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:۔

”امیر المومنین! مجھ جیسا اسلام کا مخلص خادم بلا سوچے سمجھے مسلمانوں کو موت کے منہ میں کیسے دھکیل سکتا ہے یا ان کو بلا تحقیق ہلاکت میں کیسے ڈال سکتا ہے۔ اندلس اور افریقہ کے درمیان پُر سکون سمندر حائل ہے۔ بلکہ ایک تنگ سی خلیج ہے جس کے ایک کنارے سے دوسرا کنارہ بہ آسانی نظر آ سکتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیے، آپ کا یہ خادم ہر کام کو صلاح اور مشورے کے ساتھ انجام دے گا۔“

خلیفہ نے پھر بھی پہلی ہی رائے پر اصرار کیا کہ بڑے حملے سے پہلے چھوٹے چھوٹے سرایا بھیج کر حقیقت حال کا انکشاف کیا جائے۔ موسیٰ بن نصیر کے لئے اب سوائے خلیفہ کے حکم کو تسلیم کرنے کے اور کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے اُندلس پر بڑے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف چار سو مجاہدین کا ایک مختصر لشکر تیار کیا۔ قوم بربر کے ”طریف“ نامی ایک تجربہ کار شخص کو ان کا سردار مقرر کیا۔ چار جنگی جہاز تیار کئے گئے اور اللہ کا نام لے کر یہ پہلا اسلامی لشکر سطح سمندر کا سینہ چیرتا ہوا اندلس پہنچا اور آگے بڑھ کے ایک جزیرے پر قبضہ کر لیا جو آج تک ”طریف“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اندلس میں پہلے مسلم قائد کی یاد باقی رکھنے کے لئے تجویز کیا گیا۔ طریف نے اس جزیرے میں ٹھہر کے باقی جہازوں کی آمد کا انتظار کیا۔ جب تمام جہاز پہنچ گئے تو طریف نے اس جزیرے سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور لشکریوں کے ساتھ گرد و نواح پر حملے شروع کر دیے۔ اس طرح بہت سا مالِ غنیمت جمع ہو گیا اور کثیر تعداد میں قیدی ہاتھ لگے۔ ان قیدیوں کے چہرے پر صباحت اور ملاحت کا ایسا حسین

امتزاج تھا جو عربوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور عمدہ قسم کے مال و اسباب جو غنیمت میں حاصل ہوا ان کی بلادِ مغرب اور افریقہ میں کوئی نظیر نہ تھی۔

طارق بن زیاد کی آمد:

ساحل اندلس پر آزمائشی حملوں کے بعد موسیٰ بن نصیر کا ذہن ایک بار پھر بڑے حملے کی طرف گیا جسے وہ ایک مدت مدید سے اپنے دل میں لئے بیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طویل و عریض علاقے پر اسلامی پرچم بلند ہو کر لہرائے۔ اُدھر اُندلس پر ابتدائی حملوں میں مالِ غنیمت اور قیدیوں کی کثیر تعداد اور قوطی قوم کے ضعف اور انتشار کے متعلق سن کر اُس کا خیال اور بھی مضبوط ہو گیا کہ اس لشکرِ عظیم کو جو افریقی ساحل پر قائد کے حکم کا منتظر تھا، ساتھ لے کر ارضِ مقدس پر چڑھائی کرے اور اس مہم کو معرض التوا میں ڈالنا کسی طرح بھی سودمند نہیں ہو گا۔

موسیٰ بن نصیر کی دور بین نظریں کسی ایسے نوجوان کی متلاشی تھیں جو اس غازی لشکر کی قیادت کے فرائض انجام دے جو جنگ کی ہولناکیوں اور سختیوں میں صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور جب بڑے بڑے بہادروں کا پتا پانی ہو رہا ہو تو وہ ناقابلِ تسخیر چٹان کی طرح مقابلے میں ڈٹا رہے۔ جب جنگ کے دہشت ناک مناظر نگاہوں کے سامنے ہوں اور موت کا دیوتا منہ کھولے ہڑپ کرنے کے لئے تیار ہو اُس کی قوتِ ایمانی میں کسی طرح کا ضعف و تزلزل راہ نہ پائے۔ اگر اُسے ان اوصاف والا کوئی مجاہد نظر آ جائے تو وہ ایک اجنبی سرزمین کے لئے مسلمان مجاہدین کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں دے کر مطمئن ہو سکتا ہے۔

موسیٰ بن نصیر بربری، عربی، مغربی، مشرقی مسلمانوں کے درمیان کسی نوع کی عصبیت کا قائل نہ تھا۔ اس کی نظر میں تمام مسلمان برابر تھے۔ کیونکہ اسلام نے سب کو رنگ و مساوات میں رنگ کر یک رنگی کر دیا تھا اور ان میں بے نظیر وحدت و یگانگت پیدا کر دی تھی۔ چھوٹے اور بڑے، غنی اور فقیر، کالے اور گورے کے درمیان صرف اسلام کا رنگ جھلکتا تھا۔ کسی عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل نہ تھی۔ لڑائی کا دارو مدار صرف تقویٰ پر تھا۔

موسیٰ بن نصیر اپنے ایک غلام طارق بن زیاد کے اوصاف سے پوری طرح آشنا تھے۔ اُس کا تعلق بربری قبیلہ سے تھا۔ جرأت، شجاعت اور عزم و استقلال میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اُسے جب مغرب اقصیٰ کی ولایت دی گئی اور فوج کشی کے وقت قوم بربر کی ضمانتیں اس کی تحویل میں دی گئیں تو موسیٰ، طارق کے حسن انتظام اور دیانت داری سے بہت خوش ہوئے۔ طارق بن زیاد ایک عرصہ تک ولایت طنجہ پر موسیٰ بن نصیر کی طرف سے گورنر رہ چکا تھا۔ یہ علاقہ نواب جولین کی ولایت کے متصل تھا جو شہنشاہ لرزیق کی طرف سے سبتہ کا عامل (گورنر) تھا۔ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ طارق بن زیاد اور نواب جولین میں پڑوسیوں جیسے خوشگوار تعلقات تھے اور ممکن ہے کہ طارق کو ارض اندلس کے کوائف سن کر اس کے دل میں غزوے کا اشتیاق پیدا ہوا ہو۔

بہرحال، کچھ بھی صورت ہوئی ہو۔ پھر 92 ہجری میں مجاہد اعظم طارق بن زیاد سات ہزار سرفروشوں کا لشکر لے کر نکلا۔ اُس لشکر میں اکثریت بربر قوم کی تھی۔ ساحل اندلس تک پہنچنے کے لئے چار جہاز تیار کئے گئے۔ طارق بن زیاد اپنے لشکر سمیت اللہ کا نام لے کر روانہ ہوا اور بخیر و عافیت اس قدیم پہاڑی کے پاس لنگر انداز ہوا جو بعد میں "جبل الطارق" کے نام سے مشہور ہوئی اور آج تک اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔

ساحل پر اترتے ہی مسلمان لشکر کو معلوم ہوا کہ اندلس کا شہنشاہ لرزیق قوم قوط کا ایک بہت بڑا لشکر جمع کر رہا ہے جس کا مقابلہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس لئے طارق بن زیاد نے موسیٰ بن نصیر سے استدعا کی کہ اُسے دشمن سے مقابلہ کے لئے مزید پانچ ہزار لشکر کی کمک روانہ کی جائے۔ اس طرح پہلے معرکہ میں مجاہدین کی تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔

نواب جولین جو شہنشاہ لرزیق سے انتقام لینے کا موقع دیکھ رہا تھا، وہ فوراً اس جنگ میں حصہ لینے کے لئے پہنچ گیا۔ وہ اپنے اُمراء کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کو تیار تھا۔ انہوں نے مجاہدین کو جہازوں میں سوار کرانے میں ہر قسم کی مدد کی۔ مجاہدین اسلام نواب جولین کی رہنمائی میں سمندری آفات اور مصائب سے محفوظ رہے۔ وہ ہر مرحلہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہا۔ انہیں اہل اُندلس کی کمزوریوں سے آگاہ کرتا رہا۔ اس

طرح اس نے مسلمانوں کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دیئے۔

نواب سبتہ جولین کا اس طرح شہنشاہ اُندلس سے منحرف ہو کر مسلمانوں کے ساتھ مل جانا اہل اندلس کے لئے ایک آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ جب اللہ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے سرفراز فرمانا چاہا تو مخالفین کے افراد ہی سے اپنے لشکر کی مدد فرمائی اور اللہ کی یہی سنت جاریہ ہے کہ جب وہ کسی کام کی تکمیل کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب اور ذرائع بھی خود ہی مہیا کر دیتا ہے۔

سمندر پار کرتے ہوئے مجاہدین کو کسی خاص دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ موافق ہوا نے سفر میں مزید سہولت پیدا کر دی تاکہ کارِ ثواب میں وہ بھی شریک کار ہو سکے۔ اُدھر سمندر کا سینہ بھی مجاہدین کو اُٹھا کے پُرسکون ہو گیا۔ جب بسم اللہ کہہ کر مجاہدین نے لنگر اٹھا دیئے تو سفر بڑے اطمینان سے طے ہونے لگا۔ طارق بن زیاد اس سفر میں خوب جی بھر کے سوئے اور اُن کے دل میں ذرہ بھر تشویش نہ تھی۔

سفر کے دوران ایک رات جہاز میں طارق نے ایک خوش کن خواب دیکھا۔ اس نے بیدار ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کو بشارت دی۔

"رات مجھے رسول کریم ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آپ کے ساتھ تمام صحابہ، مہاجرین اور انصار بھی تھے۔ جنہوں نے گردنوں میں تلواریں حمائل کر رکھی تھیں اور ان کے کندھوں پر کمانیں رکھی ہوئی تھیں۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "طارق! اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا۔"

میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ، اُندلس میں داخل ہو گئے ہیں اور اُن کے نقش قدم پر چلتا ہوا میں بھی سرزمین اُندلس میں پہنچ گیا ہوں۔"

اُس وقت طارق بن زیاد کے چہرے پر مسرت پھیل رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"یہ خواب اُن رویائے صادقہ میں سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں سے وعدہ فرمایا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس مہم میں اللہ ہمیں اپنی حمایت اور نصرت سے سرفراز فرمائے گا اور اس کی تائید سے اس غزوے میں کامیابی اور کامرانی ہمارے قدم چومے گی۔"

صرف یہ خواب ہی ان کی فرحت اور سرور کا ذریعہ نہ تھا بلکہ اس خواب کی تائید اور

کئی ذرائع سے بھی ہوئی۔ جب طارق بن زیاد اپنے ساتھیوں کو لے کر اُس سرسبز اور شاداب جزیرے پر لنگر انداز ہوئے تو وہاں کے بہت سے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ ان قیدیوں میں ایک بڑی بی بھی تھیں جو کہتی تھیں کہ انہیں پیش آنے والے واقعات کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے۔ ان کے خاوند بھی اسی قسم کی باتیں کرتے تھے اور وہ اکثر سچ ثابت ہوتی تھیں۔

اُس بڑھیا نے کہا۔

"میرے شوہر نے لوگوں کو کئی بار آگاہ کیا تھا کہ ایک امیر اس علاقے میں داخل ہو کر یہاں قبضہ کرے گا۔ میرے شوہر نے اُس آنے والے امیر کے خدوخال تک بتائے تھے کہ اُس امیر کا سر موٹا ہوگا اور اُس کے دائیں شانے پر ایک بڑا سا خال ہوگا جس پر بال اُگے ہوں گے۔"

پھر بڑی بی نے طارق کو مخاطب کیا۔

"اے امیر! آپ کا سر تو موٹا ہے۔ پس پیشین گوئی کے مطابق بعض اجزاء تو صادق ہیں۔ اب رہا دائیں کندھے کا خال تو اگر آپ کے جسم پر یہ علامت بھی موجود ہے تو آپ بلا شک وشبہ وہی امیر ہیں۔"

طارق بن زیاد اور ان کے ساتھی اس پیشین گوئی سے بہت خوش اور مطمئن ہوئے۔

پھر جب شاہ اُندلس لرزیق کو طارق بن زیاد کے اُندلس پر اترنے کا علم ہوا تو اُس نے اپنے لشکر کو جمع کرنا اور ترتیب دینا شروع کیا۔ وہاں کے اُمراء میں آپس کے جو جھگڑے تھے انہیں سمجھا بجھا کر ختم کرایا گیا اور انہیں غیر ملکیوں کی یلغار سے آگاہ کیا گیا۔ اس طرح شاہ اُندلس لرزیق نے کوشش اور دوڑ دھوپ کر کے تقریباً ایک لاکھ لشکر تیار کر لیا۔ پھر وہ اس لشکر کو لے کر مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے چلا۔

اندلس کے امراء اور حکام کا یہ خیال تھا کہ دشمن کے حملے کا حال سن کر اُندلس کے لڑاکا امیر آپس میں میل ملاپ کر کے دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن یہ حقیقت بس حقیقت ہی رہی' کیونکہ شاہ لرزیق کے اُمراء اُسے (شاہ اندلس) غاصب خیال کرتے تھے۔ بلکہ حقیقت میں بھی وہ غاصب تھا کہ جس نے سابق شاہ کی معصوم اولاد کو الگ کر کے خود تخت و تاج پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ سب شاہ لرزیق کے خلاف

تھے۔

آخر اُندلس کے تمام اُمراء نے ایک مجلس مشورت جمع کی تا کہ آپس کے اختلافات دُور کر کے سب ایک جان دو قالب ہو جائیں اور پوری طاقت سے دشمن کا مقابلہ کریں۔ مگر اس اجتماع کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ کیونکہ امیر لرزیق کو غاصب سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں لرزیق نے ایک غلام ہوتے ہوئے اصل وارثوں کو تخت و تاج سے محروم کر رکھا ہے اس لئے اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔

عام طور سے امراء اُندلس، شاہ لرزیق کے خلاف تھے۔ لیکن بعض کا یہ خیال تھا کہ عرب ہماری حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور ہمارے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ مگر کچھ لوگ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ غیر ملکی حملہ آور اس علاقے کو مستقل ٹھکانہ نہیں بنائیں گے بلکہ لوٹ مار کرنے کے بعد اپنے وطن کو واپس ہو جائیں گے۔ ان حالات میں اگر ہم حملہ آور عربوں کا ساتھ دیں تو اس کا سب سے بڑا فائدہ ہم کو یہ ہو گا کہ وہ شاہ لرزیق کو آسانی سے مغلوب کر کے اُسے تخت و تاج سے محروم کر دیں گے۔ لرزیق کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد ہم خود اپنے آپ اس ملک کے بادشاہ ہوں گے اور اپنی مرضی کی حکومت بنائیں گے۔

لرزیق کو شکست دینے کے بعد عرب جب اپنے ملک کو واپس جائیں گے تو ہم کسی قابل اور اہل آدمی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔ یہ سارا پروگرام اُسی وقت ممکن ہے جب عرب، لرزیق کے ساتھ اپنا حساب بے باق کر لیں۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی عربوں کی معاونت کی صورت میں ظاہر ہوئی جس نے سرزمین اُندلس میں قوم "قوط" کی عزت اور رفعت کو خاک میں ملا دیا۔

اُندلس میں گرد و نواح کے امیر، لرزیق سے ناراض تھے۔ دوسرے مرحوم شاہ غیطشہ کے بیٹے جن کا موروثی تخت و تاج لرزیق نے چھین لیا تھا کسی مناسب موقع کے منتظر تھے۔ ان بیچاروں کے دل مدت سے غیظ و غضب کی آگ میں جل رہے تھے اور تقریباً یہی جذبات نواب جولین والی سبتہ کے تھے۔ کیونکہ بد باطن اور بدکار لرزیق نے اُس کی عزت و ناموس کو بھی پارہ پارہ کر دیا تھا۔

نواب جولین اب جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ حقیقت میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے حملے کا اصل محرک بھی وہی تھا۔ اُس نے اس مقصد کے حصول کے لئے افریقہ کا طویل سفر طے کر کے موسیٰ بن نصیر کو حملے کی ترغیب دی تھی۔ اور اب وہی نواب جولین، عرب لشکر کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ وہ اسلامی لشکر کی پہلی صفوں میں رہ کر طارق بن زیاد کے لئے جنگی معلومات فراہم کرتا تھا تا کہ مسلمان کسی اچانک حادثہ کا شکار نہ ہو جائیں۔

ان مناسب اور موافق حالات کے ساتھ ساتھ ہمیں مسلمانوں کی قوت ایمانی اور جرأت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے جنہیں غیروں کے علاقے میں صرف اللہ کی تائید اور نصرت کا سہارا تھا۔ اور ہم اُس مجاہد اعظم، طارق بن زیاد کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو چند مجاہدوں کے ساتھ ایک اجنبی سرزمین میں لاکھوں مسلح دشمنوں کے مقابلے میں آ گیا تھا۔

تاریخ کے صفحات اُلٹ ڈالئے تو آپ کو اس قسم کا واقعہ مشکل ہی سے ملے گا کہ ایک مٹھی بھر جماعت اپنے مرکز سے ہزاروں میل دُور لاکھوں کے لشکر جرار کو اُن کی اپنی زمین پر شکست فاش دے اور ایسا لشکر جس کی مدد اور کمک کے لئے ہر طرح کے ذرائع میسر ہوں، اس سے پہلے ایسے واقعات سے تاریخ کے صفحات نا آشنا ہیں۔ یہ فخر مسلمانوں ہی کو نصیب ہوا کہ انہوں نے اپنے نمایاں کارناموں سے تاریخ میں ایک نیا باب کھولا۔ اس باب کا حرف اوّل حضرت عمر فاروقؓ کے سنہری دور میں لکھا گیا جس وقت عربوں نے بلادِ کسریٰ میں ایسی ہی بے مثال شجاعت کا ثبوت دیا تھا۔

ادھر لرزیق نے یہ غلطی کی کہ اُس نے فوج کی باگ ڈور انتقام لینے والوں کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ اُس کی ایک سیاسی غلطی تھی۔ غیطشہ کے دونوں بیٹوں نے لرزیق سے بدلہ لینے کے لئے عربوں کا سہارا ڈھونڈا۔ انہوں نے اپنا ایک قاصد طارق بن زیاد کے پاس بھیجا اور طارق کے کانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ لرزیق اُن کے باپ کا غلام تھا اور اُس نے اُن کی کم سنی کی وجہ سے خیانت کی ہے اور ان کے تمام حقوق کو پامال کیا ہے۔ اور یہ کہ ان کے دل میں لرزیق کے خلاف سخت نفرت کا جذبہ موجود ہے۔ ان مظلوم شہزادوں نے طارق بن زیاد سے امان طلب کی اور عہد کیا کہ وہ معرکہ کارزار میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ عرب لشکر سے مل جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے طارق بن زیاد سے اُن کے حقوق دلانے کی استدعا کی۔

اُس وقت اُندلس کی سرسبز اور شاداب سرزمین میں چند زراعتی فارم تھے جن میں رنگا رنگ پھل اور پھول اپنی بہار دکھاتے تھے۔ رجب 92 ہجری کے باقی ایام مجاہدین نے جبل الطارق کے سائے میں گزارے۔ پھر شعبان کا پورا مہینہ بھی بخیریت گزر گیا اور رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا۔ سب جانتے ہیں کہ رمضان المبارک میں قرآن حکیم نازل ہوا تھا۔ اسی مہینہ میں رشد و ہدایت کے سرچشمے پھوٹے تھے۔ مجاہدین کے لئے یہ مرحلہ بہت صبر آزما تھا۔ اُدھر جنگ و جدل کی صعوبتیں اِدھر روزوں کی بھوک و پیاس۔ مگر مجاہدین نے محض فریضہ جہاد کے پیشِ نظر خود کو ہر قسم کی لذتوں سے دُور رکھا۔

دونوں لشکروں نے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر چھاؤنیاں قائم کر لیں۔ شاہ لرزیق نے کوشش کی کہ عرب لشکر کے حالات کا پتہ لگایا جائے اور ان کی استعدادِ حرب اور تعداد سے واقف ہوا جائے۔ اس کام کے لئے لرزیق نے ایک ایسے آدمی کو منتخب کیا جس پر اُسے کامل اعتماد اور بھروسہ تھا اور جس کی جرأت اور شجاعت کو وہ جانتا تھا۔ اُسے جاسوسی کے کاموں کا پورا پورا ملکہ تھا۔

چنانچہ لرزیق نے جاسوس سے کہا۔

"اے ہماری بادشاہت کے خیر خواہ! تمہارے سوا اور کوئی شخص ایسا نہیں جو اس بڑے وقت میں حملہ آوروں کے حالات کا پتہ لگا سکے۔ یہ مضبوط جماعت معلوم نہیں کہاں سے ہمارے ملک میں آ دھمکی ہے۔ جاؤ اور اُن کے پورے حالات ہمیں فراہم کرو۔ تم اُن کے تمام کوائف کا تجزیہ کر کے آؤ تا کہ انہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ تمہیں یہ دیکھنا ہے کہ اُن کے پاس ہم جیسے ہی ہتھیار ہیں یا ایسا ساز و سامان ہے جو ہمارے تصور میں بھی نہیں۔ اور کیا وہ اس قدر مضبوط اور بہادر ہیں کہ اُن کا مقابلہ کرنا مشکل ہے؟"

بادشاہ سے یہ احکام لے کر ہسپانوی جاسوس اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا اور لوگوں کی نظریں بچاتا ہوا اسلامی لشکر کے قریب پہنچ گیا۔ اتفاق سے ایک مسلمان سپاہی کی نظر اُس پر جا پڑی اور وہ اُسے پکڑنے کو دوڑا۔ جاسوس ایک تیز رفتار گھوڑے

پر سوار تھا۔ اُس نے جو دشمن سوار کو اپنی طرف آتے دیکھا تو گھوڑا گھما کر اور سر پر پَیر رکھ کر بھاگ پڑا۔ مسلمان سوار نے اُس کا پیچھا کیا مگر وہ ہاتھ نہ آ سکا۔

اُدھر ہسپانوی جاسوس ہانپتا کانپتا اپنے لشکر میں پہنچا۔ اُس کا تھکن اور گھبراہٹ سے برا حال تھا، پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کے حضور پہنچ گیا۔

شاہ لرزیق اُسے دیکھ کر خوش ہو گیا اور اُس سے پوچھا۔

"اے بہادر سردار! سناؤ کیا خبر لائے ہو؟"

سوار نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے آقا! معاملہ بہت دگرگوں ہے۔ ان حملہ آوروں کی صورتیں بالکل اُس طرح کی ہیں جیسی آپ تابوت میں دیکھ چکے ہیں۔ آپ کو اپنی، اپنے ملک اور اپنے لشکر کی فکر کرنی چاہیئے۔ ان لوگوں کا مطمع نظر صرف ایک ہے یعنی تخت یا تختہ......"

پھر جاسوس نے ذرا ٹھہر کر بتایا۔

"اے جہاں پناہ! عجیب بات یہ ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جن جہازوں پر انہوں نے سمندر عبور کیا تھا، ان جہازوں کو انہوں نے جلا کر خاکستر کر ڈالا ہے تاکہ ان کا کوئی سہارا نہ رہے اور سپاہیوں کے دلوں میں فرار کا خیال راہ نہ پا سکے اور وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس سرزمین میں بہا دیں۔"

یہ حالات سن کر لرزیق کا دل بیٹھ گیا۔ ہمت جواب دے گئی اور اُس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔

تابوت اور تصاویر:

جاسوس نے عربوں کی صورت کے بارے میں یہ کہا تھا کہ ان کی صورتیں، تابوت کی تصاویر کی مانند ہیں تو یہ محض ایک خرافات ہے۔ شاید ان تصاویر کی حکایت بھی من جملہ اُن خرافات سے تھی جو بڑے بڑے حادثات کے وقت وضع کر لی جاتی ہیں تاکہ جدت، ندرت اور حیرت کا سماں پیدا کیا جائے۔

آیئے، اب ہم ان تصاویر کی حکمت کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ اس کے تجزیے کی روشنی میں ہم موسیٰ بن نصیر اور خاص کر فتح اُندلس کی صحیح تصویر

ہیں۔

اس حقیقت یا حکمت کا قصہ اس طرح ہے کہ اُندلس کی سرزمین میں ایک بادشاہ تھا جو ولادیت "قادس" کا حکمران تھا۔ عہد قدیم سے اُندلس بادشاہوں کا مسکن ہے۔ ہر ایک علاقہ میں الگ الگ حکمران ہوتا تھا اور ہر حاکم کا یہ کام ہوتا تھا کہ وہ اپنے شہر اور علاقے کے گرد ایک مضبوط فصیل بنوائے تاکہ بیرونی حملہ آوروں کو شہر میں داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔ بسا اوقات حملہ آور سمندر عبور کر کے اُس علاقے کو لوٹ مار کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔

اہل جزیرہ نے عرب اور بربری اقوام کے لٹیروں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک "طلسم" بنانے کی تجویز پیش کی جو ساحل سمندر پر موجود ہو اور سمندر پار کر کے آنے والوں کو روکے۔ اہل اُندلس نے اس طلسم کے لئے ساحل سمندر پر ایک جگہ مخصوص کر دی۔

شاہ قادس کی ایک بیٹی تھی، نہایت خوبصورت اور حسن و جمال کا پیکر۔ اُس کے ناز و انداز سے دلربائی ٹپکتی تھی۔ گرد و نواح کے حکمرانوں نے جب اُس کے حسن و جمال کی شہرت سنی تو ان کے دل میں اس حسن کی پری کے ساتھ رشتہ ازدواج استوار کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ہر حکمران نے شہزادی سے شادی کے لئے اپنی درخواست پیش کر دی۔

شاہ قادس ان درخواستوں کو دیکھ کر اُلجھن میں پھنس گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اگر کسی ایک کو شہزادی کے لئے پسند کرتا ہے تو دوسرے تمام حکمران شکستہ دل ہو کر اُس سے ناراض ہو جائیں گے۔ مگر وہ کسی ایک ہمسایہ سے بھی بگاڑ نہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب وہ حیران اور پریشان تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

پس شاہ نے ایک دن بیٹی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"بیٹی! میں تمہارے سلسلے میں ایک عجیب اُلجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اگر کسی ایک کی درخواست قبول کرتا ہوں تو باقی سب کے سب بد دل ہو کر مجھ سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں گے۔ یہ صورت حال مجھے پسند نہیں بیٹی۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

شہزادی نے ایک لمحہ غور کیا، پھر پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

"بابا جان! آپ یہ کام میرے سپرد کر دیں۔ میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔"
شاہ نے اُس سے پوچھا۔

"بیٹی! ہم بھی تو سنیں کہ تم اس عقدے کو حل کرنے کی کیا تدبیر اختیار کرو گی؟"
شہزادی بیٹی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"بابا جان! آپ اعلان کر دیجئے کہ شہزادی صرف اُس شخص سے شادی کرے گی جو حکومت اور حکمت دونوں خوبیوں کا مالک ہوگا۔"

بادشاہ خوش ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

"بیٹی! یہ شرط واقعی بہت موزوں ہے۔"

پس بادشاہ نے تمام خواستگاروں کو یہ جواب لکھ بھیجا کہ میری بیٹی صرف "صاحب حکمت" بادشاہ سے رشتہ ازدواج جوڑنا پسند کرے گی۔

جب خواستگاروں کو یہ جواب ملا تو "حکمت" سے عاری امیدوار خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ صرف دو ایسے امیدوار باقی رہے جنہیں "الملک الحکیم" ہونے کا دعویٰ تھا۔

اب شاہ قادس کو یہ مشکل پیش آئی کہ اگر وہ ان میں سے ایک کی درخواست تسلیم کرے تو دوسرا امیدوار مخالف ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بھی شہزادی کی "عقل سلیم" کی رہبری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ شہزادی نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ اس نے دونوں امیدواروں کے لئے ایک ایک مہم کا تعین کر دیا کہ دونوں میں سے جو بھی مقررہ کام اپنے ساتھی (دوسرے امیدوار) سے پہلے پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا وہ شہزادی سے اپنی قسمت وابستہ کر سکے گا۔

پھر شہزادی نے مہم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم جس جزیرے میں رہتے ہیں اُس میں چکیوں کی ضرورت ہے۔ میں ایک امیدوار کے ذمہ یہ کام لگاؤں گی کہ وہ اس سرزمین میں شیریں اور جاری پانی سے چکیوں کے چلنے کا انتظام کرے۔

اسی طرح دوسرے سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ ایک طلسمی عجوبہ تیار کرے جس کی وجہ سے ہمارا جزیرہ ان غارتوں سے محفوظ رہ سکے جن کا ارتکاب افریقی ساحل پر رہنے والی اقوام کیا کرتی ہیں۔

شہزادی کا باپ یہ تفصیل اور شرطیں سن کے بہت خوش ہوا اور اُس نے اس تجویز کو

قبول کر لیا۔ پھر جب دونوں امیدواروں کو مطلع کیا گیا تو دونوں نے تمام شرائط تسلیم کر لیں اور اپنی اپنی مہم میں لگ گئے۔

چکیاں چلانے والے امیدوار نے مطالبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بڑی تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تاکہ اپنے رقیب سے پہلے ہی اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے اور اس حسن کی پری کے حصول میں سبقت لے جائے۔ مگر دوسرے امیدوار نے کسی خاص عجلت کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ اُسے اپنی مہم کو شروع کرنے سے پہلے "رصد" کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے اُس نے ساحل سمندر پر ایک مضبوط مربع چبوترہ تیار کرایا جس میں سفید پتھر استعمال کیا گیا اور چبوترے کی بنیادیں بہت گہرائی تک کھودی گئیں تاکہ ایک طویل عرصہ تک قائم رہ سکے۔

جب چبوترہ مقررہ بلندی تک پہنچ گیا تو سرخ تانبے اور صاف لوہے کو پگھلا کر مخلوط کیا گیا اور اُس مرکب سے ایک بربری آدمی کا مجسمہ بنایا گیا جس کے چہرے پر لمبی داڑھی تھی اور سر پر گھنگھریالے بال جو شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ اُس مورت کو ایک چادر اوڑھائی گئی تھی جس کے بازوؤں کو لپیٹ کر بائیں بازو پر ڈالا گیا تھا۔ اس مورتی کی تیاری میں بڑی لطافت اور نفاست سے کام لیا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جو آگے کی طرف دراز کیا ہوا تھا، قفل کی چابی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ راستہ بند ہے اور اسے پار کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس مورتی کی بلندی تقریباً چالیس گز تھی۔

چبوترہ بنانے کے بعد اُس امیدوار نے اپنے کام کو بڑی تیزی سے شروع کر دیا۔ دونوں میں سے ہر امیدوار اس امر کے لئے کوشاں تھا کہ اُس کا کام جلد از جلد ختم ہو۔ کیونکہ سبقت لے جانے والے ہی کو وہ حسن و جمال کی دیوی عطا کی جانے والی تھی۔

جس امیدوار کے پاس چکی بنانے کا کام تھا وہ بہت حیلہ ساز اور ہوشیار تھا۔ اُس نے اپنا کام جلد ہی ختم کر لیا مگر اُس نے اس بات کو ابھی راز ہی رکھا۔ اُس کی خواہش یہی تھی کہ شہزادی کے مطالبے کے مطابق چکی اور طلسم دونوں مکمل اور تیار ہو جائیں۔

پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ طلسم کا کام ختم ہونے والا ہے تو اُس نے چکی کو شیریں پانی سے چلانا شروع کر دیا اور لوگ اُسے دیکھنے کے لئے دُور دُور سے آنے لگے۔ پھر ایک دن وہ صاحب طلسم کے پاس پہنچا اور اُس نے دیکھا کہ وہ مورتی کے اوپر بیٹھ کر

اس کے چہرے کو صیقل کر رہا ہے۔ جب صاحب طلسم کی نظر اُس پر پڑی تو اُسے محسوس ہوا کہ حسن و عشق کی اس بازی میں وہ مات کھا گیا ہے۔ اس کے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔ وہ اس قدر نا اُمید اور مضمحل ہوا کہ اُس بلند و بالا مورتی کے اوپر سے گر کر حسن کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اس کے ختم ہو جانے کے بعد چکی بنانے والا امیدوار شہزادی، چکی اور طلسم تینوں چیزوں کا مالک ہو گیا۔ پھر اندلس کے تمام حکمرانوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس طلسم کو جو غارت گری سے محفوظ رہنے کے لئے بنایا گیا تھا، ایک سنگ مرمر کے صندوق میں بند کر کے شہر طلیطلہ میں رکھ دیا جائے۔ پس صندوق کو ایک مضبوط مکان میں رکھ کر اُسے مقفل کر دیا گیا اور اُس مکان کو کھولنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

اس کے بعد بادشاہوں کی تعداد کے مطابق اس مکان پر قفلوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ لرزیق کا زمانہ آیا جو اس سلسلے میں سب سے آخری بادشاہ تھا۔

اس مکان کی حفاظت کے لئے قوم ''قوط'' کے بزرگ، پرہیز گار اور ثقہ لوگ مامور کئے گئے تا کہ کوئی بادشاہ بھی دروازہ نہ کھولنے پائے۔ یہ دستور جاری و ساری رہا۔ جب نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا، محافظ اُس کی خدمت میں حاضر ہوتا اور قفل لے کر دروازے پر لگا دیتا۔ پچھلے تمام قفل اسی طرح موجود رہتے۔

ان قفلوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چھبیس تک پہنچ گئی۔ ہر باشاہ نے اپنے دور میں قفلوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ کیا مگر کسی نے دروازہ کھول کر عجائبات دیکھنے کا ارادہ تک نہ کیا کیونکہ اس طلسم کو وہ منحوس سمجھتے اور اس خیال سے نہ کھولتے کہ کہیں اسے کھول کر وہ کسی آفت کا شکار نہ ہو جائیں۔

پھر جب لرزیق کا زمانہ آیا اور وہ غاصبانہ طور پر تخت و تاج کا مالک بنا تو اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ اس مکان کو کھول کر دیکھا جائے۔ پس اس نے مملکت کے اُمراء، وزرا اور اہل امراء کو جمع کیا اور اُن سے کہا۔

''میں نے آپ لوگوں کو اس لئے جمع کیا ہے کہ اس بند مکان کو کھولنے کے سلسلے میں آپ لوگوں کی رائے معلوم کروں۔ میں دروازہ کھول کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تابوت میں کیا ہے تا کہ سب پر حقیقت حال آشکارا ہو جائے۔''

بادشاہ کے اس اظہار کے جواب میں ایک پختہ کار اور دُور اندیش شخص نے کہا۔

''اے بادشاہ سلامت! آپ کا ارشاد بجا، اور یہ بھی درست کہ یہ تابوت کس وجہ ے بنایا گیا۔ آیا کہ یہ سب محض ایک فریب ہے۔ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ تالے پر لے لگانے اور بند رکھنے میں یقیناً کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ آپ سے پہلے جب ہیں بادشاہوں نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو انہوں نے اسی معمول کو اپنایا۔ ہر آپ اس رسم کو کیوں تبدیل کرنا چاہتے ہیں؟ ہماری رائے تو یہی ہے کہ آپ بھی ں پر ایک قفل کا اور اضافہ کر دیں تا کہ اسلاف کی یہ رسم اور طریقہ برقرار رہے۔ جب تمام سابقہ حکمرانوں نے اُس عمل کو مہمل اور بیکار نہیں سمجھا تو آپ بھی وہی طور طریق اختیار کریں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اسے کھولنے سے کوئی نہ کوئی آفت آ جائے۔''

لرزیق نے جواب دیا۔

''اے میرے بزرگو اور ساتھیو! یہ میرے بس سے باہر ہے کہ میں اس راز کو کھولنے کی کوشش کروں جسے میرے اسلاف نے اب تک نہیں کھولا۔ اگر انہوں نے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تو میں کیوں اُن میں شامل ہو جاؤں اور اس راز کو راز ہی رہنے دوں؟ میں تو خود اسے کھول کر دیکھوں گا۔''

اندلس کے شرفاء اور امراء نے شاہ لرزیق کو اس بات سے منع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر شاہ اپنی رائے اور فیصلے پر اڑ گیا۔ جب سب کے دلائل بے سود ہو گئے تو ایک سن رسیدہ شخص نے اُٹھ کر کہا۔

''اے شاہ! اگر آپ کا خیال ہے کہ اس مکان کے اندر زر و مال مخفی ہے یا کوئی بیش قیمت خزانہ پوشیدہ ہے تو آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کے خیال میں اس مکان میں کتنا خزانہ پوشیدہ ہے؟ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس مکان میں آپ کے خیال کے مطابق جس قدر خزانہ پوشیدہ ہے، ہم اتنا خزانہ اپنے ذاتی مال و دولت سے آپ کے لئے حاضر کر دیں گے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ اس بند مکان کے کھلنے سے کوئی ایسی مصیبت نازل ہو جائے جس پر ہم اور آپ قابو نہ پا سکیں۔''

مگر ضدی لرزیق اپنی بات پر اڑ گیا اور اُس نے تالا کھولنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس حکم کے ساتھ ہی وزراء، اُمراء اور شرفاء سب ہی لوگ دربار میں جمع ہو گئے تا کہ اس

حادثے کو بچشمِ خود دیکھ سکیں جس کے وقوع پذیر ہونے کی توقع تھی اور ایک نامعلوم خوف نے انہیں کبھی اندرونی عمارت کی حقیقت معلوم کرنے پر آمادہ نہ کیا تھا۔

ہر قفل کے ساتھ اس کی چابی ساتھ ہی بندھی ہوئی تھی۔ تمام قفل کھولنے کے بعد جب دروازہ کھولا گیا تو ایک تابوت نظر آیا جس پر اُسی طرح قفل اور چابی لگی تھی۔ لرزیق نے آگے بڑھ کر اسے بھی کھول دیا۔

اس تابوت سے ورق کے قسم کی ایک بڑی سی چیز برآمد ہوئی جس پر قومِ عرب سے ملتی جلتی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ ان تصاویر میں ان تصویروں کے سروں پر عمامے تھے اور عربی النسل گھوڑوں پر وہ سوار تھے۔ لیکن گلوں میں تلواریں، کندھوں پر کمانیں اور نیزوں پر جھنڈے بلند کئے ہوئے تھے۔

یہ تصاویر دیکھ کر حاضرین پر وحشت طاری ہو گئی اور وہ انہیں الٹنے پلٹنے لگے کہ شاید کوئی ایسی علامت نظر آ جائے جو ان اسرارِ عجیبہ پر سے پردہ اٹھا سکے۔ انہیں اپنی ہی زبان میں ایک تحریر نظر آئی تو ایک شخص آگے بڑھ کر اسے پڑھنے لگا۔ اس تحریر میں یہ لکھا تھا:۔

"اگر اس دروازے کے قفل توڑ دیئے گئے، صندوق کھول ڈالا گیا اور تصاویر سامنے آ گئیں تو انہی کے مشابہ اور ملتے جلتے خدوخال والی ایک قوم اندلس میں وارد ہو گی۔ اس قوم کو اس سرزمین پر غلبہ حاصل ہو گا اور یہ ملک اہلِ اندلس کے ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔"

شاہ لرزیق کی یہ حالت ہو گئی کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ احساسِ ندامت میں غرق ہو گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی آفت اُس کی حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گی۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا، کاش میں نے یہ قفل نہ کھولے ہوتے جن کے اندر ایک عظیم فتنہ پنہاں ہے۔

بیت الحکمت اور تابوت جس وقت کھولے جا رہے تھے عرب اُس وقت اندلس کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

پھر شہنشاہ لرزیق کا قاصد عربی لشکر کی جاسوسی کرنے آیا اور جب جاسوسی کر کے واپس گیا تو اس نے وہاں جا کر صاف الفاظ میں انکشاف کیا۔

"اے بادشاہ، وہ حقیقی صورتیں یہاں تک آن پہنچی ہیں۔ وہ ہو بہو تابوت کی تصویروں کے مشابہ ہیں۔"

اسی سال رمضان کے آخری دنوں میں عربوں اور اندلس والوں کا مقابلہ ہوا۔ تعداد اور اسلحہ کے مقابلہ میں دونوں لشکروں کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ لرزیق شاہ اُندلس کا لشکر ایک لاکھ تک جنگی افراد پر مشتمل تھا۔ اندلسی لشکر کے ساتھ مال و متاع سے لدے ہوئے جنگی رتھ تھے۔ شہنشاہ لرزیق خود ایک جنگی رتھ پر سوار تھا۔ رتھ کے اندر شہنشاہ اندلس کے لئے سونے کا تخت بچھا ہوا تھا جسے عمدہ قسم کے دو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ رتھ کے اردگرد نگہبان اور محافظ قلعہ کی دیوار کی طرح شاہ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ لرزیق کے سر پر سچے موتیوں کا ایک چھتر تھا جس میں یاقوت اور زبرجد ہیرے جگمگا رہے تھے۔ یہ چھتر، صنعت کا ایک شاہکار معلوم ہوتا تھا۔

شاہ لرزیق نے ایک اشارہ مقرر کر رکھا تھا کہ وہ جب اُسے حرکت دے تو اُندلسی لشکر فوراً عربوں پر ٹوٹ پڑے اور آنِ واحد میں ان کا صفایا کر دے۔

دوسری جانب مسلم سالار طارق بن زیاد کی نظریں بھی اندلسی لشکر پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی حرکات اور سکنات کا اندازہ کر رہا تھا۔ پھر طارق اپنے مجاہدین کو لے کر بیچ میدان میں نکل آیا۔ تمام مسلم مجاہد پا پیادہ تھے جو ایمان کی دولت اپنے سینوں میں سنبھالے ایک نئی سرزمین میں داخل ہوئے تھے۔ طارق بن زیاد کو اہلِ اندلس کی تیاری کا علم ہو چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ مخالف لشکر کثیر تعداد میں ہے اور بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ مقابل ہوا ہے۔

اب طارق بن زیاد نے اپنے لشکر کی ہمت بڑھانے اور ان کے دلوں میں جذبہ شجاعت کو ابھارنے کے لئے تمام فوجیوں کو جمع کیا اور یہ خطبہ دیا۔

"مجاہدو! اب فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ عقب میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے اور سامنے دشمن کا عظیم لشکر۔ اگر کوئی چیز ہمارے لئے سودمند ہے تو وہ فقط صبر و تحمل اور ہمت و استقلال۔"

طارق بن زیاد نے تقریر جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

"جان لو کہ اس اجنبی سرزمین میں تمہاری اتنی بھی وقعت نہیں جتنی کہ کسی بخیل کے

دستر خوان پر ایک یتیم کی ہوتی ہے۔ دشمن اپنی تمام قوتوں کو سمیٹ کر تمہارے مقابلے میں آ چکا ہے۔ ان کا یہ اپنا ملک ہے۔ وہ سارے علاقے کے نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ مگر تم...... تم اس سرزمین میں اجنبی ہو۔ تمہارا سہارا صرف تمہاری تلواریں ہیں۔ تم کو کھانے کو وہی ملے گا جو تم دشمن سے بزور بازو حاصل کرو گے۔ میں جانتا ہوں کہ دشمن کے مقابلے میں ہم آٹے میں نمک کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ مگر اللہ تعالیٰ پر ہمارا ایمان ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے مخلص بندوں کی مدد فرمائی ہے۔ مٹھی بھر مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کی عظیم افواج کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ ہم وہی جذبہ لے کر اس سرزمین میں داخل ہوئے ہیں۔

اگر تم نے ہمت سے کام لیا تو تاریخ میں تمہارا یہ کارنامہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ تاریخ کے اوراق تمہاری یاد پر فخر کریں گے۔ اور اگر تم نے صبر و استقلال کا دامن چھوڑ دیا تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تمہیں حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے گا اور مسلمانوں کی آنے والی نسلیں تم سے نفرت کریں گی۔

دوستو......!

میں ہر معاملے میں تمہارا مخلص ساتھی اور شریک کار رہا ہوں۔ اگر میں نے تمہیں میدانِ کارزار میں ایک طاقتور دشمن کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ہے تو میں خود بھی تمہارے ساتھ ہوں اور میدان میں سب سے آگے رہوں گا۔ اگر تم نے مصائب جنگ کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا تو تمہیں دائمی سکون نصیب ہو گا۔ تم ہمیشہ سربلند رہو گے اور اللہ تمہیں اس جزیرے کا مالک بنا دے گا جو اپنی سرسبزی و شادابی سے جنت کو مات کرتا ہے۔ یہاں کے لوگ تمہاری خدمت کریں گے اور تمہیں مخدوم کی حیثیت حاصل ہو گی۔

امیر المومنین خلیفہ ولید بن عبدالملک کی نظر دُور بین نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی جان تک قربان کر دیں اور خلیفہ کی آرزو کو پورا کریں۔ حق کی اشاعت کے لئے تمہاری کوشش آخرت میں اجرِ عظیم کا باعث ہو گی اور یہاں کے خزانے بلا شرکت غیرے تمہارے ہوں گے۔ میری اللہ پاک سے دُعا ہے کہ وہ تمہیں اُن امور کی توفیق عطا فرمائے جن پر عمل کر کے تم حیاتِ جاوید حاصل کرو اور تمہاری

ت تک مسلمانوں کے دل میں باقی اور زندہ رہے۔

تم یہ سمجھ لو کہ جس کام کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں اُس کی طرف سب سے پہلا قدم میں خود اٹھاؤں گا۔ میں دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا لرزیق تک پہنچنے کی کوشش کروں گا تا کہ برائی کے راستے کو بند کیا جا سکے۔ اگر لرزیق کا خاتمہ کرنے کے بعد میں مارا جاؤں تو یہ سمجھنا کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ پھر تم کسی دوسرے اہل کو اپنا قائد بنا لینا۔ اگر میں لرزیق کو سزا دینے سے پہلے موت کے منہ میں چلا گیا پھر یہ فریضہ تمہارے ذمے ہو گا جس کا ادا کرنا تمہارا فرض ہو گا۔ مجھے تم سے پوری ع ہے کہ تم اپنے فرض کو ادا کرنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہ کرو گے۔ لرزیق کے نہ کے بعد کوئی طاقت تمہاری سد راہ نہ ہو گی اور ملک یورپ میں تم اسلام کے پرچم دراز علاقوں تک سربلند کر سکو گے۔"

اس طرح طارق بن زیاد کی باتیں مجاہدین اسلام کے دل میں اتر گئیں اور انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"ہمیں آپ کے ارشادات سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہم انشاء اللہ آپ کے حکم کی ل میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔ اے امیر! ہماری دلی تمنائیں اور اہشات بھی آپ کی رضا کے تابع ہیں۔ آپ مقدس فریضے کی ابتداء کا حکم دیجئے، ہم ر ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچائیں گے۔"

دونوں لشکر آمنے سامنے لڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ لرزیق نے جنگ شروع رنے کے نشان کو حرکت دی اور اُس کے لشکر نے حملہ کر دیا۔ اندلس والوں کو خیال تھا ہ وہ ایک ہی ہلے میں مٹھی بھر مسلمانوں کو پیس کر رکھ دیں گے۔ مگر مسلمان دشمن کے سامنے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ گئے۔ جنگ تقریباً ایک ہفتے تک جاری رہی اور مسلمانوں نے عید الفطر میدانِ جنگ میں اپنی جانوں کی قربانیاں ے کر گزاری۔ معرکہ کارزار گرم تھا، جنگ نقطہ عروج تک پہنچ چکی تھی کہ اندلسی لشکر کا منہ اور میسرہ شکست کھاتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کی قیادت غیطشہ کے دونوں بیٹوں کے ہاتھ میں تھی۔

جنگ کے ہولناک بادل ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ کٹ کٹ کر گر رہے

تھے۔ یہاں تک کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور میدانِ جنگ دُور دراز تک ہڈیو سے پٹ گیا اور گوشت پوست جنگلی جانوروں کی غذا بن گیا۔ اُس وقت مطلع صا ہوا۔ مسلمانوں کو اس جنگ میں اس قدر کثیر تعداد میں سامان اور اسلحہ حاصل ہوا ج کے بیان کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ بس یوں کہنا چاہئے کہ اُندلس کے ذخائر خزانوں کے دروازے دفعتہً عربوں کے لئے کھل گئے۔ ہر قسم کا مال و متاع اور ز جواہر کے تھیلے عربوں کے ہاتھ آئے جن پر اُمرائے قوط فخر کیا کرتے تھے۔

اب مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں مُردوں کی شناخت شروع کی۔ امرا اندلس اپنے ہاتھوں میں ایسی انگوٹھیاں پہنا کرتے تھے جن سے ان کے مرتبہ شناخت ہوتی تھی۔ اُمراء اور شرفاء سونے، متوسط طبقے کے لوگ چاندی اور نچلے در کے لوگ تانبے کی انگوٹھیاں پہنا کرتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لرزیق کا میدانِ جنگ میں کیا بنا؟ جب اُندلس لشکر کا میمنہ اور میسرہ شکست کھا کر میدان سے ہٹ گیا یا مارا گیا اور لرزیق نے دیکھ کہ میدان اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے تو اُس نے ایک آخری کوشش کے طور پر با ماندہ لشکر کو اکٹھا کر کے اُسے آگے بڑھایا لیکن اُس کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئ مسلمانوں نے ایک ہی حملے میں قوطیوں کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا۔ اس طر لرزیق کو پھر منہ کی کھانا پڑی۔

مسلمان بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے کیونکہ اُن کے سامنے ایک ہی راستہ تھا یا وظفر سے بغلگیر ہوں یا شہادت پر سرفراز ہوں۔ پس عربوں نے لاتعداد ہسپانو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر لرزیق کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کدھر گ چنانچہ اُس کی تلاش جاری رہی۔ آخر کار لرزیق کا گھوڑا مل گیا۔ گھوڑے پر سو چاندی، یاقوت و زبرجد کی مرصع زین کسی ہوئی تھی مگر سواری اپنے سوار سے خالی تھ گھوڑا دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ لرزیق کے گھوڑے کے قریب ہی ایک سنہری جوتا ملا جو اپنی صنعت گری اور شکل و صورت سے کسی شاہی فرد کا معلوم ہوتا تھا۔

آخر گھوڑے پر قیاس آرائیاں شروع ہوئیں۔ ہاں یہ گھوڑا تو لرزیق ہی کا ایسی زین اور ایسا قیمتی گھوڑا قوم قوط میں کسی اور کے پاس نہ تھا۔ اور جوتا بھی لرزیق

تھا اس لئے بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ شاہ اندلس شکست کی ذلت کی تاب نہ لاتے ہوئے دریا میں خود ہی ڈوب کے مر گیا۔

اسپین والوں نے اپنے بادشاہ اور لشکر کی شکست کا منظر دیکھ لیا تھا اس لئے انہوں نے بھی میدان سے منہ موڑ لیا اور پیٹھ گھما کر جس کا جس طرف منہ اُٹھا اُدھر بھاگ مسلمانوں کی اس فتحِ عظیم کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ہسپانیہ کی شکست کی خبریں دُور دُور تک پہنچیں۔ محصورین نے ہتھیار ڈال کر اطاعت تسلیم کر لی۔ بہت سا شکست خوردہ لشکر بد دل ہو کر جس کا جس طرف منہ اٹھا نکل پڑا۔

یہ اسلامی لشکر کی بہت بڑی فتح تھی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ بے شمار مال و زر لگا۔ طارق بن زیاد ایک شہر کو فتح کر کے اپنے لشکر کا منہ دوسری طرف پھیر دیتے۔ حتیٰ کہ انہوں نے پورے جزیرے کو روند ڈالا تاکہ کہیں بھی کوئی مخالف طاقت سر نہ اٹھا سکے۔ جب ہسپانیہ والوں نے دیکھا کہ عرب لشکر فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہا ہے اور ایسے اقدام اٹھا رہا ہے جیسے وہ ہسپانیہ سے جانے کی بجائے یہاں مستقل رہنے کے طریقے اختیار کر رہا ہے، تو اُن کے دل بیٹھ گئے اور اُن میں بے دلی پھیل گئی۔ پس اہل اُندلس نے اپنے لئے پناہ گاہیں تلاش کرنا شروع کر دیں اور وہ جزیرے کے جنوبی حصوں سے بھاگ کر شمالی حصوں میں جانے لگے اور شرفائے قوم دارالحکومت طلیطلہ میں جمع ہونے لگے۔

بعض متعصب مؤرخوں نے لکھا ہے، عربوں نے اپنا رعب جمانے کے لئے تمام قیدیوں کو میدان میں جمع کیا اور لشکریوں کو حکم دیا کہ مردوں کے اعضاء کاٹ کر ان کا گوشت الگ کریں اور بڑی بڑی دیگوں میں ڈال کر آگ پر چڑھا دیں تاکہ قیدیوں کو یہ احساس ہو کہ عرب انسانی گوشت کو بہت پسند کرتے ہیں۔

قیدیوں نے اس واقعہ کو دوسروں سے بیان کیا اور انہیں خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا گیا تاکہ عرب مُردہ خور قوم کے نام سے مشہور ہو جائے۔ لوگ اس پروپیگنڈے سے واقعی بہت خوفزدہ ہو گئے۔ مگر یہ بات قطعی غلط اور بکواس ہے۔ عرب مسلمان تھے اور مسلمان مُردہ خور کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ دراصل مقامی لوگوں نے عربوں

کو بدنام کرنے کے لئے غلط پروپیگنڈہ کیا تھا، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

طارق بن زیاد نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ قرطبہ میں، دوسرا مالقہ، تیسرا غرناطہ اور چوتھے حصے نے طلیطلہ کا رُخ کیا۔ طارق نے قرطبہ کی مہم پر مغیث الرومی کو متعین کیا جو خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ایک نہایت معتمد غلام تھے۔ اُس زمانہ میں قرطبہ کو ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مغیث نے تین ماہ تک قرطبہ کا محاصرہ جاری رکھا مگر انہیں قلعہ میں داخل ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ ایک دن مغیث نے اپنے غلام رباح کو جو سیاہ فام تھا مگر بڑا نڈر تھا بلا کر کہا۔

"جاؤ اور قلعہ کے پاس جا کر درختوں کے جھنڈ میں چھپ جاؤ۔ شاید تمہاری ملاقات کسی قوطی سے ہو جائے اور اس سے محصورین کی حالت یا قلعہ تک پہنچنے کا کوئی طریقہ معلوم ہو سکے۔"

رباح اپنے آقا کا حکم سن کر فوراً روانہ ہو گیا۔ وہ بہادر تو تھا مگر کم عقل بھی تھا۔ جب وہ درختوں کے جھنڈ میں پہنچا تو درختوں پر پھل دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ پھل توڑنے کے لئے فوراً ایک درخت پر چڑھ گیا۔ قلعہ کے محافظوں نے اُسے دیکھا تو دوڑ کر گرفتار کر لیا اور اپنے حاکم کے پاس لے گئے۔ وہ اُس کا کالا کلوٹا چہرہ دیکھ کر ڈر گئے۔ کیونکہ ہسپانیہ والوں نے اس سے پہلے کبھی ایسا سیاہ فام آدمی نہیں دیکھا تھا۔

پس ساری قوم سیاہ فام رباح کو دیکھنے کے لئے اُس کے گرد جمع ہو گئی۔ رباح کا رنگ و روپ دیکھ کر اُن کی حیرت اور بڑھ گئی۔ انہیں خیال گزرا کہ شاید اُس کے جسم پر سیاہ روغن لگایا گیا ہے۔

رباح نے اپنی کم عقلی سے اپنے آپ کو پھنسایا مگر اب وہاں سے رہائی پانا اُس کے بس میں نہ تھا۔ قوطی اُس کے رنگ کی تحقیق کرنے کے لئے اُس کے کپڑے اتار کر اُسے ایک نالی پر لے گئے۔ نالی میں پانی بہہ رہا تھا۔ پس انہوں نے اُس کے جسم پر پانی ڈال کر رگڑنا شروع کر دیا تاکہ پانی سے رنگ اُتر جائے۔ مگر وہ رنگ تو تھا نہیں۔ غریب رباح کا بدن چھل گیا۔ وہ درد سے تڑپ اُٹھا اور زور زور سے چلانے لگا۔ رباح نے اُنہیں اشاروں کنایوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ کالا رنگ مصنوعی

نہیں بلکہ قدرتی ہے۔ اُس وقت تک غریب رباح کو بہت تکلیف پہنچ چکی تھی۔ اس طرح رباح کو قید میں پورا ایک ہفتہ گزر گیا لیکن اہل قلعہ اُس سے مرعوب بھی تھے۔ مگر وہ اُس کی طرف سے ایک لحظہ کے لئے بھی غافل نہ ہوتے۔ کیونکہ اُن کے ہاتھ ایک عجیب و غریب مخلوق آ گئی تھی۔

آخر ایک رات اللہ نے اُس کی مصیبت ختم کرنے کی ایک صورت پیدا کر دی۔ وہ رات رباح کے رنگ کی طرح تاریک اور کالی تھی۔ محافظ بیٹھے اونگھ رہے تھے کہ رباح دبے پاؤں وہاں سے بھاگ نکلا اور سیدھا مغیث الرومی کے پاس پہنچا اور قلعہ اور اہل قلعہ کی تمام باتوں سے مغیث کو آگاہ کیا۔ رباح نے یہ بھی بتایا کہ قلعہ میں پینے اور استعمال کے لئے پانی باہر سے ایک نالی کے ذریعے آتا ہے۔

پس محاصرین نے تلاش بسیار کے بعد اُس نالی کو بند کیا جس کی وجہ سے اہل قلعہ کا پانی بند ہو گیا۔ پانی کا بند ہونا ایک مصیبت عظمیٰ سے کچھ کم نہ تھا۔ لوگ چند ہی دنوں بعد چیخ اُٹھے۔ ان کے امیر نے قلعہ سے بھاگ کر طلیطلہ کا رخ کیا۔ دوسری جانب امیر مغیث بھی غافل نہ تھا۔ اس نے امیر کا تعاقب جاری رکھا اور آخر ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پکڑا۔

مغیث نے اُسے پکڑ کر دمشق میں خلیفہ کے سامنے پیش کرنا چاہا، کیونکہ فتوحاتِ اُندلس کے دوران یہ پہلا امیر پکڑا گیا تھا۔ وہاں کے اکثر اُمراء روپوش ہو گئے تھے، کچھ دریا میں ڈوب مرے تھے، کچھ نے امان طلب کر کے جاں بخشی کرائی اور بعض جلیقیہ کی طرف بھاگ گئے۔



موسیٰ بن نصیر اُندلس میں:

رمضان 92 ہجری تک طارق بن زیاد اپنے تمام مخالفین اور دشمنوں کو زیر کر چکے تھے۔ عید الفطر کے بعد چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ہر میدان میں فتح و نصرت مجاہدین اسلام کا ساتھ دیتی تھی۔ اس طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ 92 ہجری تک اُندلس کی فتوحات کی اطلاعات موسیٰ بن نصیر کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ دوسرا مرحلہ موسیٰ بن نصیر نے خود طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ عضوِ معطل کی طرح نہیں رہنا چاہتے تھے۔ طارق بن زیاد نے راستہ صاف کر دیا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے عربوں اور بربروں کو لشکر میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ پھر انہوں نے اپنے ایک بیٹے عبداللہ کو افریقہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور وہ مجاہدین کا لشکر لے کر سمندر عبور کر گئے۔

اس مرتبہ بھی نواب جولین نے موسیٰ بن نصیر کا بھرپور ساتھ دیا۔ رہنمائی کے لئے تجربہ کار لوگ اُن کے ساتھ کئے تاکہ راستہ آسانی سے طے ہو جائے۔

موسیٰ بن نصیر جب اُندلس کی سرزمین پر اترے تو انہوں نے طارق بن زیاد کے پامال راستوں کو چھوڑ کر نیا راستہ اپنایا تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ موسیٰ میں اجتہادی بصیرت نہیں۔ چنانچہ انہوں نے جبل الطارق کے بجائے ایک اور پہاڑی کے پاس قیام کیا جو جبل موسیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہاں موسیٰ بن نصیر نے نواب جولین کے آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ ان راستوں کو اختیار نہ کریں جو وہ پہلے اختیار کر چکے تھے بلکہ نئی راہیں اختیار کریں۔ نواب جولین کے ساتھیوں نے جواب دیا۔

"امیر! ہم آپ کو بالکل نئی راہوں سے لے جائیں گے۔ اور ایسے بڑے بڑے

ذخیروں کے متعلق بتائیں گے جن کے بارے میں آپ نے پہلے کبھی نہ سنا ہوگا۔ وہاں آپ کو وافر مقدار میں مالِ غنیمت ہاتھ لگے گا۔ کیونکہ ان ذخیروں تک پہلے کسی اور کا ہاتھ نہیں پہنچ سکا ہے اور شاید قدرت نے یہ سب کچھ آپ ہی کے لئے جمع کر رکھا ہے۔"

پس موسیٰ بن نصیر کے لشکر نے آگے قدم بڑھائے اور وہ شہر شدونہ تک جا پہنچے اور اسے بزورِ شمشیر فتح کیا۔ شہر والوں نے فوراً اطاعت کے لئے سر جھکا دیا۔ وہاں سے موسیٰ بن نصیر نے شہر قرمونہ کا رُخ کیا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ قرمونہ سے زیادہ مضبوط قلعہ پورے اُندلس میں کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ موسیٰ نے اس کی فتح کے لئے ایک نئی ترکیب استعمال کی۔ انہوں نے نواب جولین کے لشکریوں میں سے ایک چھوٹی سی جماعت ترتیب دی اور انہیں پھٹے حالوں یعنی لٹا پٹا اور شکست خوردہ لشکر کا ایک قافلہ بنا دیا۔ اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ اپنی ظاہری حالت میں لٹے پٹے اور شکست خوردہ نظر آتے تھے۔

یہ لوگ پھٹے حالوں جب بند قلعہ کے صدر دروازے پر پہنچے تو اُن کی ظاہری صورت دیکھ کر شدونہ والوں نے یہی سوچا کہ یہ لوگ شکست خوردہ ہیں اور ہمارے پاس پناہ لینے آئے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے قلعہ والوں نے فوراً قلعہ کا صدر دروازہ کھول کر اُن سب کو اندر بلا لیا۔ موسیٰ بن نصیر تاک لگائے باہر چھپے ہوئے تھے۔ قلعہ کا دروازہ کھلتے ہی وہ معہ لشکر کے اُن پر ٹوٹ پڑے اور دشمن کے لشکریوں کو گھوڑوں کے پیروں تلے روند ڈالا۔ اب اہلِ شہر کے لئے سوائے اطاعت کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ قلعہ والے ہتھیار پھینک کر اُن کے مطیع ہو گئے۔ اس حکمتِ عملی سے موسیٰ بن نصیر نے قلعہ قرمونہ پر قبضہ کر لیا۔

موسیٰ بن نصیر اپنے لشکر کے ساتھ ایک قلعہ فتح کر کے دوسرے کی طرف بڑھ جاتے۔ وہ اب قرمونہ پر قبضہ کے بعد اور آگے بڑھے۔ موسیٰ بن نصیر کو طارق بن زیاد کے بارے میں کچھ نہ معلوم تھا کہ وہ کہاں تک پہنچے ہیں اور انہوں نے مزید کتنے قلعوں پر قبضہ کیا ہے۔ اس طرح موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے لشکر الگ الگ مختلف سمتوں میں رواں دواں تھے اور قلعہ پر قلعہ فتح کرتے چلے جا رہے تھے۔ موسیٰ

بن نصیر فتوحات حاصل کرتے کرتے آخر شہر اشبیلیہ پہنچے۔ یہ شہر طلیطلہ سے پہلے اُندلس کا دارالحکومت تھا۔ مجاہدین اسلام نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا اور کئی ماہ کے محاصرے کے بعد آخر قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور خود کو موسیٰ بن نصیر کے حوالے کر دیا۔

اشبیلیہ کی فتح اور قبضے کے بعد موسیٰ بن نصیر نے شہر ماردوہ کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ ایک بہت قدیم شہر تھا اور یہاں مختلف قدیمی آثار، محلات اور اشیاء موجود تھیں۔ موسیٰ بن نصیر نے شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ شہر کے لوگ معزز اور غیرت مند تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ فنون جنگ سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ ایسے شہر اور شہر والوں کو مغلوب کرنا آسان نہ تھا۔

آخر جنگ شروع ہو گئی تو شہر کے لوگ بڑی بے جگری سے لڑے۔ یہ پہلا موقع تھا جہاں عرب لشکر کو کافی جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ شہر ماروہ کی فصیل اور اس کے برج ناقابل تسخیر تھے۔ موسیٰ بن نصیر نے یہاں منجنیق کا بھی استعمال کیا مگر شہر پر قبضہ نہ ہو سکا اور مجاہدین کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی قوطیوں نے چکمہ دے کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور منجنیق کے پاس موجود بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے۔ یہ جگہ آئندہ زمانہ میں "برج شہداء" کے نام سے موسوم ہوئی۔

جب موسیٰ نے دیکھا کہ شہر کسی صورت قبضے میں نہیں آتا تو انہوں نے ایک نئی حکمت عملی استعمال کی۔ انہوں نے اہل شہر کو صلح کی دعوت دی۔ امراء اور اشراف کے لئے اماں نامہ تیار کیا تا کہ وہ لوگ اپنا لشکر لے کر باہر آئیں اور صلح کی گفتگو کریں۔

پس صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ پہلے دن گفتگو ہوتی رہی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور بات دوسرے روز پر جا پڑی۔ پھر جب موسیٰ بن نصیر کے پاس صلح کی بات کے لئے لوگ آئے تو وہ موسیٰ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ایک دن پہلے انہوں نے موسیٰ بن نصیر کو اس حال میں دیکھا تھا کہ اُن کے بال سفید تھے۔ مگر ایک رات کے وقفہ نے نہ معلوم کیا کیا کہ موسیٰ بن نصیر کے بال اس قدر سرخ ہو گئے کہ بالوں کا رنگ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس شہر کے لوگ "رنگ حنا" سے واقف نہ تھے۔ وہ بہت تعجب کرتے رہے۔

دوسرے دن بھی کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور بات تیسرے دن پر جا پڑی۔ اُس دن

موسیٰ بن نصیر کے بالوں کا رنگ بالکل سیاہ تھا کیونکہ انہوں نے رات کو بالوں میں خضاب لگا لیا تھا۔ دیکھنے والوں کے لئے یہ بات نہایت تعجب خیز تھی۔ وہ آپس میں باتیں کرتے اور کہتے تھے کہ ہمارا مقابلہ انسانوں سے نہیں بلکہ یہ مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو اپنی شکلیں اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکتی ہے۔ ان کا امیر پرسوں تو پیر فرتوت دکھائی دیتا تھا مگر آج وہ سیاہ بالوں والا ایک جوان نظر آ رہا ہے۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ ہم ان سے صلح کر لیں اور ان کے مطالبات تسلیم کر لیں۔ ورنہ ان سے مقابلہ کرنا ہمارے بس سے باہر ہو گا۔

موسیٰ بن نصیر کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ دشمن نے صلح تسلیم کر لی۔ شہر والوں نے بہت سی قیمتی چیزیں نذرانے کے طور پر پیش کیں۔ یہ صلح نامہ 94ہجری میں عین عید کے دن تکمیل کو پہنچا۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک دن میں دو خوشیاں میسر آئیں۔

موسیٰ بن نصیر ابھی ماردوہ ہی میں مقیم تھے کہ انہیں اطلاع دی گئی کہ اہل اشبیلیہ نے عہد نامہ توڑ دیا ہے اور وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ موسیٰ بن نصیر نے فوراً اپنے ایک بیٹے عبدالعزیز کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ اشبیلیہ روانہ کیا۔ عبدالعزیز نے وہاں پہنچ کر اشبیلیہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے وہاں امن و امان قائم کیا اور مسلمانوں کی حفاظت کے مکمل انتظامات کئے۔

اب اُندلس کا قریہ قریہ اور چپہ چپہ فاتحین کی اذانوں سے گونج اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں عربی زبان کی بھی ترویج ہوئی۔ اس طرح مسلمان وہاں روز ایک نہ ایک شہر پر حملہ کرتے اور اسے فتح کر لیتے تھے۔

پھر جب موسیٰ بن نصیر وہاں پہنچے اور انہوں نے وہاں کا پانی پیا تو اُن کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ میں آج تک اتنا عمدہ اور شیریں پانی کہیں نہیں پیا۔

انہوں نے اس دریا کا نام دریافت کیا۔

انہیں بتایا گیا کہ اس دریا کا نام گلیگو ہے۔

موسیٰ نے یہ سن کر فرمایا۔

"یہ تو دریائے جلق ہے۔"

جلق، دمشق کا پرانا نام تھا۔

موسیٰ نے کہا۔

"یہ شہر غوطۂ دمشق ہے۔ کیونکہ یہاں کے باغات بھی "غوطۂ شام" سے مشابہ ہیں۔"

مزید فتوحات اور مالِ غنیمت:

موسیٰ بن نصیر کو بتایا گیا کہ طارق بن زیاد اُندلسی علاقوں کو فتح کرتا ہوا شمال کی جانب بہت دُور تک نکل گیا ہے۔ اُس نے طلیطلہ فتح کرنے کے بعد اپنا رُخ شمال کی جانب کر لیا ہے اور وہ ممالک لیون اور قشتالہ کو فتح کرتا ہوا استرقہ تک جا پہنچا ہے اور اس وقت وہ اسپین کی حدود شمالیہ کے قریب مقیم ہے۔

امکان اس بات کا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے غیرت کے جذبات کے تحت طارق بن زیاد کو لکھا کہ وہ لرزیق کو مغلوب کرنے کے بعد اپنی مزید پیش قدمی روک دے گا۔

مگر طارق بن زیاد نے شاید اس حکم کی پرواہ نہ کی اور اپنی فتوحات جاری رکھیں یا پھر شاید موسیٰ بن نصیر کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ مرکز سے اتنی دُور ہٹ کر کہیں کسی مصیبت میں گھر نہ جائیں اور انہیں جان کے لالے نہ پڑ جائیں، اس لئے موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو حکم بھیجا۔

"وہ قرطبہ سے آگے نہ بڑھے۔"

مگر طارق بن زیاد شاید اُن کے حکم کی تعمیل نہ کر رہے تھے۔ موسیٰ جب اُس کے قدم آگے بڑھانے کی اطلاع پاتے تو اُسے سختی سے منع کرتے اور اُس سے خط لکھ کر پوچھتے۔

"تم میری اجازت کے بغیر آگے کیوں بڑھ رہے ہو؟"

پھر موسیٰ نے خود طارق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اُدھر طارق بن زیاد کو بھی موسیٰ بن نصیر کے "ورودِ اندلس" کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی۔ چنانچہ وہ خود بھی موسیٰ بن نصیر کی طرف روانہ ہوا تاکہ اُسے اظہارِ وفاداری کا موقع مل جائے۔

جب موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کا آمنا سامنا ہوا تو طارق بن زیاد اپنے آقا کے احترام میں گھوڑے سے اتر پڑا اور پیدل خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھا۔

موسیٰ نے طارق کے ساتھ غصے اور ناراضگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ

ملاقات کی۔ موسیٰ نے طارق کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور اُس سے پوچھا۔

"تم نے میرے احکام کے مطابق پیش قدمی کیوں نہیں روکی؟"

مگر وہ اس وقت ایک اجنبی زمین پر تھے اس لئے ناراض ہونے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ پس موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے بات آگے بڑھانے کے بجائے اپنے دل صاف کر لئے اور پھر دونوں مجاہدل کے فتوحات میں اضافہ کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے خود کو اُس کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کی فتوحات کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اپنے پورے وعدوں کی تکمیل کی۔

موسیٰ بن نصیر اس قدر خوش قسمت تھے کہ وہ جہاں جاتے فتح و نصرت اُن کا استقبال کرتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے موسیٰ جس طرف جاتے، اللہ کی نصرت اُن کے آگے آگے ہوتی تھی۔ اب حال یہ ہوا کہ قوطی اُمراء اور حاکموں نے مجاہدین کے آگے آگے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان تمام مہمات میں طارق بن زیاد اُن کے ساتھ رہے۔ حتیٰ کہ دونوں سردارانِ لشکر فتح و نصرت کے پھریرے اُڑاتے فرانس تک جا پہنچے۔ یہ مقام فرانس اور اسپین کا حد فاصل تھا۔ اس علاقے کو عرب مؤرخین نے "ارضِ کبر" کے نام سے موسوم کیا۔

فرانس والوں نے عربوں کا اس قدر عظیم لشکر دیکھا تو وہ گھبرا گئے۔ وہاں کے تمام امیر و وزیر ملک اعظم شارل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اُن میں سے ایک نے کہا۔

"اے عظیم بادشاہ! عربوں کی فتوحات اگر ہمارے ملک تک پہنچ گئیں تو ہماری آئندہ نسلیں بھی ذلت کا یہ جوا اپنی گردن سے نہ اُتار سکیں گی۔ ہمیں تو مشرق کی طرف سے عربوں کے حملے کا اندیشہ تھا مگر یہ لوگ تو مغرب کی جانب سے آ دھمکے ہیں اور آن واحد میں بلادِ اُندلس پر چھا گئے ہیں۔ حالانکہ اہل اُندلس کے مقابلے میں اُن کا لشکر عشر عشیر بھی نہیں تھا اور جنگی سامان کے لحاظ سے بھی عرب، اہل اُندلس کے پاسنگ برابر بھی نہیں تھے۔"

پس موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد اُندلس کے علاقے میں بڑھتے بڑھتے

"ترشلونہ" تک جا پہنچے۔ وسط میں اربونہ تک اور مغرب میں "قادس" تک۔ انہیں ہر جگہ بہترین اور بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا جس کا شمار بھی ممکن نہیں۔

اس مالِ غنیمت میں عربوں کو طلیطلہ سے ایک میز بھی ہاتھ لگی جس کا شمار عجائبات میں ہوتا تھا۔ ہر بادشاہ اپنے دور میں اس میز میں ایک نئی صفت اور جدت کا اضافہ کرتا تھا اور کوئی نہ کوئی ہیرا یا موتی اُس میز میں جڑ دیتا تھا۔ اس میز کی شہرت اطرافِ عالم میں تھی۔ شاہانِ قوط نے بھی اس کی تزئین میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی تاکہ دنیا میں اس سے زیادہ نفیس اور کوئی چیز نہ ہو۔

پس یہ عجوبہ عالم میز، طلیطلہ کے بڑے گرجے کی قربان گاہ پر رکھی جاتی۔ اس کی چمک دمک سے انسان کی آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ یہ میز خالص سونے اور چاندی سے بنائی گئی تھی۔ تین بیش بہا اور قیمتی ہار اُس کے ساتھ آویزاں تھے، ایک موتیوں کا، دوسرا یاقوت کا اور تیسرا زبرجد کا۔ درمیان میں دیگر اقسام کے بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جو قیمتی سامان مالِ غنیمت میں ہاتھ لگا وہ شمار سے باہر ہے۔

اتنا سامان اور مالِ غنیمت تو حضرت عمرؓ کی خلافت عظمیٰ میں بلادِ فارس سے بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک ایک چادر سونے اور ریشم کے تاروں سے بنی ہوئی تھی۔ کناروں پر موتی، یاقوت اور زبرجد کی لڑیاں سونے کے تاروں میں پروئی ہوئی تھیں۔ عربوں اور بربروں کو اس قسم کی کوئی چادر مل جاتی اور سونے، موتیوں اور ہیروں کے بوجھ کی وجہ سے اُسے اُٹھا نہ سکتے تھے تو ایک آدمی کلہاڑی سے کاٹ کر اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیتا۔

جنگ طلیطلہ کے موقع پر اس میز کے علاوہ اور بھی بہت سی نادر اشیاء بھی حاصل ہوئیں۔ یہ تقریباً 70 تاج تھے جو خالص سونے کے بنے ہوئے تھے اور ان میں بیش قیمت ہیرے لگے ہوئے تھے۔ بادشاہوں کی ایک ہزار تلواریں بھی ملیں جن کے دستوں پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ تلواروں کی نیام میں سونے چاندی کے تاروں میں پروئے ہوئے جوہر کی وجہ سے جھلملا رہی تھیں۔

فاتحین کو کنکریوں سے زیادہ لعل و جواہر ملے۔ سونے اور چاندی کے برتنوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ یہ تمام مال و اسباب صرف ایک شہر کا مالِ غنیمت تھا۔ اس سے

اندازہ لگا لیجئے کہ وہاں کے تمام شہروں سے اُن کو کس قدر مال ملا ہوگا جبکہ وہاں یا ایک سو محلات پر انہوں نے قبضہ کیا تھا۔

یہاں اگر میز کا ذکر کر دیا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ کیونکہ موسیٰ بن نصیر اور طارق زیاد کی حکایت کا کچھ نہ کچھ تعلق اس سے بھی ہے۔ طارق بن زیاد کی یہ دلی ہش تھی کہ یہ بیش قیمت میز وہ خود خلیفہ سلیمان کی خدمت میں پیش کرے تاکہ خلیفہ نظروں میں اُس کا رُتبہ اور زیادہ بلند و بالا ہو جائے۔

اس بات کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے یان ایک ملاقات میں تلخی پیدا ہوئی تھی۔ موسیٰ بن نصیر نے اس ملاقات میں بڑے رار کے ساتھ اس میز کا مطالبہ کیا تھا اور طارق بن زیاد نے حسب الحکم وہ میز لا کر ں کر دی تھی۔ مگر اُس نے میز کا چوتھا پایہ اتار کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

موسیٰ نے پوچھا تھا۔

"چوتھا پایہ کہاں ہے؟"

طارق نے کہا تھا۔

"یہ میز فتح کے روز اسی حالت میں ملی تھی۔"

اس پر موسیٰ بن نصیر نے ویسا ہی پایہ بنوانے کا حکم دیا تھا۔ لیکن بالکل اُس جیسا پایہ بن سکا تھا۔ کیونکہ پہلی ہی نظر میں پتہ چل جاتا تھا کہ چوتھا پایہ اصلی نہیں ہے۔ یہ ز موسیٰ کی تحویل میں رہی۔ حتیٰ کہ موسیٰ اور طارق دونوں دمشق پہنچ گئے۔

خلیفہ کے سامنے بحث و تمحیص کے دوران طارق بن زیاد نے ثابت کر دیا کہ میز سے مالِ غنیمت میں دستیاب ہوئی تھی، موسیٰ بن نصیر کو نہیں۔

طارق بن زیاد نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے چوتھا یعنی اصلی پایہ بھی ش کر دیا تھا۔

مجاہدِ اعظم کا انجام:

اندلس کی فتح کے بعد فرانس اور اسپین کے درمیان پہاڑ، موسیٰ بن نصیر کے ارادوں ں حائل نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس نے عزم کر لیا تھا کہ ان پہاڑوں کو عبور کر کے

سرزمین فرانس میں داخل ہو جائے اور مغرب سے مشرق تک پورے یورپ کو روند ڈالے۔ وہ یورپ سے گزرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچ جائے اور وہاں سے دارالخلافہ دمشق پہنچے۔ کس قدر بلند ہمت تھا موسیٰ بن نصیر جو اتنے بڑے بڑے ملک بڑے براعظم کو طے کرنا چاہتا تھا۔ ذرا سوچئے، اُندلس اور قسطنطنیہ کے درمیان کتنی اجنبی اقوام حائل اور آباد تھیں۔ کس قدر دُور دراز کا یہ سفر تھا۔ مگر پھر بھی اُس مجاہد اعظم کا یہ عزم تھا کہ وہ تمام یورپ میں اسلامی پرچم بلند کرے۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے نام کو پورے یورپ میں پھیلائے۔ اور پھر اس کوشش کے بعد خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان فتوحات عظیمہ کی خوشخبری سنائے۔ موسیٰ نے تو طارق بن زیاد کو پیش قدمی روکنے کا حکم دیا تھا مگر اب سوائے مملکت جلیقیہ کے اُندلس کا تمام علاقہ فتح ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ میں بھی پیش قدمی کرنے کا عزم بالجزم کر رکھا تھا۔

موسیٰ بن نصیر مملکت جلیقیہ کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوئے تا کہ اُس پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد فرانس میں داخل ہوں۔ اس دوران خلیفہ ولید بن عبدالملک کا قاصد مغیث رومی آ پہنچا۔ اُس نے بتایا۔

"خلیفہ کا حکم ہے کہ آپ اُندلس چھوڑ کر شام واپس آ جائیں۔"

موسیٰ بن نصیر نے حسن تدبیر سے کام لے کر قاصد کے ساتھ بہت نرم رویہ اختیار کیا اور اُسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مال غنیمت کی تقسیم تک یہیں ٹھہرے۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر کی تدبیر کارگر ہوئی اور قاصد رُک گیا۔ اس دوران فتوحات میں بھی کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ اُندلس میں اسلام کا حلقہ اقتدار بہت وسیع ہو گیا۔ موسیٰ بن نصیر نے قلعہ بارّو اور عکّ پر قبضہ کر کے دونوں کو فوجی مرکز بنا لیا اور وہاں سے مختلف مقامات کی طرف مہمات روانہ کی جانے لگیں۔

اُدھر مغیث یہ بھول گیا کہ وہ خلیفہ کی طرف سے کیا پیغام لے کر آیا تھا۔ اُسے تو موسیٰ بن نصیر کو ساتھ لے کر جلد از جلد واپس جانا تھا۔ کیونکہ وہ بڑی بیتابی سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

جب موسیٰ بن نصیر کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو ولید نے دوسرے قاصد ابونصر کو موسیٰ بن نصیر کی طرف روانہ کیا اور اُسے ہدایت کی کہ موسیٰ کو با اصرار واپس لائے۔ ساتھ

اُسے ایک خط بھی دے دیا جس میں خلیفہ نے واپسی کا حکم تہدید آمیز الفاظ میں کیا

جب قاصد اُندلس میں پہنچا تو موسیٰ تعمیل حکم کے لئے فوراً تیار ہو گئے۔ وہ طارق، یث اور ابونصر کو ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے۔ اپنے بڑے بیٹے عبدالعزیز کو لا امیر مقرر کیا اور مختلف علاقوں پر نائب اُمراء متعین کئے۔

عبدالعزیز نے اشبیلیہ کو دارالامارت قرار دیا جو اس جنت ارضی میں پہلا دارالامارات ا۔

موسیٰ بن نصیر دربارِ خلافت میں:

خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے موسیٰ بن نصیر 95 ہجری میں ملک شام ں داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ اُندلس سے حاصل کردہ اموال اور نفیس و نادر تحائف تھے۔ کچھ سامان کو بگھیوں میں لادا ہوا تھا اور کچھ غلام سروں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ امان کے علاوہ تیس ہزار قیدی بھی ساتھ تھے۔

سلیمان بن عبدالملک، خلیفہ عبدالملک کا بھائی اور ولی عہد تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر گراں بہا اموال کے ساتھ مصر سے گزر کر فلسطین کے راستے پر پہنچ چکے ہیں اور دمشق کے قریب ہیں تو سلیمان کے دل میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کا لچ پیدا ہوا۔ کیونکہ وہ بہت سی تفصیلات سے واقف ہو چکا تھا نیز اپنے بیمار بھائی خلیفہ ولید کی حالت کو دیکھ کر اُس کا مالِ غنیمت حاصل کرنے کی حرص اور زیادہ بڑھ گئی کہ یہ تمام اموال اُس کے قبضے میں آ جائیں۔

پس سلیمان بن عبدالملک نے جو اُس وقت ولید کے بعد ولی عہد سلطنت تھا، موسیٰ بن نصیر کو خط بھیجا کہ وہ اپنا سفر آہستہ آہستہ طے کرے اور کچھ دیر انتظار کر کے آگے بڑھے۔ ولی عہد کا خیال تھا کہ اس طرح موسیٰ بن نصیر کے دمشق میں داخلہ سے پہلے ی ولید کا خاتمہ ہو چکا ہو گا اور موسیٰ بن نصیر تمام تحائف لے کر میری خدمت میں حاضر ہو گا اور عوام میری ابتدائے خلافت میں مجھے نیک شگون کا خلیفہ تصور کرنے لگیں گے کہ اس قدر بے شمار سامان، مالِ غنیمت میری خدمت میں پیش کیا گیا ہے جس کی

مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں میری عظمت اور جلالت کا پہلے ہی دن سے سکّہ بیٹھ جائے گا۔

مگر موسیٰ بن نصیر نے سلیمان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور اُس نے اس غداری سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح موسیٰ بن نصیر اپنے واپسی کے سفر کو تیزی سے طے کرتے ہوئے خلیفہ ولید ہی کی حیات میں حاضر دربار ہو گئے اور انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ تمام تحائف اور مال و اسباب خلیفہ وقت کی خدمت میں پیش کر دیا۔

چنانچہ موسیٰ بن نصیر کے اس قدر مال غنیمت کو دیکھ کر ارکانِ دولت کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف موسیٰ بن نصیر کی وفاداری اور ایمانداری کے چرچے ہونے لگے۔ اُس وقت تک موسیٰ محض ایک حکومتی کارکن تھے مگر اُن کے اس کارنامے کی وجہ سے اُن کا شاہانہ انداز میں استقبال کیا گیا۔

اُدھر خلیفہ ولید بن عبدالملک کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اُس کی جگہ سلیمان بن عبدالملک نے تختِ خلافت پر قدم رکھا۔ اس دور میں خلافت کا درجہ ایک بادشاہ سے بھی بڑا ہوتا تھا۔ چونکہ موسیٰ بن نصیر نے دمشق آنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا اور اس طرح نیا خلیفہ سلیمان بن عبدالملک، موسیٰ بن نصیر کے لائے ہوئے بیش بہا خزانے سے محروم ہو گیا۔ اگرچہ اس میں موسیٰ بن نصیر نے کوئی بے ایمانی یا رکاوٹ نہیں پیدا کی تھی۔ مگر سلیمان نے تمام الزام اُسی پر لگایا کہ اس نے دمشق پہنچنے میں انتہائی عجلت سے کام لیا اور اسے اس بیش بہا خزانے سے محروم کر دیا۔ خلیفہ کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ مگر اس وقت خلیفہ کا رتبہ بادشاہ سے بھی بڑا ہوتا تھا اس لئے موسیٰ کی ایمانداری خلیفہ کی نظر میں ایک بڑی غلطی سمجھی گئی اور موسیٰ بن نصیر کو اس کا مجرم سمجھا گیا۔

پس خلیفہ سلیمان نے موسیٰ بن نصیر کی خدمات کا کوئی خیال نہ کیا اور اُس نے ناکردہ گناہ یا ایمانداری کے جرم میں موسیٰ بن نصیر کو نہایت سخت سزا کا مستوجب سمجھا۔ پہلے موسیٰ بن نصیر کو دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کیا گیا جس سے موسیٰ کا پورا بدن جل اُٹھا۔ خلیفہ نے انہیں صرف یہی سزا نہ دی بلکہ اُن پر تاوان بھی لگا دیا گیا۔ تاوان اس قدر زیادہ تھا جسے موسیٰ بن نصیر ادا کرنے سے قاصر تھے۔

ان حالات سے پریشان ہو کر موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ کے ایک یار غار یزید بن مہلب سے سفارش کی درخواست کی۔ خلیفہ نے اپنے دوست کی سفارش صرف اس حد تک مانی کہ انہیں ''قتل'' نہیں کیا گیا۔ مگر تاوان کی ادائیگی اُن پر جاری رہی۔ یزید بن مہلب نے خود اپنی جیب سے تاوان کی تقریباً نصف رقم ادا کر دی۔ مگر اس پر بھی خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو معاف نہیں کیا اور تاوان کی ادائیگی سے انہیں چھٹکارا نہ مل سکا۔ ایک اندازے کے مطابق یزید بن مہلب نے جو تاوان ادا کیا اس کی تعداد لاکھوں دینار کے قریب تھی۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر موسیٰ بن نصیر، ولید کے بلانے پر شام واپس نہ آتے اور خلیفہ سے بغاوت کر کے اُندلس میں ایک آزاد حکومت بنا لیتے تو خلیفہ اُن کا کچھ نہ کر سکتا تھا اور وہ اُندلس میں نہایت آرام و اطمینان سے حکومت کر سکتے تھے۔ مگر موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ سے غداری نہیں کی۔ مگر اُن کی قسمت ایسی خراب تھی کہ وہ بیچارے ایک ناکردہ گناہ میں پکڑے گئے اور اُن کی دنیا اور عاقبت خراب ہوئی۔

اب ذرا سنئے، موسیٰ بن نصیر اور یزید بن مہلب میں کیا گفتگو ہوئی۔ ایک شب یزید بن مہلب، موسیٰ بن نصیر کے پاس گفتگو کر رہا تھا کہ اُس نے پوچھا۔

''موسیٰ! ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے خاندان کے لوگ، یار دوست اور غلام کتنے ہوں گے؟''

''بہت ہیں۔'' موسیٰ بن نصیر نے بے دلی سے جواب دیا۔

''کیا ہزار کے قریب ہوں گے؟'' یزید بن مہلب نے پھر سوال کیا۔

''ایک ہزار نہیں، بلکہ کئی ہزار۔'' موسیٰ بن نصیر نے بتایا۔

یزید غصے میں بولے۔

''تعجب ہے کہ اس قدر شوکت و قدرت کے ہوتے ہوئے بھی تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا کر رکھا ہے اور سلیمان کے ہاتھوں میں اپنی تقدیر کی باگ ڈور دے رکھی ہے۔ اگر تم یہ تمام قیدی اور مال و دولت اپنے پاس رکھتے تو اندلس میں رہ کر عیش و عشرت سے زندگی گزار سکتے تھے۔ اگر یہ لوگ تم سے راضی ہو جاتے تو ٹھیک تھا ورنہ تمہارا کیا بگاڑ سکتے تھے۔''

موسیٰ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔

"بخدا اگر میں یہ ارادہ کر لیتا تو سلیمان کی کیا مجال تھی کہ وہ ارضِ مقدس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکتے۔ لیکن میں نے اپنے ذاتی مفاد اور اپنے عیش و عشرت پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ارشادات کو ترجیح دی۔ میں نے مسلمانوں کی وحدت میں انتشار پیدا کرنا گوارا نہ کیا۔ میں نے خلیفہ کی اطاعت سے انحراف جائز نہ سمجھا۔ میں نے اپنا سب کچھ ناموسِ اسلام کو بچانے کے لئے قربان کر دیا۔ اور آج میں اس دنیا میں سب سے ذلیل زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

موسیٰ بن نصیر جیسے بہادر مجاہد کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اُس کی آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ موسیٰ نے تو اپنی زندگی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے گزاری تھی۔ انہوں نے جہاد کی تکالیف کو ہمیشہ خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ لیکن مصائب کے جو پہاڑ سلیمان نے موسیٰ پر توڑے وہ اُن کی برداشت سے باہر تھے۔

جب سلیمان کی طرف سے تاوان کا شدید مطالبہ ہونے لگا تو موسیٰ بن نصیر کی بے بسی میں بھی اضافہ ہوگیا۔ محافظوں کی نگرانی میں اُنہیں عربی قبائل میں پھرایا جاتا کہ لوگوں کے سامنے وہ بھیک مانگیں اور اس بھیک کی رقم کو تاوان پورا کرنے میں لگاتے رہیں۔

موسیٰ بن نصیر نے اپنی زندگی میں بے شمار نشیب و فراز دیکھے تھے۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں اور شیرینیوں کا مزہ چکھا تھا۔ انہیں عیش و آرام کے ساتھ ساتھ مصائب سے بھی پالا پڑا تھا۔ مگر اُس بندۂ خدا کے عزم و استقلال میں ذرا سا بھی تزلزل نہ آ سکا۔ موسیٰ بن نصیر عزم و ہمت کا ایک پیکر تھا۔ جزا اور سزا سے کام لینا اُس کے نزدیک ایک مومن کا شیوہ نہ تھا۔

موسیٰ بن نصیر کے ساتھ صرف چند غلام رہ گئے تھے جو ہر صورت میں اپنے آقا کی رفاقت نبھا رہے تھے۔

اس عظیم فاتح اور مجاہد کا اختتام ایک عینی شاہد کی زبان سے سنئے اور آنسو بہایئے۔

ہم امیر موسیٰ کو لے کر قبائل عرب میں پھرا کرتے۔ بعض لوگ تو حیرت بھری اور

اندوہناک نظریں موسیٰ پر ڈالتے۔ بعض انہیں دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے۔ لیکن رحم دل ترس کھا کر ایک دو درہم دے دیتے تو موسیٰ کو بہت خوشی ہوتی اور وہ دن بھر کی بھیک کی آمدنی محافظوں کے حوالے کرتے تو اُن کی سزا میں کچھ کمی ہو جاتی۔

آہ...... آج سے چند روز پہلے ہمارے استغنا کا یہ عالم تھا کہ جب فتوحاتِ اُندلس میں قوم قوط کے محلات سے گرانقدر اموال حاصل کرتے تو سونا چاندی پھینک دیتے اور صرف بیش قیمت ہیرے اپنے پاس رکھتے۔ کیونکہ سونا اور چاندی اُس وقت ہماری نظروں میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔

مگر عزت اور ذلت اور فقر و غنا سب اُسی ذاتِ اقدس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

ملک شام واپس آنے کے بعد موسیٰ بن نصیر ان تکلیف دہ حالات میں دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ اس عرصہ میں سلیمان نے اُنہیں اور اُن کے جملہ خاندان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا۔ اُدھر اُندلس میں کسی نے موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کو جسے موسیٰ نے وہاں کا امیر مقرر کیا تھا، دھوکے سے قتل کر دیا۔

پھر 97 ھ میں حجاز کی سرزمین وادی القریٰ میں موسیٰ بن نصیر نے خود اپنی موت کی خبر دی۔ اس بے وفا اور غدار دنیا کے ساکنین کو خود اپنا انجام بتلا دیا۔

موت سے ایک دن قبل موسیٰ بن نصیر نے اپنے دوستوں سے حسرت بھرے الفاظ میں خطاب کیا۔

"کل اس دنیا سے ایک ایسا شخص کوچ کر جائے گا جس کی یاد ابد تک اہل مشرق و مغرب کے دلوں میں تازہ رہے گی اور آج بھی اس کا ذکر مشامِ زمانہ کو معطر کر رہا ہے۔"

اُف آج کی صبح کتنا منحوس پیغام لے کر طلوع ہوئی۔

کاش یہ صبح طلوع ہی نہ ہوتی۔

آہ، سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو جاتا۔

اسلام اپنے ایک مخلص دوست کو کھو بیٹھا ہے۔

جسے

سلیمان جیسے ظالموں نے اپنی ناپاک خواہشات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔

مسلمانوں کی رفعت اور عزت کے محل کا بلند ترین مینار گر گیا۔
افسوس، فاتح اکبر، مجاہد اعظم اور بطل جلیل اس ناپائیدار اور بے وفا دنیا سے..

نبا کرد نہ خوش رسمے نجات و خون علطیلان
خطا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

(ختم شد)